دھند
آمنہ اقبال احمد

کار اُسے لے کر ایئر پورٹ سے میلوں باہر نکل آئی تھی۔

راستے میں کئی بستیاں آئیں اور گزر گئیں۔ وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی محویت سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اِکا دُکا چیڑ کے درخت اب تعداد میں بڑھنے لگے تھے، گاڑی بھی اب چڑھائی چڑھنے لگی تھی۔ سیاہ بل کھاتی سڑک کے ایک طرف کھائی اور دوسری طرف پہاڑ پر سدا بہار پائنز کا جنگل۔ اور پھر تو گہری کھائیوں، گھنے جنگلوں کا سلسلہ ہی شروع ہو گیا۔

گاڑی چکردار سڑک پر اوپر ہی اوپر چلتی گئی۔ نیچے کھائی میں بادل ہی بادل چھا گئے تھے۔ سڑک پر کہرا اس قدر آ سمٹا تھا کہ راستہ نظر آنا مشکل ہو گیا تھا۔ اُس پر ـــــ ٹپ ٹپ بوندیں پڑنے لگیں۔

ماحول کے حسن سے مسحور ہوتی اُس نے کھڑکی کا شیشہ چڑھالیا۔ مدھری مسکراہٹ اُس کے خوبصورت ہونٹوں پر بکھر گئی۔

اُس کا منگیتر کتنی حسین جگہ میں ٹھہرا تھا۔

دو ہی دن بعد تو اُس کی شادی ہونے والی تھی اُس سے۔ یہ رشتہ اُس کی ممی کی دوست نے طے کرایا تھا۔ وہ لوگ برسوں سے، بلکہ اُس کی پیدائش سے بھی پہلے، اُس کے پاپا اور ممی افریقہ میں مقیم تھے۔ وہ وہیں پیدا اور پلی بڑھی تھی۔ پاپا تو اُس کی پیدائش کے چند سال بعد فوت ہو گئے تھے، بس ممی ہی تھیں اور وہ دونوں ایک دوسرے کے سہارے جی رہی تھیں۔ مکان تھا، بزنس تھی، کچھ بینک بیلنس بھی تھا، وقت اچھا گزر رہا تھا۔

وہ جوان ہوئی، گریجویشن کر لی، تو ممی کو اُس کے مستقبل کی فکر لاحق ہو گئی۔ گو اِس سے قبل ممی کو پاکستان کے بارے میں کبھی خیال نہیں آیا تھا۔ مگر وہ جوان ہوئی تو اُس کا رشتہ بہر حال اپنے ملک میں کرنے کا ہی سوچ لیا تھا۔ وہیں ممی کی ایک پاکستانی دوست تھیں۔ اُن کے رشتے کی بہن کویت میں رہتی تھیں، اُن ہی کا بیٹا تھا۔ اچھا تعلیم یافتہ اور برسرِ روزگار تھا۔ ممی کی دوست کے ذریعے ہی سب طے ہوا مگر ـــــ

ممی کو شاید اتنی ہی مہلت ملی تھی خدا سے۔ اُس کی مزید خوشیاں اُن کی قسمت میں نہ لکھی تھیں، مہینہ بھر قبل اُس کی انیسویں سالگرہ کے دن ہی ان کا اچانک برین ہیمرج ہوا اور وہ اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

اُس کا اب دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ ممی کی دوست نے اُسے سہارا دیا۔ اپنے گھر لے آئیں۔ کویت اپنے رشتے کی بہن کو تمام حالات بتا کر شادی کی تاریخ مقرر کروائی۔ وہ لوگ پروگرام کے مطابق شادی کی تقریب اپنے عزیزوں میں آ کر کرنے پہلے ہی پاکستان پہنچ چکے تھے۔ اور خود اُسے آنٹی نے کل وہاں سے روانہ کر دیا تھا۔

وہ بالکل اجنبی تھی یہاں۔ مگر ــــ اُسے کوئی تکلیف نہیں اٹھانا پڑی۔ ایئرپورٹ سے جوں ہی باہر نکلی اُس کے سسرال والوں کی گاڑی اُسے لینے وہاں موجود تھی۔

بھیگے سبزہ زاروں، سربفلک چیڑوں صنوبروں، بوجھل گھٹاؤں اور رم جھم پڑتی پھوار میں گاڑی گھوم کر آگے بڑھتے ہوئے قدرے اونچائی پر واقع پتھروں کی بنی ایک خوبصورت کوٹھی کے آگے رُک گئی۔

بوڑھا چوکیدار قریب آ گیا۔ ڈرائیور بھی باہر نکل آیا۔ گاڑی کی ڈگی سے اُس کا سوٹ کیس اور بیگ نکال کر اُس نے چوکیدار کے حوالے کئے۔

''آیئے''۔ اُس نے پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے اُسے مخاطب کیا۔

وہ باہر نکل آئی۔ اردگرد نگاہ کی۔ جنت نگاہ نظاروں میں یہ کوٹھی خاصی سنسان جگہ پر واقع تھی۔ دُور پار اِکا دُکا مکان نظر آ رہے تھے۔ ہر طرف سکوت چھایا ہوا تھا۔

بارش سے بچنے کے لئے وہ برآمدے کی طرف بڑھی۔

''چلئے''۔ ڈرائیور نے مزید کہا۔

جانے کیا بات تھی؟ اُسے سب ـــــ کچھ چپ چپ سا، خاموش خاموش سا رُکا رُکا سا لگ رہا تھا۔

وہ بھی خاموشی سے اُس کے پیچھے ہو لی۔

لکڑی کی چند سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اُسے اپنے قدموں کی آہٹ ماحول کے سناٹے کو چیرتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''اندر چلئے''۔ اوپر پہنچ کر ایک کمرے کے دروازے پر رُکتے ہوئے ڈرائیور نے پھر کہا۔ وہی چپ چپ سا، خاموش سا انداز!

وہ کمرے میں داخل ہو گئی۔

''یہ لیجئے''۔ باہر سے ہی اُس نے اُسے ایک بند لفافہ تھمایا۔

وہیں کھڑے کھڑے اُس نے کھولا۔

''بس! یہاں سے بھاگنے کی کوشش مت کیجئے گا۔ میرے آدمی آپ کو ایسا کرنے نہیں دیں گے۔ زار''۔

انگریزی میں لکھے دو جملے تھے مگر ـــــ چند ثانیے جیسے وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکی۔ اُلجھی اُلجھی سی ڈرائیور کو دیکھنے لگی۔

لیکن ___ اُس کی گھورتی نظروں میں جیسے کچھ تھا۔کوئی بات، کوئی راز، کوئی پردہ۔

اُس کی چھٹی حس نے کہا۔خطرہ ہے یہاں۔

اور ___ گھبرا کر وہ دروازے کی طرف لپکی۔

''آپ باہر نہیں جاسکتیں''۔ڈرائیور کا لہجہ بہت پُر اسرار تھا۔

اور قبل اس کے کہ وہ دروازے تک پہنچ پاتی اُس نے دروازہ بند کر دیا۔

اُس نے دروازہ پیٹا۔

مگر ___ وہ باہر سے تالا لگا چکا تھا۔

وہ پریشان سی پچھلے دروازے کی طرف بڑھی۔ وہ بھی باہر ہی سے بند تھا۔ کھڑکیاں دیکھیں، لوہے کی مضبوط سلاخیں لگی تھیں۔نڈھال ہو کر وہ ایک طرف رکھے صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔

وہ کہاں آ گئی تھی؟ یہ کون لوگ تھے؟

کہیں اُس کے منگیتر یا سسرال والوں نے اُس کے ساتھ دھوکہ تو نہیں کیا تھا؟ آج کل تو طرح طرح کے فراڈ ہو رہے تھے شادیوں کے سلسلے میں۔مگر ___ نہیں۔ وہ شریف لوگ تھے۔آنٹی کا خاندان اچھا تھا۔اُن لوگوں کے متعلق ایسا سوچنا اُسے اچھا نہیں لگا۔

پھر؟ کون ہو سکتے ہیں یہ لوگ؟

کون جانتا تھا اُسے اُس شہر میں؟

کیا مقصد تھا اِن لوگوں کا؟

سوالوں کی بھرمار سے وہ پاگل ہوئی جا رہی تھی۔

معاً اُسے نیچے گاڑی سٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔

اُٹھ کر اُس نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ وہی ڈرائیور واپس جا رہا تھا۔ بوڑھا چوکیدار بھی نیچے کھڑا جاتی گاڑی کی سمت دیکھ رہا تھا۔ایک اور بھی آدمی تھا، کندھے پہ کارتوسوں کی پیٹی اور ہاتھ میں بندوق تھی۔

خوفزدہ ہو کر وہ کھڑکی سے ہٹ آئی۔

اب کیا ہوگا؟ کہاں پھنس گئی تھی وہ؟ کیا کرے وہ؟

اور ___ کوئی حل نہ پاتے ہوئے وہ زور زور سے دروازہ پیٹنے لگی۔کبھی ایک کبھی دوسرا۔

پھر وہ چونکی۔کوئی سامنے کے دروازے کا تالا کھول رہا تھا۔پُرامید سی وہ اُس طرف دیکھنے لگی۔

''کیا ہے؟'' باہر ہی سے اسی بندوق والے آدمی نے کرخت آواز میں پوچھا۔

وہ سہم کر رہ گئی۔بول ہی نہ سکی۔

''کیا بات ہے؟'' اُس نے اُسی لہجے میں اپنا سوال دہرایا۔

''تم ___ آپ لوگ کون ہیں؟'' اُس نے بمشکل حواس مجتمع کیے۔

''کیا بیکار سوال ہے''۔آدمی جھنجلایا سا بولا۔

اور پھر سے ___ دھڑام سے دروازہ بند کرتے ہوئے دوبارہ تالا لگا دیا۔

سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر وہ بے سدھ سی سامنے کے بستر پر پڑ رہی۔

اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی، کچھ سوجھائی نہ دے رہا تھا۔ اس معمہ کا، ان بھول بھلیوں کا۔

اور ___ تکیے میں منہ دے کر وہ بے اختیار رو دی۔

شام ہونے کو تھی۔ پہاڑ پر شام بہت جلدی بھی تو ہو جاتی ہے!

اُس نے تھکا تھکا بوجھل سر اُٹھایا۔آنسو بھی جیسے بہہ بہہ کر خشک ہو چلے تھے۔ نڈھال سے قدم اُٹھاتی وہ ملحقہ غسل خانے میں آ گئی۔منہ ہاتھ دھوئے واپس کمرے میں آئی، ٹین کی چھتوں پر اب بھی بارش کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ وہ کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔

نیچے سڑک پر بارش کا پانی سیلاب کی مانند بہہ رہا تھا، سامنے کی کھائی میں پانی ندی کی صورت میں اُتر رہا تھا۔قریب کے چیڑ و صنوبر کے اونچے درخت چپ چاپ کھڑے تھے۔بجلی چمک رہی تھی، آسمان گرج رہا تھا، ہوا چل رہی تھی مگر ___ پائنیز کے درختوں میں جنبش تک نہ تھی، پائنیز کے درختوں میں بھی بادل تیر رہے تھے، آس پاس کی ہر چیز کو

لپیٹ میں لے رہے تھے۔ آسمان جھک آیا تھا جیسے زمین پر!

بادل اب اِس سمت آ رہے تھے، پائین کے درخت، سڑک، کوٹھی کی عمارت، غرض ہر شے نظروں سے اُوجھل ہو رہی تھی۔ اُس نے کھڑکی بند نہیں کی کہ بادل اب اِس کھڑکی سے بھی اندر آ رہے تھے۔

دفعتاً وہ چونکی۔ پچھلے دروازے کا تالا کھلنے کی آواز آئی تھی۔ ساتھ ہی دستک بھی ہوئی۔

اُسے کچھ حیرت بھی ہوئی۔ خود ہی تالا کھولنا، خود ہی دستک بھی دینا۔

اُس نے دیکھا۔ بوڑھا چوکیدار تھا، ہاتھوں میں چائے کی ٹرے لئے تھا۔

اُس کے جھریوں بھرے چہرے کا تاثر باقی دو اشخاص کے برعکس تھا۔ کرختگی کی جگہ نرمی تھی، بے حسی کی بجائے ہمدردی سی تھی۔

خاموشی سے اندر آ کر اُس نے صوفے کے سامنے رکھی میز پر ٹرے رکھ دی۔

اُسے کچھ حوصلہ سا ہوا۔ کچھ کہنے کو لب وا کئے مگر ــــ

وہ واپس مُڑ گیا۔ وہ اُس کی پیٹھ ہی تکتی رہ گئی۔

چوکیدار نے پھر سے باہر سے تالا لگا دیا۔

اور ــــ تھکی تھکی سی وہ صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔

اُس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا، عجیب سی بے چینی تھی۔ پورے جسم میں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے پیالی میں چائے نکال لی۔ گھونٹ گھونٹ کر کے پینے لگی۔

ذہن اب بھی وہی سوال کئے جا رہا تھا۔ اُسے یہاں کون لایا تھا؟ کیوں لایا تھا؟ اور مزید کہ ــــ

اُسے یہاں کب تک رکھا جائے گا؟ کوئی کچھ بتا بھی تو نہیں رہا تھا!

چوکیدار سے کچھ آس بندھی تھی مگر وہ بھی اتنی جلدی مڑ کر واپس ہوا کہ بات ہونٹوں تک آتے آتے رہ گئی۔ کیا کرے وہ؟

اپنی بے بسی پر دو آنسو لڑھک کر اُس کے خوبصورت گالوں پر آ رہے۔

Czar، زار ــــ اچانک اُسے خیال آیا۔

کون تھا یہ؟ کیا چاہتا تھا اُس سے؟

سوچ سوچ کر اُس کا ذہن جواب دینے لگا۔

خالی کپ ٹرے میں رکھ کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کمرے سے ملحقہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے دروازے دیکھے وہ بھی باہر سے بند تھے۔ کھڑکیاں، اُن میں بھی لوہے کی طاقتور سلاخیں لگی تھیں۔ کمرے سے نکل کر وہ کوریڈور میں آ گئی، پھر باقی کمروں میں ہر طرف گھومی پھری۔ کوٹھی اندر سے کھلی مگر باہر سے ہر طرف سے مقفل تھی۔ وہ پوری طرح قید تھی۔

اس نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ کچن قدرے فاصلے پر اور الگ تھلگ تھا۔ چوکیدار وہیں اندر باہر ہو رہا تھا، شاید کھانا وغیرہ وہ ہی بناتا تھا۔

تھکے تھکے قدموں سے وہ واپس اُسی کمرے میں آ گئی۔

باہر شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ جل تھل برستی بارش تھم گئی تھی مگر۔ سردی خاصی بڑھ گئی تھی۔

اُس کے پاس گرم کپڑے نہیں تھے۔ اُس نے تو جس جگہ پہنچنا تھا اس کے اندازے کے مطابق ابھی وہاں سردی شروع نہیں ہوئی تھی۔ پہاڑ پر آتے آتے اُسے خیال آیا بھی تھا کہ سسرال والوں نے تو کسی میدانی علاقے میں شادی کی تقریب کے لئے کوٹھی کرائے پر لی تھی۔ مگر زیادہ دھیان اس لئے نہیں دیا کہ ہزاروں میل دور واقع ایک ملک سے دوسرے ملک کے علاقوں اور موسموں کی تفصیل میں شاید اُسے ہی غلطی ہو گئی تھی۔ کاش وہ اُدھر ہی شور مچا دیتی! شاید وہیں کوئی مدد کے لئے آ جاتا!

مگر وہ تو بھروسے میں ماری گئی۔ اُس کے تو وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اُس کے ساتھ ایسا واقعہ بھی ہو سکتا تھا۔

کیا تھا یہ سب؟ کیا مقصد تھا اِن لوگوں کا؟

پھر سے وہی سوالات اُسے گھیرنے لگے۔

کوئی تو اُسے بتائے، کوئی تو بات کرے؟ کچھ تو پتہ چلے، کچھ تو معلوم ہو؟

بستر میں گھس کر وہ بے اختیار رو دی۔ پھوٹ پھوٹ کر، بلک بلک کر روتے روتے

وہ بے سدھ ہو گئی۔ غنودگی سی طاری ہونے لگی۔

تبھی ایک بار پھر تالا کھلنے کی آواز پر وہ چونکی۔ وہی دستک پھر ہوئی۔ ایک بار پھر وہی چوکیدار ٹرے ہاتھوں میں لئے نظریں جھکائے چلا آ رہا تھا۔

وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''کھانا کھا لو بیٹی''۔ اُس کی آواز میں ہمدردی تھی۔

''بابا۔ یہ لوگ کون ہیں؟'' حوصلہ پاتے ہی اُس نے سوال کیا۔

ایک لمحہ کو بوڑھے چوکیدار کی نظریں اوپر اُٹھیں۔ اُس کی نظروں میں اس کے لئے افسوس تھا، ہمدردی تھی، دکھ تھا۔

مگر ـــ دوسرے ہی لمحے وہ ـــ چائے کے خالی برتن اُٹھا کر دروازے کی طرف بڑھا۔ کوئی بھی جواب دیئے بنا۔ کچھ بھی بولے بغیر!

کیسا اسرار تھا؟ کیسا راز تھا؟

اُس نے کھانا نہیں کھایا۔ دل ہی نہیں کر رہا تھا۔ اٹھ کر وہ غسل خانے گئی۔ وضو کیا، واپس آ کر ایک طرف قالین پر کھڑی ہوئی اور خالقِ حقیقی کے آگے اپنی راہِ نجات کے لئے سربسجود ہو گئی۔ کانپتے ہاتھ دُعا کے لئے اُٹھے تو آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی، روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔

جانے کب؟ وہ بستر پر آئی۔ سخت سردی سے بچنے کے لئے رضائی اپنے گرد لپیٹتے لپیٹتے اُسے پہلی بار خیال آیا۔ اُس نے اب تک اندر سے ایک بار بھی کنڈی نہیں لگائی تھی۔ اس کا دل بے اختیار دھڑکا۔ اُسے حیرت ہوئی، مارے سراسیمگی کے اب تک اُسے ایک بار بھی خیال نہیں آیا تھا کہ یہی لوگ اُسے قید رکھنے کے علاوہ اور بھی نقصان دے سکتے تھے، اُس کی عزت کی سلامتی کو بھی خطرہ ہو سکتا تھا۔

پھیلی پھیلی آنکھیں لئے وہ اُٹھی اور جلدی جلدی پوری کوٹھی میں گھوم پھر کر ساری کنڈیاں اندر سے چڑھا لیں۔ اب اُسے نیا خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔

باقی کی تمام رات اُس نے آنکھوں میں کاٹی۔ ذرا سا بھی کھٹکا ہوتا تو وہ اُٹھ کر بیٹھ جاتی، دل اس قدر زور سے دھڑکنے لگتا کہ خود اُسے اپنی دھڑکنیں سنائی دینے لگتیں۔

دو دن اور گزر گئے۔ وہ اب بھی قید تنہائی کاٹ رہی تھی۔ اب بھی طرح طرح کے وسوسے لاحق تھے اُسے، مگر ـــ جس بات کی اُسے اپنی جان سے زیادہ فکر تھی، اپنی عزت کی ـــ تو ـــ اُس کے کمرے کے اندر سوائے بوڑھے چوکیدار کے آج تک کسی اور آدمی نے قدم نہیں رکھا تھا۔ اور وہ نہایت نیک اور خدا ترس انسان لگتا تھا۔

آج پہرہ پچھلے دنوں کی نسبت زیادہ سخت تھا۔ دو مسلح آدمی مزید آ گئے تھے اُس کی چوکیداری کرنے۔

آج اُس کی شادی کا بھی تو دن تھا۔ کیا کیا سپنے نہ دیکھے تھے اُس نے اِس دن کے۔ محبت کرنے والا شوہر، اپنا گھر۔ ایک سہارا، ایک آسرا!

خاص طور سے جب سے ممی فوت ہوئی تھیں، خدا کے بعد اُسے اپنے منگیتر کا ہی تو

سہارا تھا، آسرا تھا مگر ـــــ

کیسا شادی کا دن تھا۔ جو بغیر کسی انجام کو پہنچے ہی گزر گیا!

کیا ہوا ہوگا؟ کیا سوچا ہوگا اُس کے سسرال والوں نے؟ اُس کے منگیتر نے؟ کیا کیا کہا ہوگا لوگوں نے؟ کیا بیتی ہوگی سب پر؟

سوچ سوچ کر وہ پاگل ہوئی جا رہی تھی۔

اور کسی سے تو اُس نے کوشش بھی نہیں کی تھی بات کرنے کی مگر چوکیدار جو مجسم مہربانی تھا وہ بھی سوائے 'بیٹی کھانا کھالو'، 'بیٹی ناشتہ کرلو' کے مزید کچھ کہنے سننے سے گریزاں تھا۔

رات بھی گزر گئی۔ پھر دن ہوا۔ ایسا دن جس کا طلوع اُس کے لئے کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔

کہ نہ وہ کوئی پیغام ساتھ لاتا تھا، نہ کوئی خوشی، نہ کوئی خبر!

منہ دھونے لگی تو اُس کی نظر اپنے ملگجے میلے کپڑوں پر گئی۔ عام حالات میں وہ اب تک دو تین بار نہا چکی ہوتی، کپڑے بدلے ہوتے مگر ـــــ وہ تو ایسی مشکل میں آ پھنسی تھی کہ جس کی نہ ابتدا پتہ چل رہی تھی نہ انتہا۔

چوکیدار شاید کمرے میں ناشتہ لگا رہا تھا ۔ وہ تولیے سے چہرہ خشک کرتے ہوئے کمرے میں آ گئی۔

''سلام بابا''۔ پتہ نہیں کیوں اُسے یہ چوکیدار اپنا ہمدرد، خیر خواہ لگتا تھا۔

''سلام بیٹی''۔ وہ خلوص سے بولے۔

وہ میز کے پاس آ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

''بابا۔ آپ کی کوئی بیٹی ہے؟'' جانے کیسے اُس نے اچانک سوال کر دیا۔

بابا اُس کا سوال سمجھ گئے۔ بوڑھی آنکھوں میں تڑپ سی بھر گئی۔ کمزور ہاتھوں میں لرزش سی پیدا ہو گئی۔

''ہاں بیٹی''۔

''میری حالت دیکھ کر آپ کو خیال نہیں آتا کہ اگر ایسا آپ کی بیٹی کے ساتھ

ہوتا تو...؟'' وہ جیسے جلے دل کے پھپھولے کھولنے لگی۔

''ہر وقت آتا ہے...'' بابا کی آنکھوں میں نمی تھی۔

''کریم چاچا او کریم چاچا...'' لکڑی کی سیڑھیوں پر قدموں کی آہٹ کے ساتھ ہی پہرہ داروں میں سے ایک کی آواز آئی۔

اور کریم بابا جلدی سے وہاں سے چل دیئے۔ انہیں شاید اُس سے بات چیت کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ یا پھر وہ نہیں چاہتے تھے کہ پہرہ دار اُن کی فائزہ سے ہمدردی کو جان پائیں۔

تپتے ریگزاروں میں فائزہ کے لئے دو بوندیں بھی بہت تھیں۔ کم از کم اُسے کریم بابا کی تو ہمدردی حاصل ہوئی۔

خواہ مخواہ ہی اُس کے بدن میں توانائی سی آ گئی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر اُس نے میلے کپڑے تبدیل کیے۔ اور سامنے کی طرف کھلتی کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔

گو گرمیوں میں لوگ دور دراز سے اِس پہاڑ پر آتے ہوں گے مگر اب سیزن اختتام کو پہنچ چکا تھا۔ سردی بھی خاصی ہو گئی تھی، جبھی شاید کوئی ٹورسٹ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر یہ کوٹھی بھی ایسی سنسان جگہ واقع تھی کہ آس پاس سے بھی کسی کا گزر نہیں ہوتا تھا۔ وہ یوں ہی کبھی ایک اور کبھی دوسری کھڑکی تک ہی منڈلاتی رہتی تھی۔ فطرت جہاں پُرامن و پرسکون حسن کے لازوال خزانے لٹا رہا تھا وہ آزادی کے ایک جھونکے کے لئے ترس رہی تھی۔

وہ رات بھی گزر گئی۔ دو دن دو راتیں اور گزر گئیں۔ قید و بند کے شب و روز، درد و کرب میں ڈوبے، جیسے صدیوں پر محیط ہوں۔

صبح اُٹھ کر اُس نے منہ ہاتھ دھوئے تیار ہوئی۔ بابا ابھی تک ناشتہ لے کر نہیں آئے تھے۔ شاید کسی وجہ سے دیر ہو گئی تھی۔ آہستہ قدم چلتی وہ پچھلی کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔

نیچے کھائی میں اس قدر بادل چھائے تھے کہ اُس پار کچھ نظر آ رہا تھا. بس دُھند تھی، لامتناہی۔ اُسے یہ سب اپنے جیسا لگا۔ جو دھند میں کھو گئی تھی۔ جس کا کچھ پتہ نہیں چل رہا

تھا۔ مگر۔۔۔

آج اُس نے سوچا تھا بابا سے مزید بات کرے گی۔ کچھ نہ کچھ پوچھ کر رہے گی۔ اتنا کہ۔۔۔ اُس کی اپنی ذات کا تو پتہ چل سکے، دھند میں لپٹی ذات کا۔

معاً اُسے بابا ناشتہ کی ٹرے لئے کچن میں سے نکلتے دکھائی دیئے۔ وہ خوش خوش کھڑکی سے ہٹ آئی۔ اُسے بابا کا انتظار بھی تو رہتا تھا۔ بولتے نہیں بھی تھے ہمدرد تو تھے۔ اُسے جو طرح طرح کے اندیشے اپنی ذات، اپنی عزت، اپنی جان کے بارے میں لاحق تھے، اُنہی کی وجہ سے تو ڈھارس بندھ گئی تھی تن تنہائی کی اس قید میں۔

''کیسی ہو بیٹی؟'' ناشتے کے برتن میز پر رکھتے ہوئے انہوں نے اپنائیت سے پوچھا، اب وہ اُس سے ایک آدھ بات کر ہی لیتے تھے۔

''ٹھیک ہوں۔'' وہ صوفے پر آ بیٹھی۔ ''بابا آج دیر کر دی کیا بات ہے''۔

''بیٹی آج ایک پہرہ دار رخصت ہو رہا تھا۔ اُسے ناشتہ دینا تھا۔ پھر رات سے میرا بھانجا بھی آیا ہوا ہے اُسے بھی چائے کی ایک پیالی دے کر آ رہا ہوں...'' خالی ٹرے اُٹھاتے ہوئے انہوں نے معذرت کے انداز میں کہا۔

''اچھا۔ وہ... بابا...'' اُس نے احتیاطاً اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''آپ بتائیں گے نہیں یہ لوگ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں؟'' وہ نیچی آواز میں جلدی جلدی بولی۔

''بیٹی مجھے کچھ نہیں معلوم۔ مگر یہ اچھا نہیں ہوا''۔ وہ دکھ سے بولے۔

''بابا آپ کو معلوم ہے تین روز پہلے میری شادی تھی''۔ اُس نے بتا ہی دیا کہ وقت ہی بہت کم تھا۔

''کیا؟'' بابا کے ہاتھوں میں خالی ٹرے لڑکھڑا گئی۔

''ہاں بابا۔۔۔ میں افریقہ سے پہنچی تھی یہاں۔ میری شادی ہونے والی تھی۔ اُن لوگوں کے علاوہ میرا یہاں کوئی نہیں۔ شادی کا دن گزر گیا۔ پتہ نہیں اُن لوگوں پر کیا گزری ہو گی، کیا سوچتے ہوں گے میرے بارے میں...'' وہ رو پڑی۔

بابا دم بخود کھڑے تھے۔ جان ہی نہ رہی تھی جیسے جسم میں۔ قوت گویائی جیسے سلب ہو گئی تھی۔

پھر۔۔۔ آہستہ آہستہ اپنے حواسوں میں آنے لگے۔۔۔ اپنے فرض کا احساس ہوا جیسے، عزم جھلکنے لگا بوڑھی آنکھوں میں۔

''بیٹی اُن لوگوں کا کوئی اتہ پتہ ہے تمہارے پاس؟'' آواز میں بھی دبدبہ سا آ گیا۔

''ہاں بابا۔'' اُس نے آنسو پونچھے۔

''اب چلتا ہوں۔ تم نکال کر رکھنا۔ میں کچھ نہ کچھ کروں گا''۔ وہ چل دیئے۔

اور بے یقینی کے سے عالم میں وہ ناشتہ کرنے لگی۔

کیا بابا کچھ مدد کر سکیں گے؟ کیا واقعی ایسا ممکن تھا؟ کیا وہ رہا ہو پائے گی یہاں سے؟

وہ ایک ایک پل گننے لگی۔ یہ معلوم ہوتے ہوئے بھی کہ بابا دوپہر کے کھانے کے وقت سے پہلے نہیں آ سکتے تھے۔

وہی ہوا۔۔۔ قریباً بارہ بجے وہ کھانے کی ٹرے کے ساتھ اندر آ گئے۔

''جلدی دو۔ میں نے اپنے بھانجے کو روکا ہوا ہے''۔ وہ رازداری سے بولے۔

''یہ پتہ ہے اور ٹیلیفون کا نمبر بھی اِسی میں ہے''۔ اُس نے انہیں کاغذ کا پرزہ تھمایا۔

''ٹیلیفون سب سے اچھا ہے۔ قریبی قصبے میں ٹیلیفون ایکسچینج ہے بات کر کے شام تک جواب لے آئے گا۔ بس دعا کرو لائین مل جائے۔ اِن علاقوں میں لائین ملنا ذرا مشکل ہوتا ہے''۔ پتہ لے کر وہ چلتے بنے۔

یہ چند گھنٹے اُس نے کیسے گزارے؟ وہ اور اُس کا خدا ہی بہتر جانتے تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح کبھی ہنستی اور کبھی رونے لگتی۔ کبھی مارے خوشی کے ہواؤں کے دوش پر اُڑنے لگتی، تو کبھی مایوس ہو کر آنسوؤں کی لڑیاں پرونے لگتی۔

رات کھانے کے لئے بابا کمرے کا تالا کھولنے لگے تو اُس کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا۔

''کچھ پتہ چلا بابا'' اُس نے بے تابی سے پوچھا۔

بابا کچھ چپ چپ سے لگ رہے تھے۔

"نہیں بیٹی ابھی واپس نہیں آیا زمان"۔ انہوں نے اپنے بھانجے کا نام لیا۔ "لائن نہیں مل رہی ہوگی شاید"۔ پھر اُس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔ "مگر تم فکر مت کرو، آرام سے سو جاؤ۔ وہ دیر سے آئے گا۔ کل بتاؤں گا پھر"۔ وہ مزید کچھ کہے سنے بنا واپس مڑ گئے۔

وہ مایوس سی انہیں جاتے دیکھتی رہی۔

بابا چپ چپ سے تھے۔ کیا بات تھی؟

کوئی مناسب پیغام نہ لا سکے تھے شاید اس لئے!

وہ کھانے میں مصروف ہو گئی۔ کبھی آنکھیں کسی خوش آئند تصور کے تحت چمک اُٹھتیں۔ تو کبھی مارے مایوسی کے ماند پڑ جاتیں۔

کبھی خیال آتا فون ریسیو کرتے ہی اُس کا منگیتر دوڑا آئے گا اُسے لینے کبھی سوچتی پتہ نہیں زمان کو لائین ملتی بھی ہے آج یا نہیں؟

اُمید و بیم، آس و یاس میں کروٹیں بدلتے وہ رات بھی گزر گئی۔

آج معمول سے کچھ پہلے ہی اُس کی آنکھ کھل گئی۔ جلدی سے اُٹھی، وضو کر کے نماز پڑھی، کپڑے تبدیل کئے اور بابا کے انتظار میں بلا مقصد ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کمرے میں پھرنے لگی۔

تبھی اپنے کمرے میں قدموں کی آہٹ پر وہ لپک کر اُس طرف آ گئی۔

"بابا کیا ہوا؟" وہ جلدی سے اُن کے قریب آ گئی۔

بابا میز پر ناشتے کے برتن لگا کر خالی ٹرے ہاتھ میں لے کر سیدھے کھڑے ہوئے۔

"بیٹھو بیٹی۔" وہ بہت تحمل سے بولے۔

اُن کا لب و لہجہ کچھ اُمید افزا نہ تھا۔ مایوسی سے انہیں تکتی وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

"دیکھو بیٹی تمہیں حوصلہ کرنا ہوگا۔ میں جو بات تمہیں بتانے جا رہا ہوں وہ کوئی خاص اچھی نہیں۔ مگر ــــ دنیا میں دکھ سکھ آتے رہتے ہیں تمہیں مقابلہ کرنا ہوگا..."

وہ پریشان سی الجھی سی ایک ٹک اُنہیں دیکھے جا رہی تھی۔

"زمان کل شام ہی واپس آ گیا تھا۔ مگر رات کو میں تمہیں ایسی خبر سنا کر پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ لوگ اب تمہیں قبول کرنے کو تیار نہیں۔ کسی اور کے ہاتھوں میں پڑنے کے بعد اُن کے خیال میں تم اب اُن کے بیٹے کے لائق نہیں رہیں۔ اور پھر دو روز قبل انہوں نے اپنے بیٹے کا نکاح اپنے عزیزوں میں کرا دیا ہے اور آج وہ لوگ کویت واپس جا رہے ہیں..."

وہ سکتے کے سے عالم میں بابا کو دیکھ رہی تھی۔ اتنا بھیانک الزام وہ تو خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی... پھر... جیسے اُس کا سکتہ ٹوٹا۔

"مگر بابا آپ تو جانتے ہیں میں یہاں... میرا مطلب ہے سوائے آپ کے اس کمرے میں کوئی اور نہیں آیا..." غیر ارادی طور پر وہ اپنی صفائی دینے لگی۔

"بس کرو بیٹی"... بابا کی آنکھیں نم اور آواز میں تڑپ تھی۔ "دنیا سے خوفِ خدا اُٹھ گیا ہے شاید۔ ایسی باتیں وہی لوگ کرتے ہیں جنہیں خدا کا خوف نہیں ہوتا..."

اور... گھٹنوں پر سر رکھ کر وہ بے اختیار رو دی۔ اب کیا ہوگا؟

اُس کا تو آخری سہارا بھی جاتا رہا تھا۔

"روؤ نہیں بیٹی"... جن کا کوئی نہیں ہوتا اُن کا خدا ہوتا ہے"... بابا نے شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ "میری چاہے جان جائے تمہیں یہاں سے رہائی دلواؤں گا۔ بس موقعہ کا انتظار ہے..."

فائزہ نے روتے روتے سر اُٹھا کر انہیں دیکھا۔

"ہاں بیٹی... مجھ پر بھروسہ کرو... میری بھی تم جتنی بیٹی ہے گھر میں۔ میں نے بھی روزِ قیامت خدا کو منہ دکھانا ہے"۔

بابا چل دیئے اور وہ نئی سوچوں، نئی فکروں اور نئے اندیشوں میں گھر گئی۔

تین روز اور گزر گئے۔ اُس کے دن بوڑھے بابا کے قدموں کی آہٹیں گنتے گزر رہے تھے۔ ہر بار وہ اُس کا حوصلہ بڑھاتے، اُمید دلاتے، تسلی دیتے۔

اس دوران اُسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اُسے یہاں قید کرنے والا زار بابا کے

مالک اور علاقے کے نامی گرامی رئیس رضا احمد کا اکلوتا پوتا تھا۔ وہ لوگ یہاں سے دور نیچے شہر میں رہتے تھے اور ملک کے بیشتر حصوں میں اُن کا کاروبار پھیلا ہوا تھا... مگر...

باوجود کوشش کے نہ وہ معلوم کر پائی نہ ہی بابا کچھ بتا سکے کہ زار نے ایسا کیوں کیا تھا؟ اُس سے ایسا کیا بیر تھا کہ اُس کی ساری زندگی تباہ کر کے رکھ دی تھی۔

اگر تو اُس کا منگیتر دو چار روز کی اُس کی غیر موجودگی سے اُس سے شادی سے انکار کر سکتا تھا تو آگے کوئی اُسے کیا پوچھتا؟

سوائے اندھیروں، سیاہیوں اور تاریکیوں کے اُسے کچھ نہیں نظر آتا تھا۔

اندھیرے جو لامتناہی تھے، سیاہیاں جو لامحدود تھیں، اور تاریکیاں جو اتھاہ تھیں!

بس ایک کرن تھی جو اِن گھور اندھیاروں میں بھولے بھٹکے سے روشنی کرتے نکل جاتی۔ اور ـــــ

وہ تھی یہاں سے فرار!

''بیٹی آج شام تیار رہنا۔'' دوپہر کا کھانا اُس کے آگے میز پر رکھتے ہوئے بابا بے حد رازداری سے بولے۔

''کیا مطلب؟'' وہ بھی نیچی آواز میں پوچھنے لگی۔

''آج شام نیچے گاؤں میں اشتہار والے فلم دکھانے آ رہے ہیں۔ یہاں سے بھی سب اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اور پھر کوئی اور دیکھنے جائے نہ جائے شیر خان کا تو کوئی گلہ بھی دبائے تو بھی نہیں رکتا۔ رہ گیا سوار خان، تو وہ سرِ شام ہی سرمنہ لپیٹ چرس کا دم لینے پڑ جاتا ہے بستر پر۔'' انہوں نے باقی دو پہرہ داروں کے متعلق بتایا۔ ''زمان اوپر چار پانچ میل پر ایک صاحب کے یہاں ڈرائیور ہے، اُسے بلا کر میں نے سمجھا دیا ہے۔ وہ اپنے مالک کی گاڑی لا کر پچھلی طرف کھائی کے اُس پار والی سڑک کے موڑ پر درختوں کی اوٹ میں تمہارا انتظار کرے گا۔ سیدھا لے جا کر شہر میں میرے جاننے والوں کے یہاں پہنچا دے گا۔ بہت نیک لوگ ہیں۔ شوہر کسی مل میں ملازم ہے اور بیوی اُس کی یہیں ہمارے گاؤں کی ہے۔ آگے وہ لوگ سنبھال لیں گے سب...''

بابا واپس چل دیئے۔

اور وہ ـــــ دھڑکتے دل سے اِس پلان کے متعلق سوچنے لگی۔

اگر وہ یہاں سے نکلنے میں واقعی کامیاب ہو گئی تو؟ اور مارے خوشی کے اُس کی خوبصورت شربتی آنکھیں بھیگ گئیں۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ چپکے چپکے تیاری کرنے لگی۔

تیاری کیا تھی؟ دو جوڑے کپڑے ہی تو لینے تھے۔ کچھ زیور تھا می کا اُس کے لئے سنبھال کر رکھا ہوا، اور کچھ نقدی ـــــ اِس سے زیادہ وہ لے جا بھی نہیں سکتی تھی۔

''اِدھر آؤ بیٹی۔'' شام کی چائے میز پر رکھتے ہوئے بابا نے اُسے پیچھے کھائی کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی جانب بلایا۔

وہ کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔

''اِس کھائی میں سے گزر کر وہ سامنے اوپر سڑک پر جہاں گھنے درخت نظر آ رہے ہیں، یہاں موڑ پر گاڑی کھڑی ہو گی۔ شام ہوتے ہی میں کھانا لے آؤں گا، خالی برتن لے کر جاؤں گا تو دروازہ کھلا چھوڑ جاؤں گا، تم خود نکل کر یہ پچھلی سیڑھیاں اُتر جانا، میں تمہیں باورچی خانے کی پچھلی کھڑکی سے دیکھوں گا، اللہ کا نام لے کر کھائی میں اُتر جانا، بے خوف ہو کر جانا، اندھیرا ہو گا میں بیٹری دوں گا راستہ دیکھنا، شارٹ کٹ ہے کبھی کبھار لوگ گزرتے ہی ہیں کسی کو شک نہیں ہو گا۔ گاڑی چلنے لگے گی تو زمان مجھے گاڑی کی بتیوں سے اشارہ دے دے گا۔ سمجھ گئیں نا...''

''ہاں بابا'' اُس نے آہستہ سے کہا گو کام مشکل لگ رہا تھا۔

''اپنی چیزیں سمیٹ لی ہیں؟'' پلٹتے ہوئے وہ جیسے اپنی تسلی کے لئے بولے۔

''ہاں بابا وہ رکھی ہیں'' اُس نے مسہری کے نیچے بیگ کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے زیادہ تم اُٹھا بھی نہیں سکو گی۔ باقی چیزیں پھر میں ہی کبھی پہنچا دوں گا۔ اچھا اب چلتا ہوں۔'' انہوں نے جانے کے لئے قدم بڑھائے۔

''بابا ـــــ آپ کیا جواب دیں گے اِن لوگوں کو؟'' اُسے فکر بہرحال تھی۔

''وہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ کہہ دوں گا خالی برتن باورچی خانے لے گیا تھا، واپس آ کر

تالا لگایا مگر صبح دیکھا تو تم غائب تھیں، شاید اتنی ہی دیر میں نکل گئی تھیں''۔ وہ مسکرائے۔

''کیا کروں بیٹی تمہاری اگر جان بچتی ہے تو مجھے جھوٹ تو بولنا ہی پڑے گا ...''

''لیکن وہ آپ کو کچھ ...''

''پھانسی لٹکائیں گے نہیں، آگے اللہ مالک ہے''۔ وہ دروازے کی طرف بڑھے۔

اور فائزہ احسان مندی سے اِس مشفق ومہربان انسان کو جاتے دیکھتی رہی۔

ایک انسان نے اُسے اونچائیوں سے اُٹھا کر ذلتوں کی عمیق گہرائیوں میں گرا دیا تھا۔

اور دوسرا اُسے اُن گہرائیوں سے نکال کر دوبارہ اونچائیوں کی راہ پر گامزن کرنے جا رہا تھا۔

کیسے کیسے لوگ بستے تھے خدا کی اِس بستی میں!

آج سرِ شام ہی بابا رات کا کھانا لے آئے۔ اُس نے کھڑے کھڑے دو نوالے لئے، بابا کی دی ہوئی گرم ملگجی چادر اپنے گرد لپیٹی، کھانے کی ٹرے سے ٹورچ اُٹھا کر بیگ میں ڈالا اور جانے کے لئے تیار ہو گئی۔

تبھی بابا نے آکر برتنوں کی ٹرے اُٹھالی۔

''خدا حافظ بیٹا'' وہ دروازے سے باہر نکل گئے۔

''خدا حافظ بابا'' اُس نے کہا اور ــــ

بیگ کندھے سے لٹکاتے ہوئے احتیاطاً ادھ کھلے دروازے میں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے وہ بھی باہر نکل آئی۔ قدم بھر پر سیڑھیاں تھیں، وہ دبے قدموں نیچے اُتر گئی۔

اُس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ یہاں جگہ بالکل سنسان اور شام کے سائے گہر آئے تھے۔

ایک بھی پل ضائع کئے بنا وہ آگے بڑھنے لگی۔ چند ہی قدم پر کھائی تھی۔ اُترنے سے پہلے اُس نے غیر ارادی طور پر مڑ کر دیکھا۔

وہاں کوئی نہیں تھا۔ کوئی اُس کا پیچھا نہیں کر رہا تھا۔ اندازے سے اُس نے ایک نظر اُسی سمت کھلتی کچن کی کھڑکی پر ڈالی۔ کچن کی بتی کی روشنی میں بابا کھڑکی میں کھڑے اُسی سمت دیکھتے صاف نظر آ رہے تھے۔

اُسے بہت ڈھارس ہوئی، آگے بڑھی اور کھائی میں اُتر گئی۔

اونچے اونچے چیڑ کے درخت، جھاڑیاں، خودرو پودے ــــ اونچی نیچی ناہموار زمین، کنکر، پتھر اور ــــ پہاڑی جھینگروں کی سماعت کو چیرنے والی ناخوشگوار آوازیں، اوپر سے گھپ اندھیرا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے بیگ میں سے ٹورچ نکال لیا۔ روشنی کرتے ہوئے وہ ڈر رہی تھی مگر ــــ اِس کے سوا چارہ بھی نہ تھا، راستہ کسی طرح نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

خدا کا نام لے کر اُس نے ٹورچ روشن کیا، راستے کا تعین کیا اور تیزی سے چل پڑی۔ اُس کی طرح کی چادر پہرہ دار بھی لپیٹے رکھتے تھے۔ عام تھی شاید یہاں اور سڑک اور کھائیوں میں اندھیرے کی وجہ سے اِکا دُکا راہی ٹورچ بھی ضرور لئے ہوتا تھا۔ اُس کا بھی تاریکی میں یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ مرد تھی یا عورت اور ــــ شاید یہ بھی کہ ــــ وہ فرار ہو رہی تھی!

پھر بھی اُس کا دل دھڑک رہا تھا، زور زور سے ــــ سانسیں چل رہی تھیں تیز روی سے

اُس نے ایک خوفزدہ نظر اوپر، اِردگرد ڈالی۔ کہیں بھی کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ قدرے مطمئن ہوئی۔ قدم اور بھی تیز کر لئے۔

عام حالات میں کوئی اُسے خزانے بھی دیتا تو وہ نہ اُترتی اِس کھائی میں مگر ــــ آج اِس وقت ــــ آزادی کی خواہش نے اُس کے نازک دھان پان جسم میں بجلی کی طاقت بھر دی تھی۔

اُس کا بس چلتا تو وہ بھاگ کر دوسرے کنارے پر پہنچ جاتی مگر ناہموار راستے، نوکیلے پتھروں اور اندھیرے کی وجہ سے ایسا ممکن نہ تھا۔

بہر حال وہ چلتی جا رہی تھی ــــ آگے ہی آگے!

دیوقامت درخت اندھیرے میں بہت بھیانک دکھائی دے رہے تھے، کیڑے مکوڑوں کی آوازیں دہشت ناک لگ رہی تھیں اور ـــــ خود اُس کے قدموں کی آہٹیں بے حد پراسرار معلوم ہو رہی تھیں مگر ـــــ

''رات ڈاکخانے والوں پر خوب گزری۔ دروازے اندر سے بند کر کے گھبرائے بیٹھے رہے چیتا آس پاس منڈلاتا رہا...''

ایک دو ہی روز قبل بابا کی مسکراتے ہوئے بتائی بات یاد آتے ہی اُس کے رونگھٹے کھڑے ہو گئے۔ قدم لرز گئے، سانس پھول گئی۔

''بہن جلدی کرو''۔ دفعتاً اُوپر سے آواز آئی۔

اُس نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ کھائی کے دہانے پر کوئی کھڑا اُسے مخاطب کر رہا تھا، یقیناً زمان تھا۔ تو وہ پہنچ چکی تھی اپنی منزل پر ـــــ خوشی سے وہ بے قابو ہونے لگی۔

سارا خوف جاتا رہا۔ قدم مستحکم ہو گئے، سانس ہموار ہونے لگی۔

اور باقی کے چند قدم تیزی سے طے کرتی وہ اوپر مخصوص جھنڈ میں کھڑی گاڑی تک آ گئی۔

''بیٹھو بہن۔'' زمان نے اُس کے لئے پچھلا دروازہ کھولا۔

خود ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔

اور ـــــ بابا کی ہدایت کے مطابق انہیں بتیوں کا اشارہ دیتے ہی چل پڑا۔

فائزہ نے اِرد گرد آس پاس دیکھا۔ کوئی بھی اُن کا پیچھا نہیں کر رہا تھا۔ گاڑی چکردار سڑک پر آگے بڑھنے لگی۔ ہر سو اندھیرا تھا، اِکا دُکا مکان میں لوگ سردی کے مارے اندر گھسے بیٹھے تھے، کوئی بھی تو نظر نہیں آ رہا تھا۔

اب گاڑی قصبے سے باہر نکل آئی تھی۔ فائزہ نے ایک نظر اور باہر ڈالی۔ گہرا کُہر اچھایا ہوا تھا، اُن کے علاوہ کوئی اور گاڑی نہ تھی سڑک پر۔ کوئی ذی روح نہیں تھا آس پاس۔

مطمئن ہو کر اُس نے سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا۔ تھکی مضمحل آنکھیں موندلیں۔ آج وہ جیسے صدیوں کی اذیت ناک قید سے رہا ہوئی تھی۔

قید ـــــ جس میں اُسے پل پل اپنی عزت کا خطرہ لاحق رہا تھا۔ قید ـــــ جس میں وہ لمحہ لمحہ

اپنے کہیں بک جانے سے خوفزدہ رہی تھی۔ قید ـــــ جس میں اُسے گھڑی گھڑی اپنی موت کا ڈر رہا تھا!

قید ـــــ جس میں وہ لمحہ لمحہ اپنے کہیں بک جانے سے خوفزدہ ہو رہی تھی۔

قید ـــــ جس میں اُسے گھڑی گھڑی اپنی موت کا ڈر رہا تھا۔

زمان اُسے صادق چاچا اور زہرہ چاچی کے سپرد کر گیا۔

زہرہ چاچی، صادق چاچا، اُن کی بیٹیوں نسرین اور پروین سبھی نے اُسے ہاتھوں
ہاتھ لیا تھا۔ چھوٹے سے بوسیدہ کوارٹر میں رہنے والے یہ لوگ کتنے مخلص، کتنے فراخدل،
کتنے عظیم تھے۔ چاچی تنگدستی میں اُسے اچھے سے اچھا کھلانے کی ہر ممکن کوشش کرتیں،
صادق چاچا اُس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر کسی بھی قسم کی فکر کرنے سے باز رکھنے
کی حتی الوسع کوشش کرتے اور نسرین اور پروین تو جیسے اُس کی خوبصورتی اور خوب سیرتی
کی اسیر بن کر رہ گئی تھیں۔

اُسے یہاں آئے تین چار روز ہو گئے تھے۔ وہ یہاں بہت خوش تھی، بہت مطمئن۔
اُن کا اخلاق اور فراخدلی دیکھ کر وہ اکثر سوچتی جن کے پاس کچھ نہیں ہوتا اُن کے

دلوں میں کتنی جگہ ہوتی ہے اور جن کے پاس سب کچھ ہوتا ہے وہ دل کے کتنے تنگ ہوتے ہیں، کتنے چھوٹے ہوتے ہیں۔ وہ دل ہی دل میں اِن لوگوں کی عظمت کو سراہتی مگر ــــ

ساتھ ہی اِن کے محدود وسائل اور غربت سے کشاکشی دیکھ کر وہ سوچ میں پڑ جاتی۔ ایسے حالات میں کیا اُس کا بھی وہیں پڑ رہنا زیادتی نہ تھی؟

اُس کی نظریں تنگ سے کمرے میں بوسیدہ بستروں میں سوئیں نسرین اور پروین پر گئیں۔ دوسرے کمرے میں چاچا چاچی کا بھی یہی حال تھا۔ اُسے اپنا آپ چھوٹا سا محسوس ہوا۔ ایسی کسمپرسی میں وہ بھی آ کر اُن پر بوجھ بن بیٹھی تھی ــــ گو وہ بغیر پیسے کے نہ تھی۔ افریقہ میں اُس کا مکان کرائے پر اُٹھ چکا تھا، بزنس کا پیسہ تھا، بینک میں رقم تھی اور یہ سب اُس کے کہیں سیٹل ہو جانے پر یہاں کے کسی بینک میں ٹرانسفر ہو کر اُسے ملنا شروع ہو جاتا تھا مگر ــــ

سرِ دست تو وہ اُن پر بوجھ رہی تھی۔ وہ لوگ ــــ جو خود بھوکے بھی رہ جاتے تو بھی اُسے ضرور کھلاتے۔ یہ اُسے یقین تھا ــــ اور ایسے عظیم محسنوں پر مزید بار بننا اُس کے ضمیر کو گوارا نہ ہوا!

وہ گریجویٹ تھی وہاں کی۔ اعلیٰ سکول اور کالج سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اُس کی ایک کلاس فیلو کو تو وہاں ایئر لائن میں بہت اچھی نوکری مل گئی تھی۔ وہ بھی کوشش کر سکتی تھی۔ کسی سکول میں ٹیچنگ کے لئے، کسی آفس میں سیکرٹری کی جاب کے لئے، ایئر لائن میں کسی ہوٹیل میں۔ کئی جگہیں تھیں۔ کوشش کرنے سے کچھ نہ کچھ مل سکتا تھا۔

پکا اِرادہ کر لینے کے بعد وہ مطمئن ہو کر سو گئی۔

گو اگلی صبح کو اُس کے فیصلے پر گھر میں خاصی لے دے ہوئی مگر ــــ اُس کا اِرادہ پکا تھا۔ چاچی چاچا کو اُس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔

''ٹھیک ہے بیٹی جیسے تمہاری مرضی مگر یہ مت کہنا کہ اب رہو گی بھی وہاں جہاں نوکری ملے گی''۔ صادق چاچا نے کہا۔

اور فائزہ پھر سوچ میں پڑ گئی۔ اُس نے یہی تو سوچا تھا کہ کہیں سروس کرے گی اور

وہیں منتقل ہو کر اِن لوگوں کا بوجھ ہلکا کرے گی۔

''اب اور نہیں سوچو''۔ زہرہ چاچی بولیں۔

''ٹھیک ہے جیسا آپ لوگ کہیں گے''۔ اُس نے سوچا محنت سے کما کر، لا کر اُن کے ساتھ مل بانٹ کر بھی تو اُن کے احسان کا بدلہ چکایا جا سکتا تھا۔

اُس نے اخبار لگوا لیا تھا۔ روزانہ صبح ہی صبح اشتہارات کے کالم پر نظریں دوڑاتی۔ اور ایک دن اُسے اپنی کوالیفیکیشن کے حساب سے جگہ نظر آ ہی گئی، کسی دفتر میں سیکرٹری کی جگہ خالی تھی اور انٹرویو کے لئے تاریخ اور وقت دیا گیا تھا۔

مقررہ دن پر وہ صبح ہی صبح تیار ہوئی۔ دس بجے انٹرویو تھا۔ گھنٹہ بھر تو چاچا کے حساب سے وہاں پہنچنے میں لگتا تھا۔ نو بجے سے پہلے ہی وہ اُسے بس سٹاپ پر لے آئے۔

کسی پرائیویٹ کمپنی کے منیجر کو اپنے آفس کے لئے سیکرٹری کی ضرورت تھی۔ مقررہ وقت پر پہنچ کر وہ امیدوار لڑکیوں کی لائین میں بیٹھ گئی۔ جلد ہی اُس کی باری آ گئی۔

وہ اندر گئی۔ اعتماد سے انٹرویو دیا، بوس مطمئن ہوئے اور اُس کی سیلیکشن ہو گئی۔

اُسے پرسوں کام پر آنے کو کہہ دیا گیا۔ اور وہ بے حد خوش گھر لوٹ آئی۔

سبھی خوش تھے کہ پہلی ہی کوشش میں وہ بہت خوبی سے کامیاب ہوئی تھی، اُس نے مٹھائی منگوا کر سب کو کھلائی اور ـــ خوش آئندہ تصورات میں وہ مستقبل کے تانے بانے بننے لگی۔

آج اُس کی تقرری کا پہلا دن تھا۔ صبح ہی صبح اُٹھ کر وہ نہائی، نماز پڑھی، ناشتہ کیا اور آفس جانے کے لئے تیار ہونے لگی۔

صاف کپڑے پہن کر اُس نے لمبے گھنے بالوں کی چوٹی بنائی، لیدر کے شوز پہنے، دوپٹہ اچھی طرح کھول کر لیا اور بیگ میں اپوائنٹمنٹ کے کاغذات رکھتی بیگ کندھے سے لٹکاتی چاچی کو خدا حافظ، کہتی اُن کی دعاؤں میں رخصت ہو گئی۔

جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھتی وہ اوپر پہنچ گئی۔

''مس انوار ـــ آپ کو منیجر صاحب نے بلایا ہے''۔ آفس میں بیٹھے ایک کلرک نے اُسے دیکھتے ہی کہا۔

''May I come in sir.'' وہ منیجر کے دروازے پر بولی۔

''آیئے مس انوار'' ایک فائل پر دستخط کرتے ہوئے وہ سر اُٹھا کر اُسے دیکھنے لگا۔

''سر آپ نے مجھے بلایا تھا''۔ وہ قریب چلی آئی۔

''ہاں ـــ وہ...'' پتہ نہیں کیوں اُس سے جیسے بات ہی نہ بن رہی تھی۔ ''دراصل آپ کی اپوائنٹمنٹ کینسل ہو گئی ہے''۔ اُس کا لہجہ معذرت لئے تھا۔

''کیوں؟'' مایوسی کے عالم میں اُس کے منہ سے نکلا۔

''مجھے افسوس ہے آپ کی جگہ کسی اور کو دے دی گئی ہے''۔ اُس نے سر فائل پر جھکا لیا۔

اور وہ ـــ چپ چاپ، واپس پلٹ آئی۔

بس میں بیٹھ کر اُس نے سوچا ـــ ایسا کیوں ہوا تھا؟

اِسی منیجر نے اُس کی سلیکشن کی تھی، اسی نے کینسل کر دی۔ پھر وہ اُسے بتاتے ہوئے جھجک سا بھی رہا تھا۔ معذرت خواہ سا بھی تھا۔ آخر میں سر فائل پر جھکا لیا تھا، جیسے اُس کی جگہ کسی اور کو دے دینے پر اُس کا سامنا نہ کر پا رہا تھا۔

اُلجھی اُلجھی سی وہ گھر آ گئی۔ سارا دن بے کیفی سے گزرا۔

اور پھر ـــ وہ نئے سرے سے اخبارات میں خالی اسامیوں کے اشتہارات پر نظریں دوڑانے لگی۔

آج اُس کی ایک انگلش میڈیم سکول میں ٹیچر کی ضرورت کے اشتہار پر نظر پڑ گئی۔ وہ فوراً تیار ہوئی۔ اور اخبار سے پتہ لے کر وہاں پہنچ گئی۔ پرنسپل سے ملی۔ اُن کے معیار پر پوری اتری۔ اور اُن کی ہدایت کے مطابق اگلے ہی دن پڑھانے پہنچ گئی۔

کلاس شروع ہوئے ابھی چند ہی منٹ گزرے تھے کہ چپڑاسی آ گیا۔

''میڈم پرنسپل صاحب بلا رہے ہیں''۔

نپے تلے قدم اُٹھاتی وہ پرنسپل کے آفس پہنچ گئی۔

''آیئے۔'' وہ فون ریسیو کرتے ہوئے سر کے اشارے سے بولے۔ وہ اندر چلی گئی۔

''... ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ اچھا...'' فون پر کہتے کہتے پرنسپل نے متاسف سی سانس لی۔ ''جیسا وہ کہتے ہیں ہوگا۔ ٹھیک ہے۔ او کے''۔ انہوں نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

پھر ایک گہری سانس لی۔

''مس انوار ہمیں افسوس ہے کہ''۔ اپنے سامنے کھلے رجسٹر پر نظریں جماتے ہوئے وہ کہنے لگے۔ ''آپ یہاں نہیں پڑھا سکتیں''۔

کیسا لب ولہجہ تھا؟ انکار بھی اور تاسف بھی!

کیسا رویہ تھا؟ کل اختیار سے بھرپور ـــ آج نظریں ملاتے ہوئے بھی ہچکچاہٹ تھی جیسے۔

کیا اسرار تھا؟

وہ اُلجھ سی گئی۔

مگر ___ پچھلے آفس کی طرح پوچھا نہیں کہ کیوں؟

پتہ نہیں کیوں اُسے خود ہی اچھا نہیں لگا کہ وہ آج بھی وجہ پوچھے۔

تھکے تھکے قدموں سے وہ باہر نکل آئی۔

اُداس اُداس سی گھر میں داخل ہوئی۔ چاچی اور نسرین شاید کہیں گئی ہوئی تھیں، پروین غسل خانے میں تھی، چاچا مل پر تھے ___ وہ نڈھال سی بستر پر پڑ رہی۔

"ہمیں خوشی ہے کہ آپ کی فارن کوالیفیکیشن سے ہمارے بچے فائدہ اُٹھا سکیں گے"۔ کل یہی پرنسپل اُس کے دستاویزات دیکھتے دیکھتے خاصا متاثر سا کہہ رہا تھا۔

اور آج ___

"ہمیں افسوس ہے کہ آپ یہاں نہیں پڑھا سکتیں۔"

کیوں ہوا تھا ایسا؟ وہ بار بار سوچتی رہی۔

مایوسی اور نا امیدی میں کچھ دن اور گزر گئے۔

موسم بھی سرد ہو چلا تھا۔ دن چھوٹے ہو گئے تھے اور شامیں یخ بستہ!

اُس نے ایئر لائن میں بھی اپلائی کیا تھا۔ کسی ہوٹیل میں گیسٹ ریلیشنز آفیسر کی پوسٹ کے لئے بھی درخواست دی تھی۔ یوں ہی بے کیفی اور بے کلی میں دن کاٹ رہی تھی۔ شاید کہیں سے بلاوا آ جائے، یہی انتظار لگا رہتا تھا۔

چھوٹے سے باورچی خانے میں بیٹھی وہ آلو چھیل رہی تھی۔ چاچی پاس ہی بیٹھیں آٹا گوندھ رہی تھیں۔ گاہے گاہے ایک نظر اُس پر ڈال لیتیں۔ اچھے کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی تھی۔ حالات نے کیسے آ لیا تھا۔ کہاں سے کہاں پہنچ کر بھٹک رہی تھی۔

انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"بیٹی تم نے کہا تھا جہاز کی نوکری کے لئے درخواست دی ہے"۔ وہ آٹے میں تھوڑا اور نمک ملاتے ہوئے بولیں۔

"ہاں چاچی دی تو ہے۔"

"جواب پتہ نہیں کیوں نہیں آیا اب تک؟"

"یہی میں بھی سوچ رہی ہوں"۔

اور ___ بیرونی دروازے پر اچانک دستک ہوئی۔

فائزہ فوراً اٹھی۔ اِس وقت اکثر ڈاکیہ ہی آیا کرتا تھا۔

اور اُس کی عین توقع کے مطابق ڈاکیہ ہی تھا، خط بھی اُسی کے نام تھا۔ ہوٹیل والوں کی طرف سے آیا تھا۔

خط لئے لئے وہ باورچی خانے میں آ گئی۔

"چاچی میں نے ایک درخواست ہوٹیل میں بھی دی تھی"۔ وہ لفافہ کھول کر خط پر نظریں دوڑاتے ہوئے خوش خوش بولی۔ "وہیں سے بلاوا آیا ہے"۔

"چلو مبارک ہو۔" وہ بھی خوش ہو گئیں۔

"چاچی مبارک تو تب دیجئے گا جب سلیکشن ہو جائے گی"۔ اُس نے خط تہہ کر کے دوبارہ لفافے میں ڈال دیا۔

دو دن اور آس و یاس میں گزر گئے۔

اور آج وہ مقررہ وقت پر شہر کے ایک معروف ہوٹیل میں انٹرویو دینے پہنچ گئی۔

چند لڑکیاں اور بھی آئی بیٹھی تھیں۔

اُس کی باری آخر میں آئی۔

"آئیے مس انوار" اپنے سامنے کھولے اُس کے فائیل اور پھر اُس کی شخصیت سے متاثر سے مینیجر نے خوش اخلاقی سے کہا۔

وہ آگے بڑھ آئی۔

"تشریف رکھیئے"۔ مینیجر نے اُسی لہجے میں اپنے مقابل کی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"تھینک یو"۔ وہ بیٹھ گئی۔

ایک بار پھر اُس کی فائیل پر، اُس کی کوالیفیکیشن وغیرہ پر نظریں ڈالتے ہوئے مینیجر نے اُس سے چند ایک سرسری سوالات کئے۔ اپنی تسلی کی۔

جس پوسٹ جس ڈیوٹی کے لئے انہیں جس وضع قطع کی لڑکی کی ضرورت تھی فائزہ

اُن کی سوچ سے کہیں بڑھ کر موزوں تھی۔

اُس کے طور طریقے بہت ڈیسنٹ تھے، لب ولہجہ بے انتہا ملائم۔ انداز گفتگو چونکا دینے والی حد تک دلکش اور دیکھنے میں بہت خوبصورت تھی۔

اُردو کے علاوہ انگریزی اور فرنچ پر بھی عبور تھا۔ اُن کے ہوٹیل میں باہر ممالک کے بھی مہمان آتے رہتے تھے۔ مہمانوں کو کس طرح ڈیل کیا جاتا ہے اُس سے بہتر شائد کوئی اور لڑکی نہ کر پاتی۔

''لگتا ہے آپ ہی کو ہمارا ہوٹیل سنبھالنا پڑے گا مس انوار''۔ مینیجر نے خوشگوار انداز میں کہا۔

''تھینک یو سر''۔

دفعتاً فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔

''یس...'' مینجر نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ تھوڑی دیر اُس طرف کی بات سنتا رہا۔

''اوہ نو سر۔ She is ideal for the Job... کیا؟ مسٹر زار نے کہلایا ہے؟ مگر کیوں سر؟... لیکن وہ انٹرویو کے لئے آئی سب لڑکیوں سے اچھی ہے... اوہ...'' اُس کی آواز میں مایوسی تھی۔ ''ٹھیک ہے،... بہتر ہے... او کے''۔ اُس نے جیسے خفگی سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

''ایم سوری میڈم... کہ...''

''کہ یہ جاب مجھے نہیں مل سکتی۔'' وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ تھینک یو ویری مچ''۔ وہ باہر نکل آئی۔

تو یہ۔۔۔ مسٹر زار تھا۔ جو ہر جگہ اُس کی بنی بنائی بات بگاڑ دیتا تھا۔

مگر۔۔۔ کیوں؟

ایک بار پھر یہی سوال ذہن میں لئے وہ بس میں بیٹھی گھر کی طرف جا رہی تھی۔

یہ زار کون تھا؟ کیا چاہتا تھا اُس سے؟

پہلے اُس کی شادی بگاڑی۔ پھر وہ جس جگہ بھی نوکری کی تلاش میں گئی، پا لینے کے بعد بھی وہ نوکری چھڑوائی۔ آخر کیوں؟ کیا بیر تھا اُسے اُس۔سے؟

اور۔۔۔ اِس کا مطلب تھا وہ اب تک برابر اُس کا پیچھا کر رہا تھا!

لیکن۔۔۔ اُسے دوبارہ پکڑا نہیں اغوا نہیں کیا۔۔۔ شاید صرف شادی رکوانا چاہتا تھا، ختم کروانا چاہتا تھا جو ختم ہو گئی تھی اور اب شاید اُس سے مزید سروکار نہ رہا تھا۔۔۔ مگر پیچھا کیوں کر رہا تھا؟ جگہ جگہ نوکری کیوں چھڑوا رہا تھا؟ وہ اِسی شہر میں رہتا تھا، اپنا اثر ورسوخ استعمال کر رہا تھا، کیا وہ آگے بھی کسی جاب کی وصولی میں کامیابی حاصل کر سکے گی؟

اُسے دوبارہ اُٹھا لے جانے کا تو یقیناً اُس کا ارادہ نہیں تھا ورنہ جیسے کہ لگتا تھا وہ اُس کی پل پل کی خبر رکھتا تھا اب تک اُسے کبھی کا اُٹھوا چکا ہوتا۔

یہ بات یقیناً نہیں تھی۔

بس وہ اُس کی کوئی نہیں چلنے دے رہا تھا اور بس!

پہلے شادی۔۔۔ اب نوکری۔۔۔ کچھ بھی تو کرنے نہیں دے رہا تھا۔

اُس کے ساتھ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے کیا وہ سکون کی زندگی گزار سکتی تھی؟

پریشان سوچوں میں کھوئی تھی کہ بس رک گئی۔ اُتر کر وہ فٹ پاتھ پر ہو لی۔ غیر ارادی طور پر مڑ کر دیکھا کوئی اُس کا پیچھا تو نہیں کر رہا تھا؟ وہ دنوں بعد اِس وقت کچھ خوفزدہ کچھ گھبرائی سی تھی۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ سب اپنی اپنی راہ چل رہے تھے۔ پھر دن کا وقت تھا، خاصی رونق تھی اور وہ محتاط۔۔۔ دل مضبوط کر کے وہ گھر کے اندر داخل ہو گئی۔

اخبار وہ اب بھی بلا ناغہ دیکھتی تھی۔ مگر کوئی ویکنسی نظر نہ آئی تھی۔ کچھ دل بھی بجھ سا گیا تھا۔ ایئر لائین کی طرف سے بھی ابھی تک کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ اگر چہ اُسے یقین تھا وہاں بھی وہ اُس کی دال گلنے نہیں دے گا۔

نوکری تو ایک طرف وہ بسا اوقات ڈر بھی جاتی کہیں وہ اسے کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ گو اُس نے نوٹ کیا تھا وہ اُسے کسی قسم کا جسمانی گریز پہنچانے کے درپے بالکل نہیں تھا۔ بس ــــ اُس کا کیریئر بننے نہیں دے رہا تھا جیسے۔ زندگی اجیرن بنا رکھی تھی۔

مگر پھر بھی ــــ اُسے ایک دھڑکا سا لگا رہتا تھا، خوفزدہ سی رہنے لگی تھی وہ محتاط ہو گئی تھی بہت ــــ گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ کبھی سوچتی گھر والوں کو بھی بتا دے مگر پھر

سوچتی کیا اپنے ساتھ سب کو پریشان کرنا!

آج نہ چاہتے ہوئے بھی نسرین اور پروین کے اصرار پر وہ انہیں شوپنگ کرنے لے گئی۔ اُسے خود بھی سویٹر اور کوٹ خریدنے تھے۔ سردی خاصی تھی اور اُس کے پاس گرم کپڑے ناکافی تھے۔ وہ نسرین اور پروین کی طرح کی چادر بھی خریدنا چاہتی تھی۔ وہ باہر نکلتی تھی تو اکثر مرد گھورتے تھے۔ چادر لے کر وہ زیادہ محفوظ محسوس کرتی۔

اُس کے کہنے پر سب نے جلدی جلدی خریداری کی۔ اپنے ساتھ ساتھ اُس نے نسرین اور پروین کے لئے بھی سویٹر خریدے، چاچی کے لئے شال لی اور چاچا کے لئے گرم جرابیں۔ اِسی بہانے وہ اِن لوگوں کی تھوڑی بہت مدد کر سکتی تھی۔

آج بھی وہ اِدھر اُدھر دیکھتی جاتی۔ کوئی اُس کے پیچھے تو نہیں لگا تھا۔

آج بھی سب نارمل تھا کسی قسم کی مشکوک بات نہ تھی۔ قدرے مطمئن انہیں لئے وہ لوٹ آئی۔

نسرین اور پروین سیدھی باورچی خانے میں چلی گئیں۔ وہ کپڑے بدلنے کمرے میں آ گئی۔

”مِل کا مینیجر کہہ رہا تھا کہ مالک کہتا تھا اگر میں فائزہ کو اور گھر میں رکھوں گا تو وہ مجھے نوکری سے نکال دیں گے“۔ دوسرے کمرے میں سے اُس کے کانوں میں چچا کی آواز پڑی۔

”ہائے ہائے یہ کیسے ہو سکتا ہے ہم اُس بیچاری کو گھر سے نکال دیں۔ اُس کا اور ہے ہی کون یہاں“۔ چاچی نے کہا۔

”یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔ پتہ نہیں مالک کو اِس بیچاری سے کیا دشمنی ہے...“

اور فائزہ کو چکر سا آ گیا۔

مِل مالک یا تو زار تھا اور یا پھر اُس کا کوئی دوست!

تو اُس کی وجہ سے اب وہ چاچا کے بھی درپے ہو گیا تھا!

اب کیا ہو گا؟ کیا وہ چاچا کو نوکری سے ہاتھ دھوتے دیکھتی رہے گی؟ اُن کے کنبے کا پالن کون کرے گا؟ جوان جہاں نسرین اور پروین کا کیا ہو گا؟

رات اُس نے آنکھوں میں کاٹی۔

صبح اذان کے ساتھ ہی وہ بستر سے اُٹھی۔ وضو کیا، نماز پڑھی، اپنے رب سے اپنے سکون اور عزت کی دعا مانگی اور ___ رات ہی چاچا چاچی کے نام لکھا خط کمرے میں میز پر رکھتے ہوئے اپنا سوٹ کیس اُٹھایا۔ بیگ کندھے سے لٹکایا۔ دبے پاؤں برآمدے میں آئی۔ چاچا غسل خانے میں تھے چاچی شاید ابھی بھی کمرے میں تھیں۔ دا آہستہ سے دروازے کی طرف بڑھی دھیرے سے کنڈی کھولی۔

اور ایک بار پھر وہ ___ ٹرین میں سوار ایک اور انجانے شہر کی جانب رواں دواں تھی۔

کہ اب وہ اور اِس شہر میں رہنا نہیں چاہتی تھی۔ نہ زارا اُسے ٹکنے دے رہا تھا۔ نہ وہ اپنے محسنوں کو اپنی ہی وجہ سے روزی کا محتاج ہوتے دیکھ سکتی تھی۔

کئی گھنٹوں کے طویل سفر کے بعد وہ ریل سے اُتری، ٹیکسی لی اور ___ ایک درمیانے درجے کے ہوٹل کی طرف روانہ ہوگئی۔

کہ اب اُس کے پاس نقد رقم محدود اور آئندہ کا کوئی حال معلوم نہ تھا۔ پتہ نہیں اُس کی قسمت میں کہیں سیٹل ہونا تھا بھی یا نہیں کہ وہ سیٹل ہوتی اور اپنا پیسہ یہاں ٹرانسفر کرواتی!

ٹیکسی سے اُتر کر وہ ہوٹل کے ریسپشن کی طرف چلدی۔

ضروری کاروائی سے فارغ ہو کر وہ "کی بورڈ" سے اپنے کمرے کی چابی اُتارنے لگی، رخ لابی کی طرف اور پھر باہر سڑک کی طرف ہوا۔ تو اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔

ایک جانا پہچانا سا چہرہ گاڑی میں سے اُسے گھورتا آہستہ آہستہ وہاں سے چل دیا۔

اور ___ معاً اُسے یاد آیا۔ یہ وہی ڈرائیور تھا جو اُسے ایئرپورٹ سے ہل سٹیشن لے کر گیا تھا اور اُسے وہاں کوٹھی میں تالا لگا کر محبوس رکھا تھا۔ چوکیدار بابا نے اُسے بتایا تھا یہ زارا کے کسی دوست کا ڈرائیور تھا۔

خوف کی ایک لہر اُس کے پورے سراپے میں سرایت کرگئی۔ ایک پل کو آنکھوں

کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ توازن ڈگمگا کر رہ گیا۔

دوسرے ہی لمحے اُس نے خود کو سنبھالا، چابی لی اور ___ بیرے کی ہمراہی میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتی اوپر کمرے کی طرف چل دی۔

اُس کا سامان لگا کر بیرا واپس لوٹا۔ تو وہ بے دم سی کرسی پر ڈھیر ہوگئی۔

اُس کا پیچھا کرتے کرتے وہ یہاں آ پہنچا تھا!

اِس کا مطلب تھا اب وہ اِس شہر میں بھی اُسے ٹکنے نہیں دے گا۔

یہاں بھی اُسے کوئی ہاتھ پیر ہلانے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ کہ اُس نے اُس کی ہر کوشش ناکام بنادینی تھی!

تھکا وجود، تھکا ذہن، تھکی روح ___ نڈھال ہوگئی۔

سارا دکھ، سارا درد، سارا کرب ___ تڑپ اُٹھا۔

اور وہ ___ رودی، بلک بلک کر، پھوٹ پھوٹ کر!

کہاں جائے وہ؟ کون ہے اُس کا یہاں؟ کس کو پہچانتی ہے وہ؟

پاپا تو جب وہ چھوٹی سی تھی گزر گئے تھے۔ ممی نے کبھی اُس کے سامنے اپنے علاقے کا ذکر ہی نہیں کیا تھا۔ بقول اُن کے اُن لوگوں کا اب وہی ملک تھا وہی وطن تھا۔ یہ تو ___ وہ جوان ہوئی بلکہ پڑھائی پوری کی تو انہیں اچانک اپنے وطن کا خیال آیا تھا جیسے۔

اور پھر بعد میں وہ اُس کے منگیتر اور اُس کے خاندان ہی کا ذکر کیا کرتیں۔ وہی سب کچھ تھے جیسے اب۔ اُس نے بھی زیادہ پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی کہ ___

اُسے یہ کیا معلوم تھا کہ اپنے وطن آ کر اُس پر یہ اُفتاد آ پڑے گی۔

اور یہ کہ اُسے ممی سے کئی پتے کئی ٹھکانے معلوم کر لینے چاہئے تھے تا کہ اِس وقت کام آ سکتے۔

رو رو کر اُس کا برا حال ہو رہا تھا۔ وہ دروازہ بند کر کے بستر پر پڑ رہی تھی۔ پھر شاید غنودگی نے آ لیا تھا۔

آنکھ کھلی تو دیکھا۔ شام اُتر آئی تھی، کمرے میں ہلکا سا اندھیرا پھیل رہا تھا، سردی

بھی گھر آئی تھی۔

وہ اُٹھ بیٹھی، باتھ روم گئی، منہ ہاتھ دھوئے۔

کمرے میں آ کر بتی روشن کی، ہیٹر جلایا— کچھ ڈھارس سی ہوئی، چائے منگوائی۔

اور— گھونٹ گھونٹ کر کے پیتے ہوئے اُس نے فیصلہ کر لیا۔

وہ واپس افریقہ جائے گی۔ کہ اِس ملک میں وہ کسی کو نہیں جانتی تھی، کہ اِس ملک میں زار نے اُسے ٹکنے نہیں دینا تھا، کہ اِس ملک میں وہ ڈر ڈر کر خوفزدہ ہو ہو کر نہیں جی سکتی تھی!

اور— کسی نتیجے پر پہنچ کر وہ ہلکا محسوس کرنے لگی۔

یکدم ہی اُسے افریقہ اپنا اپنا سا لگا۔ جہاں وہ پیدا ہوئی تھی، جہاں اُس نے والدین کی شفقت دیکھی تھی، جہاں کی وہ شہری بھی تھی۔

اُسے اچانک بھوک لگی۔ صبح سے اب تک سوائے ایک کوفی اور ایک چوکلیٹ کے اُس نے کچھ نہیں لیا تھا۔ بھوک ہی مٹ گئی تھی جیسے۔

اُٹھ کر اُس نے رات کے کھانے کا آرڈر دیا اور کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔

نیچے شام کی رونق تھی، روشنیاں تھیں، ہماہمی تھی۔

دنوں بعد وہ ہلکی پھلکی سی ایک نئے زاویے سے اِس ملک کو دیکھ رہی تھی۔ آج پہلی بار اُسے خیال آیا یہاں کی عمارتیں، یہاں کی ٹریفک، یہاں کے لوگ وہاں سے مختلف تھے!

اچھا اچھا سا لگ رہا تھا اُسے سب۔ نیا نیا سا، جیسے وہ ابھی ابھی جہاز سے اُتری یہ سب دیکھ رہی تھی!

وہ ضرور واپس جائے گی۔ اپنا سکون واپس لوٹتے دیکھ کر اُس نے ایک بار اور اپنے فیصلے پر تصدیق کی مہر ثبت کر دی۔

واپسی کا ٹکٹ خرید کر وہ پلٹی تو دیکھا۔

وہی ڈرائیور وہیں ایئر لائین کے آفس میں اُس سے دو قدم پر کھڑا کسی سے بات کر رہا تھا!

وہ تو سائے کی طرح لگا تھا اُس کے پیچھے۔ مگر— وہ تلخی سے مسکرا دی۔

اب اُسے کوئی خوف نہیں تھا۔ اب وہ اُس کی حدود سے باہر جا رہی تھی۔ اور یہی یقین کرنے وہ آفس کے اندر تک آ پہنچا تھا!

اُس کے بعد وہ دو چار دن اور وہاں رہی۔ ایک دو ضروری کاموں سے باہر بھی گئی۔ مگر ڈرائیور کی شکل دوبارہ نظر نہیں آئی۔ اُس کی واپسی کی اپنی پوری تسلی کر لینے کے بعد وہ چلتا بنا تھا شاید۔

زار کون تھا؟ اُس سے کیا بیر تھا؟ اُسے ملک سے نکال کر ہی کیوں دم لیا تھا؟

یہ سب ایک سربستہ راز تھا، معمہ تھا، پہیلی تھی جو ـــــ نہ چاہتے ہوئے بھی سارا وقت اُس کے ذہن میں منڈلاتی رہتی۔

گو کل اُس نے پرواز کر جانا تھا، بھول جانا چاہتی تھی وہ یہ سب، جھٹک دینا چاہتی تھی ذہن سے مگر ـــــ

جتنا وہ بھول جانے کی، جھٹک دینے کی کوشش کرتی، اتنا ہی یہ سوال ہتھوڑے بن کر ذہن پر برسنے لگتا۔

منہ ہاتھ دھو کر وہ باتھ روم سے باہر نکلی، دیکھا کمرے کا دروازہ ادھ کھلا تھا، بند کرنے لگی تو سامنے کوریڈور میں لگے رسالوں، اخباروں پر نظر پڑی۔ باہر نکل کر اُس نے آج کا اخبار اُٹھا لیا۔

بیرا شام کی چائے لایا تو ـــــ وہ گھونٹ گھونٹ کر کے پیتی اخبار الٹ پلٹ کرنے لگی۔

'اسی سالہ دادا جان کو اپنی دیکھ بھال کے لئے ایک پڑھی لکھی اور نیک سیرت لڑکی کی ضرورت ہے۔ جو انہیں روزانہ اخبار پڑھ کر سنائے اور اُن کی دیگر ضروریات کا خیال رکھے ...'

سرسری نظریں دوڑاتے دوڑاتے اُس کی اِس دلچسپ سے اشتہار پر نظر پڑی۔

وہ خوبصورتی سے مسکرا دی۔

اَسی سالہ دادا جان ـــــ ایک بزرگ، مشفق صورت اُس کی نظروں میں گھوم گئی، جو خبریں سننے سے دلچسپی رکھتے تھے، اور جنہیں اپنی دیکھ بھال کے لئے ایک نیک سیرت لڑکی چاہیے تھی۔ جنہیں نیک سیرت کی تلاش تھی وہ یقیناً نیک دل انسان ہوں گے۔ اُسے یہ سب بہت اچھا سا لگا۔ نظریں نیچے ڈالیں۔ اور پھر وہ زور سے چونکی۔ یہ تو رضا احمد تھے، زار کے دادا!

پیالی واپس رکھتے ہوئے اُس نے ایک بار اور اشتہار پڑھا۔

اب کے اُس کی سوچ بالکل مختلف تھی۔ اُسے بوڑھے دادا سے کوئی اختلاف نہ

بات تو اُن کے پوتے زار کی تھی!

وہ دیکھ بھال کرنے والی لڑکی خود فائزہ بن جائے تو؟

لیکن وہ تو کل جا رہی تھی ٹکٹ خرید چکی تھی۔

وہ اُس گھر میں دیکھ بھال کرنے والی لڑکی بن جائے۔ قریب رہ کر وہ معلوم کر سکے وہ راز، وہ معمہ ـــــ جو اُس کے دل و دماغ میں کھلبلی مچائے تھے، ہلچل بپا کیئے تھے۔

ایسی کھلبلی، ایسی ہلچل ـــــ اُسے باہر کی دنیا کے ہنگاموں کا ہوش نہیں رہا تھا، اپنے آپ سے بیگانہ ہو رہی تھی۔

لیکن کل وہ جا جو رہی تھی۔ سیٹ بک کرا چکی تھی۔

پھر ـــــ اُس کی خوبصورت آنکھوں میں چمک سی آ گئی - بدلے کی، انتقام کی ـــــ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا راز معلوم کرنے کے ساتھ ساتھ وہ بدلہ لے! جگہ جگہ جاب مل جانے کے بعد بھی وہاں سے جواب دیئے جانے کا بدلہ! کسی بھی شہر میں نہ ٹک دینے کا بدلہ !! ملک تک سے چلتا کر دینے کا بدلہ!!!

کیا ٹکٹ کینسل نہیں کرایا جا سکتا تھا؟ واپسی کا فیصلہ بدلا نہیں جا سکتا تھا؟

وہ اُس گھر میں دیکھ بھال کرنے والی لڑکی بن کر جائے، اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کا راز معلوم کرے اور ـــــ اور ـــــ زار ہی کے گھر میں جاب کر کے اُس سے اپنی ہر جگہ سے نوکری سے جواب دلوانے کا بدلہ لے!

وہ واپس نہیں جائے گی اُس نے فیصلہ کر لیا۔

زار کے مخبر ڈرائیور کی نظر میں وہ کل کی فلائیٹ سے یہ ملک چھوڑ جانے والی تھی۔

اُس نے اب اُس کا مزید پیچھا کرنا چھوڑ دیا تھا۔

اگلی صبح فلائیٹ ہی کے وقت پر وہ ہوٹل سے ٹیکسی میں بیٹھی اور بجائے ایئرپورٹ کے سیدھی ریلوے سٹیشن پہنچ گئی۔

ٹکٹ خریدا اور ٹرین میں سوار ہو گئی۔

احتیاطاً اس نے چادر اچھی طرح اوڑھ لی تھی اور حتی الوسع اپنے آپ کو اپنے طریقوں کو بدل لیا تھا۔ کسی طرح وہ اُس گھر تک پہنچ جانا چاہتی تھی اور بس!

وہاں اُسے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ پیچھا کرتا تھا تو صرف یہی ڈرائیور۔

اور ___ بفرضِ محال ___ حالات اُس کے حق میں نہ بھی ہوئے تو اب کے اُس روبرو سب طے کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

آج سے پہلے وہ کمزور تھی مگر آج جانے کہاں سے فولاد کی سی طاقت آ گئی تھی

میں۔ وہ آنے والے کسی بھی خطرے کا سامنا کرنے کو تیار تھی!

وہ افریقہ چلی بھی جاتی تو بھی اِس 'کیوں' کی اذیت اپنے ساتھ لے کر جاتی۔ یہ ہر وقت کا خوف، پل پل کا دھڑکا، لمحے لمحے کی دہشت ذہن پر سوار رہتی۔

اعصاب پر ہر آن لامتناہی بوجھ تو وہ پہلے ہی محسوس کر رہی تھی، دماغ پر ہر دم گراں بار تو پہلے ہی سوار رہتا تھا ___ ذہنی مریضہ بن کر باقی کی زندگی کاٹنا اُس کے بس کا روگ نہیں تھا۔

اِس سے بہتر تھا وہ سامنا کر لیتی ___ نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو مقابلہ کر لیتی۔ آر یا پار کوئی فیصلہ کر لیتی!

اپنے اندر اچانک اتنی بڑی تبدیلی پر وہ خود بھی حیران تھی۔

اِس قدر حوصلے اور ہمت پر اُسے خود بھی حیرت ہو رہی تھی۔

سفر بخیر وخوبی کٹ گیا۔ ٹرین سے اُتر کر وہ باہر آئی۔ ٹیکسی ڈرائیور کو ایڈریس بتایا اور بیٹھ گئی۔

شام سیندوری ہو رہی تھی، خنکی بڑھ گئی تھی اور ہوا سرد ہو چلی تھی۔

آبادی سے پرے، پُرسکون ہریالیوں اور گھنے درختوں میں گھری، وسیع و عریض رقبے پر پھیلی سفید شاندار محل نما مرمریں کوٹھی میں ٹیکسی داخل ہوئی تو وہ چونکی۔

ایک پل کو دل۔ بے ترتیبی سے دھڑکا مگر ___ اگلے ہی لمحے وہ پُرعزم نظر آنے لگی۔

مخملیں لانز، نادر گلابوں کے تختوں، جا بجا اُونچے درختوں کو ڈھانپے نایاب بیلوں کے پاس سے گزرتی ٹیکسی بڑے سے کارپورٹ میں آ کر رُک گئی۔

اُس نے اپنا سوٹ کیس اُتروایا، ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا اور اپنا ہینڈ بیگ کندھے سے لٹکاتی باہر نکل آئی۔

تبھی ڈارک گرے سوٹ میں ملبوس ایک لگ بھگ چونتیس پینتیس سالہ آدمی آگے بڑھا۔

"میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتا ہوں؟" وہ مؤدب طریق سے بولا۔

اور ـــ فائزہ کو اندازہ ہو گیا۔ یہ خاص عہدے پر فائز ملازم تھا۔

اُس نے اخبار کی کٹنگ بیگ سے نکالتے ہوئے اُس کی طرف بڑھائی۔

ملازم نے عبارت پر نظریں دوڑائیں۔

"تشریف لائیے پلیز"!

مین دروازہ کھول کر وہ اُس کے لئے تھامے کھڑا رہا۔

وہ اندر داخل ہوئی۔

"آئیے۔" وہ اُس کی رہنمائی کرنے لگا۔

وہ بیش قیمت سامان اور نوادرات سے آراستہ بہت بڑے ہال میں سے گزر رہی تھی۔

ایرانی قالین بہت گداز تھے، پکاسو اور لیونارڈو ڈی ونشی کی نایاب پینٹنگز مکینوں کے ذوق کا پتہ دے رہی تھیں، مائیکل اینجلو کے لاکھوں کی مالیت کے نادر مجسمے ذوق کے ساتھ شوق اور بے پناہ امارت کی نشاندہی کر رہے تھے۔ اور سفید منقش چھت سے جابجا لٹکتے فانوسوں کا سائز اور ساخت بتا رہے تھے خاص آرڈر پر کسی خاص ملک سے بنوائے گئے تھے۔

"آپ تشریف رکھئے۔" اُس نے خوبصورت کارپٹڈ سیڑھیوں کے قریب والے آرام دہ صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ "میں بڑے صاحب کو اطلاع کرتا ہوں۔"

ملازم ہال کے اختتامی دروازے سے پیچھے کی جانب نکل گیا۔

اور وہ لیدر کے نرم صوفے میں بیٹھ کر اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگی۔

اِس کوٹھی کا مالک یقیناً کروڑ پتی تھا مگر ـــ اُس کے پوتے کے لچھن! اُسے افسوس ہونے لگا۔

"آئیے۔" ملازم جلد ہی واپس آ گیا۔

وہ اُس کے ساتھ ساتھ ہال سے نکل کر پیچھے ایک کوریڈور میں آ گئی وہاں سے ایک چوڑے سے لاؤنج میں ـــ اور پھر اُسی ملازم کی رہنمائی میں ایک مخصوص کمرے پر!

"اندر تشریف لے جائیے پلیز"! اُس نے ایک بار پھر اُس کے لئے دروازہ تھاما۔

اور وہ ـــ آہستہ سے آگے بڑھ گئی۔

یہ بیڈروم بھی اعلیٰ اور جدید سامان سے آراستہ تھا۔ سامنے کے بڑے سے آتش دان میں لکڑیاں جل رہی تھیں، قیمتی بھاری پردے گرائے گئے تھے اور بتیوں کی دودھیا روشنی آنکھوں کو بھلی لگ رہی تھی۔

"آؤ بیٹی آؤ"۔ شفقت سے بھرپور ایک آواز آئی۔

اور اُس کی نظر آتش دان ہی کے قریب نرم و گداز صوفے میں دھنسے بیٹھے ایک پینسٹھ ستر سالہ سرخ و سفید صحت مند رنگت سفید داڑھی سفید مونچھوں مشفق مسکراتے چہرے والے شخص پر پڑی۔ وہ اُسے کیوٹ سے کرسمس فادر لگے!

یہی شاید رضا احمد تھے مگر ـــ

اُس کے خیال میں تو وہ بہت بوڑھے، ضعیف اور کمزور تھے ـــ جن کو دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔

بہرحال وہ آگے بڑھ آئی۔

'سلام' کیا۔ وہ کچھ اُن کی عمر اور کچھ آس پاس کے ماحول سے مرعوب سی تھی۔

"وعلیکم السلام۔ بیٹھو بچے"۔ بہت اپنائیت سے انہوں نے اپنے مقابل کے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

آہستگی سے بیٹھتے ہوئے اُس نے سر پر چادر درست کر لی۔ اُن کی عمر کا ادب ملحوظ خاطر تھا ـــ جیسے!

رضا صاحب نے ایک نظر اُسے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا۔ دھیرے سے مسکرائے۔

"کیا نام ہے تمہارا بیٹی"؟ انہوں نے شفقت سے دریافت کیا۔

"نی شے"۔ وہ دھیرے سے بولی۔ اُس نے پہچانے جانے کے خیال سے 'فائزہ' غلط بتایا اور پھر ممی اُسے ہمیشہ اسی نام سے تو پکارتی تھیں۔

"اچھا اچھا"۔ وہ اب بھی اُس کے جھکے سر، جھکی نظروں کو دیکھ رہے تھے۔ "کہاں سے آئی ہو بچے"؟ اُن کا لب ولہجہ مجسم شفقت تھا۔

"یہیں سے۔" کہ اور وہ کیا کہتی۔ وہ تو نہ اِس شہر سے واقف تھی نہ اُس سے جہاں سے وہ آج یہاں پہنچی تھی۔ اور پھر دوسرے شہر کا ذکر کر کے وہ اپنے پہچانے جانے کا رسک بھی لینا نہیں چاہتی تھی۔

"I See." چشمہ اُتار کر قریب کی چھوٹی میز سے رومال اُٹھا کر انہوں نے اُس کے شیشے صاف کیے، دوبارہ عینک پہنی۔

ایک نظر پھر نی شے کو دیکھا۔ پھر ـــ چشمہ قدرے نیچا کر کے ـــ بغور اُس کا ایک بار اور جائزہ لیا۔ اُن کی بڑی بڑی گرے ایش آنکھوں میں ایک فاتحانہ سی چمک تھی۔ ہونٹوں پر فخریہ سی مسکراہٹ!

نی شے کچھ ان ایزی سا محسوس کرنے لگی۔

چشمہ اُتار کر انہوں نے میز پر رکھ لیا۔

"بیٹی تم ہمیں پسند آ گئی ہو۔ اب بتاؤ تمہیں ہم اچھے لگے یا نہیں؟"

پتہ نہیں کیوں؟ انہیں دیکھتے ہی وہ اُسے اچھے لگنے لگے تھے۔ پھر اُن کی صاف گو[ئی] تو اُسے اور اچھی لگی تھی مگر وہ کہہ نہیں پا رہی تھی۔ دھیرے سے مسکرا دی۔

"دیکھو نا ـــ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ ہم اپنے پوتے کو بھی یہی کہتے ہیں جان چھڑکتا ہے ہم پر ـــ مگر تمہیں بتائیں"۔ وہ قدرے رازداری سے کہنے لگے

"دراصل ہم جان دیتے ہیں اُس پر ـــ جان دادا کہتے ہیں ہم اُس کو۔"

کتنی محبت تھی اُن کے دل میں اپنے پوتے کے لئے۔ کیا اُس کے کرتوت [وہ] جانتے تھے؟ اُس نے دل ہی دل میں سوچا۔

"اور ہاں سب سے پہلے تو ہم اِس بات کی وضاحت کر دیں..."

وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

"ہم سچ مچ اَسی سال کے نہیں ہیں۔" اُن کی مسکراہٹ میں معصومیت تھی۔ "[illegible] سال کم ہیں۔ بخدا ہمارا تمہیں دھوکہ دینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مگر بیٹی ـــ یہ سو[چا]

کہ اِس سے کم لکھیں گے تو شاید کوئی لڑکی آنا پسند نہ کرے... اور ہمیں تھی ضرورت..."

اُن کے لب ولہجے پر وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

کتنی معصومیت تھی اُن کی باتوں میں۔ کتنا خلوص تھا اُن کے انداز میں!

"جی... میں آپ کو روزانہ اخبار پڑھ کر سناؤں گی۔ آپ کی ضروریات کا خیال رکھوں گی..."

"ہاں یہ سب تو ہوتا رہے گا"۔ وہ جلدی سے بولے۔ "دراصل گھر میں لڑکی نہیں ہے نا تو یہ سونا سونا لگتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں یہاں کوئی لڑکی ہو، اور اچھی لڑکی ہو۔ نیک سیرت، حیادار، جس کی موجودگی میں گھر جنت بن جائے..."

ایک بار پھر وہ دھیرے دھیرے مسکراتے اُس کے بے داغ حسن اور ایک بزرگ کی موجودگی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اُس کے ادب وحیا سے سمٹے سمٹائے وجود کو دیکھ رہے تھے۔

اور وہ سادگی سے مسکرا دی۔

گھر میں شاید واقعی کوئی عورت نہیں تھی۔ اُن کی باتوں سے حسرت اور آرزوئیں جھلک رہی تھیں۔

"تم اب یہاں آ گئی ہو ـــ اسے اپنا گھر سمجھو ـــ اور ہاں ہمارا پوتا زار ہمیں دادا جان کہتا ہے، تم بھی دادا جان کہو۔"

"جی اچھا۔"

تبھی بیرا چائے لے آیا۔ ساتھ ہی ہنٹر بیف اور بادام کا کیک بھی۔

"تم جاؤ۔ ہماری بیٹی خود چائے بنائے گی"۔ وہ جیسے فخریہ سے انداز میں بولے۔

گزرتے لمحوں کے ساتھ وہ نی شے کو اچھے سے اچھا لگنے لگے تھے۔

"شکر؟" اُس نے ادب سے پوچھا۔

"تین"۔

"جی؟" اُسے لگا اُسے سننے میں غلطی ہوئی تھی۔

''تین۔'' انہوں نے انگلیوں سے بتایا ''مگر زار سے ذکر نہ کرنا۔ کہتا ہے ڈاکٹر نے منع کیا ہے''۔ وہ رازداری سے بولے۔

اور ـــ وہ اپنی ہنسی بمشکل روک پائی۔

''اِس بار دنوں بعد شکار پر گیا ہے''۔ چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے وہ پھر کہنے لگے۔ ''پریشان تھا کچھ عرصے سے۔ خاصا اُلجھا ہوا لگ رہا تھا۔ کچھ بتاتا بھی نہیں تھا۔ مگر پھر اچانک دو چار روز قبل جیسے پریشانی ختم ہوگئی ہو، بڑے خوشگوار موڈ میں تھا۔ شکار کا پروگرام بنایا تو ہم سمجھ گئے۔ خوش بھی ہے اور فارغ بھی۔''

فی شے چپ سی ہوگئی۔ پھر ایک تلخ مسکراہٹ ہونٹوں پر اُبھر آئی۔

اپنے تئیں اُسے ملک سے نکال باہر کرنے پر وہ خوش تھا!

وہ خاموشی سے چائے پینے لگی۔

داداجان اب بھی محبت بھری باتیں پرخلوص انداز میں کررہے تھے۔

اُس نے زار کا خیال ذہن سے جھٹکا۔ وہ جیسا بھی تھا داداجان کا تو اِس میں کوئی دوش نہیں تھا۔

''اور چائے داداجان؟'' اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا، خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

''نو تھینک یو''۔

پھر انہوں نے اپنے قریب رکھے انٹرکوم پر کسی اعجاز کو بلایا۔

وہی کچھ دیر قبل والا سوٹ میں ملبوس شاید داداجان کا خاص ملازم دروازے میں نمودار ہوا۔

''بی بی کو ان کا سویٹ دکھادو۔ اسلم کو کہو ان کا سامان لگائے اور اِن کا خیال رکھے''۔

''اوکے سر''۔ وہ مؤدب طور سے بولا۔

''اچھا بیٹا۔ اب تم جاؤ آرام کرو۔ رات ڈنر تمہارا ہمارے ساتھ ہوگا۔''

''جی''۔ قریب رکھا اپنا ہینڈ بیگ اُٹھاتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

اعجاز کی رہنمائی میں وہ ایک بار پھر لاؤنج کراس کر کے لمبے سے کوریڈور کو طے

کرتی آخری سرے والے دروازے سے باہر نکل آئی۔

اندھیرا چھا چکا تھا، سردی بھی خاصی ہوگئی تھی۔

یہ کوٹھی کا پچھلا حصہ تھا۔ یہاں عمدہ لان اور خوبصورت کیاریاں تھیں قدرے فاصلے پر دائیں جانب کچن اور سٹور وغیرہ تھے۔

لان کو عبور کرتی وہ سفید خوشبودار پھولوں والی خوبصورت بیل سے لدی جافری کے دروازے میں سے باہر نکل آئی۔

یہاں پاس ہی وہ سویٹ تھا جو اُس کے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔

یہاں بھی بتیاں جل رہی تھیں ـــ ہر چیز روشن تھی۔

اعجاز اُسے پہنچا کر واپس لوٹ گیا۔

وہ اندر داخل ہوئی۔ ڈرائینگ، ڈائین ساتھ ہی چھوٹا سا کچن اور سٹور تھا۔ ایک خوبصورت بیڈروم اور اٹیچڈ باتھ تھا۔ بیڈروم کا پچھلا دروازہ پیچھے ایک چھوٹے سے ٹیرس میں کھلتا تھا اور یہیں کچن کا بھی پچھلا دروازہ کھلتا تھا۔

ٹیرس کی دو سیڑھیاں چھوٹے سے لان میں اُترتی تھیں اور پھر ـــ اور تاحدِ نظر اونچے گھنے درخت ہی درخت تھے۔ سویٹ کی کوئی حد براری نہیں تھی۔ دن کو تو شاید بہت اچھا لگتا مگر اِس وقت اندھیرے میں بھیانک جنگل سا لگ رہا تھا۔ وہ جلدی سے اندر آگئی۔

کچھ عرصہ سے وہ گردش میں ہی تھی۔ ہر قسم کی جگہوں میں رہتی آرہی تھی۔ ہل سٹیشن پر قید میں، صادق چاچا کے گھر، ہوٹیل میں ـــ گو ہر جگہ اُسے خطرہ لگتا مگر ـــ کوئی نہ کوئی پاس یا نزدیک ضرور ہوتا ـــ بالکل اکیلی وہ اب تک نہ رہی تھی۔

سویٹ کارپٹڈ اور آرام دہ فرنیچر سے آراستہ تھا۔ اُس نے ضروری چیزیں الماری میں لگائیں۔ پھر تولیہ لے کر باتھ روم گئی۔ گرم پانی سے نہائی تو طبیعت بشاش ہوگئی۔

سی گرین گرم کپڑوں پر گرے سویٹر پہنا، گرے ہی لیدر کے شوز پہنے بمشکل اپنے لمبے گھنے بال سلجھائے، کپڑوں کے ہمرنگ دوپٹہ لیتے ہوئے اُس نے اپنی پسندیدہ کلون

کی سپرے کی۔ اور ایک طرف رکھے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اُس نے سر صوفے کی پشت سے ٹکا لیا۔

یہ جاب بھی عجیب سی جاب تھی۔ وہ کچھ اور سوچ کر آئی تھی۔ یہ لوگ کچھ اور سمجھ رہے تھے۔ دادا جان تھے کتنے سویٹ کتنے کیوٹ! اُسے اُن کی دیکھ بھال کرنے میں یقیناً خوشی ہوگی۔

رہ گئی زار کی بات! تو ——

وہ تو اپنی جگہ تھی!

معاً دروازے پر دستک ہوئی۔

''یس''۔ وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

''بی بی آپ کو بڑے صاحب نے یاد فرمایا ہے''۔ یہ اسلم تھا جسے دادا جان نے اُس کے کام پر مامور کیا تھا۔

''اچھا... آتی ہوں''۔

نم بالوں کے نیچے سے تولیہ نکال کر اُس نے ایک طرف پھیلایا۔ گھڑی دیکھی ساڑھے سات بج چکے تھے۔ آج کے ڈنر پر وہ دادا جان کے پاس انوائیٹڈ تھی۔

بھیگے بال جھٹکتے ہوئے اُس نے ایک بار پھر اُن پر جلدی جلدی برش پھیرا اور —— نپے تلے قدم اُٹھاتی وہ اُن کی طرف چلی آئی۔

دروازے پر دستک دی۔

''یس —— کم اِن''۔

اور وہ آہستہ قدم چلتی وہیں آتش دان کے پاس اُن کے قریب آ گئی۔

دادا جان کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھے۔ اُسے دیکھ کر کتاب بند کرتے ہوئے اپنے سامنے کی میز پر رکھ دی۔

''بیٹھو بیٹی''۔ چشمہ نیچے کر کے حسب سابق اُسے ایک لمحے کو غور سے دیکھتے ہوئے وہ شفقت سے بولے۔

وہ کبھی کبھی اُسے عجیب سی نظروں سے دیکھتے۔ جن میں پسندیدگی ہوتی تو صیف

ہوتی، اور خود اُن کو انوکھی سی خوشی۔

وہ کچھ سمجھ نہ پائی مگر —— اُن کے اِس انداز میں معصومیت اپنے انتہا پر ہوتی جو اُسے بھی بہت اچھی لگتی۔

اب کے وہ اُن کے پہلو میں آتش دان کے بالکل قریب ایک نیچی سی نرم سیٹی پر بیٹھ گئی۔

''زار گھر پر نہیں ہوتا تو ہم رات کا کھانا جلدی کھا لیتے ہیں۔ اُس کی کوئی خبر نہیں کب آتا ہے۔ مگر اِس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہمیں اپنے پروگرام سے باخبر نہیں رکھتا۔ بلکہ ہم نے خود اُس کو کہا ہے کہ جس دن واپس آنا ہو بس آ جایا کرو۔ کب پہنچتے ہو کتنی دیر میں پہنچتے ہو یہ مت بتایا کرو کہ وہ دو سیکنڈ آگے پیچھے ہوتا ہے تو ہمارا دم آنکھوں میں آ جاتا ہے...''

کس قدر بے اندازہ پیار تھا انہیں اپنے پوتے سے۔ اُسے بھی کیا اتنی ہی پروا ہوگی اِن کی۔ اُسے یقین نہیں تھا!

معاً انٹر کوم بج اُٹھا۔

ہاتھ بڑھا کر دادا جان نے ریسیور اُٹھا لیا۔

''اچھا، پہنچ گیا''۔ اُن کے چہرے پر لازوال خوشیوں کا عکس اُبھر آیا۔

اور —— جانے کیوں؟ اُس کا دل بے اختیار دھڑکا۔ کہیں وہ اُسے پہچانتا تو نہیں تھا۔

پھر —— اعجاز اندر آیا۔

''مسٹر زار تشریف لے آئے ہیں''۔ اُس نے بھی اطلاع دی۔

''اچھا اچھا۔ شکر ہے پروردگار تیرا''۔ وہ جیسے اُسے دیکھنے کو بے کل سے نظر آنے لگے۔

اعجاز ایک طرف مؤدب طریق سے کھڑا ہو گیا۔

پھر دروازے پر دستک ہوئی، دروازہ کھلا۔ اور زار اندر داخل ہو گیا۔

دھول میں اَٹا، برجیز، لونگ شوز اور اوور کوٹ پہنے، انتیس تیس کے لگ بھگ، چھ

فٹ سے نکلتے قد کے ساتھ وہ ایک ڈیشنگ پرسنیلٹی کا مالک تھا۔

اِردگرد سے بے نیاز وہ سیدھا دادا جان کی طرف بڑھا۔

وہ وہیں صوفے پر دونوں بازو وا کئے اُسے سینے سے لگانے کو بے قرار بیٹھے تھے۔

زار اُن کے سامنے گھٹنوں کے بل جھک گیا۔

انہوں نے اُس کا سر سینے سے لگایا۔ پھر اُس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

پھر وہ وہیں دوزانو بیٹھ گیا۔ باری باری دادا جان کے دونوں ہاتھ چومے عقیدت سے آنکھوں سے لگائے۔ اور سر وہیں اُن کی گود میں رکھ لیا۔

"جانِ دادا خیریت سے تو رہے نا"۔ وہ اُس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

"فرسٹ کلاس۔ میں ایک گھنٹہ پہلا آتا۔ لیکن ایک فرینڈ کو اُس کا گھر چھوڑنا پڑا۔ اِس لئے دیر ہوگیا..."

واہ! نازبرداریاں تو جو تھیں سو تھیں، اُردو سے بھی ناواقف تھے خیر سے۔

مگر ___ ایک بات تھی۔ اگر دادا کی وہ جان تھا تو اُس کا بھی دادا جان میں دم تھا۔ یہ اُسے ماننا پڑ رہا تھا۔

"جاؤ بچے۔ نہا دھو لو پھر آنا"۔ دادا جان بولے۔

اور نی شے کو اب احساس ہوا۔ دادا جان اُردو ٹھیک بولتے تھے۔ مگر لب ولہجہ اُن بھی پختونیت لئے تھا۔

"جی"۔ وہ سیدھا ہو کھڑا ہوا۔

"May ... I...?" اعجاز تھا۔ زار کے پیچھے اُس کا اوورکوٹ اُتارنے آ کھڑا ہوا تھا۔

"آپ کیسا ہے مسٹر اعجاز؟" آستین اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ خوش اخلاقی سے بولا۔

"ٹھیک ہوں سر۔ تھینک یو"۔

"مسٹر اعجاز ___ آپ پلیز جا کر معلوم کرے کہ ہمارا باتھ روم میں سب

ٹھیک ہے"۔

"اوکے سر"۔ اُس کا کوٹ لئے وہ چل دیا۔

"تم ___ نی شے سے نہیں ملے"۔ دادا جان نے اپنے دائیں نیچی سیٹی پر بیٹھی نی شے کی طرف اُس کی توجہ دلائی۔

نی شے؟ عجیب میوزیکل سا نسوانی نام!

چونک کر وہ دادا جان کے صوفے کے پہلو میں دیکھنے لگا۔

غیر متوقع گھر میں ایک جوان لڑکی کو دیکھ کر ___ وہ ایک پل کو حیران سا ہوا۔

اور ___ نی شے نے دل میں شکر کیا وہ اُسے نہیں پہچانتا تھا!

"گڈ ایوننگ"۔ وہ تعظیماً سر قدرے خم کرتے ہوئے شائستگی سے بولا۔

"ہیلو"۔ اُس نے دھیرے سے کہا۔

اور زار نے جانے کے لئے قدم بڑھائے۔

"یہ ہماری دیکھ بھال کے لئے آئی ہے"۔ دادا جان گویا ہوئے۔

"آپ کا دیکھ بھال؟" اُس کے بڑھتے قدم رُک گئے۔

کیا ملازموں کی پوری فوج کے باوجود بھی انہیں کسی کی دیکھ بھال کی ضرورت تھی؟

"ہم نے اخبار میں اشتہار دلوایا تھا..."

"جی"؟ وہ اور بھی زور سے چونکا۔

"ہاں"۔ یہاں بھی دادا جان چشمہ قدرے نیچے کر کے زار کو گھورتے ہوئے زیر لب مسکراتے ہوئے اُس سے گویا داد طلب کر رہے تھے۔

وہ کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے تھے مگر ___ یہ معرکہ ذرا زیادہ ہی دھماکہ خیز تھا۔

پُرکشش لبوں پر آئی مبہم سی مسکراہٹ پر وہ بڑی مشکل سے قابو پا رہا تھا۔

"اور دیکھا۔ کیسی بیٹی آئی ہے۔ ہماری چوائس کا تمہیں قائل ہونا پڑے گا"۔

اور ___ دادا جان کی اِس غیر متوقع بات پر ___

ایک موہوم سی مسکراہٹ پر ___ ایک بار پھر اُس نے قابو پا لیا۔

"دادا جان ہم نہائے جاکر"۔

"ہاں۔اور ڈنر پر جلدی آنا۔آج نئی شے بیٹی کا ڈنر ہمارے ساتھ ہے اور وہ تھکی ہوئی معلوم ہوتی ہے اُسے آرام کی ضرورت ہے"۔

"جی"۔وہ ادب سے بولا۔

اور ــــ باوقار انداز میں چلتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

کھانا لگ جانے کی اطلاع ملی تو دادا جان اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"آؤ بیٹی"۔

وہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

اُس کے گھٹنوں سے نکلتے نم اور گھنے بال آندھی سے زیادہ سیاہ تھے، ڈارک رنگ کے کپڑوں میں اُس کا حسن جیسے حوروں کا خواب تھا، حیا سے بوجھل جھالریں پلکیں جیسے فرشتوں کا تخیل تھیں اور اُس کے لباس میں مہکتی مدھر خوشبو ماحول کو خواب آور بنا رہی تھی۔

دادا جان کی عمر اور تقدس کے تقاضے سے اُن سے ایک قدم پیچھے آہستہ آہستہ اُن کے ساتھ چلتی ڈائننگ ہال میں داخل ہوئی۔

کشادہ ڈائننگ ہال میں اُسی تناسب سے بڑی سی میز اور کرسیاں لگی تھیں۔میز ایک سرے سے دوسرے تک انواع واقسام کے کھانوں سے لدا پڑا تھا۔جیسے وہ دو نہیں بیسیوں مہمان مدعو ہوں۔یہاں بھی گداز قالین تھے، آتش دان میں جلتی بڑی بڑی لکڑیاں تھیں اور آنکھوں کو چکا چوند کرنے والی روشنیاں!

باوردی بیرا دادا جان کے لئے سامنے کی کرسی پیچھے کھسکائے مؤدب کھڑا تھا۔وہ بیٹھ چکے تو اُس نے نئی شے کے لئے اُن کے دائیں طرف کی کرسی پیچھے کھسکائی۔

"شکریہ"۔وہ بھی بیٹھ گئی۔

اور اُسی لمحے زارا اندر داخل ہوا۔

سیاہ قیمتی ڈنر سوٹ میں ملبوس وہ پُروقار انداز میں میز کی طرف آرہا تھا۔

"سوری دادا جان، مجھ کو دیر ہو گیا"۔وہ دادا جان کے بائیں کرسی پر بیٹھتے ہو

معذرت خواہ لہجے میں بولا۔

نئی شے کی نظریں اُٹھیں۔

اُس کا سرخ وسفید دھوپ میں تپا تانبے کی طرح رنگ بتا رہا تھا اُسے آؤٹ ڈور سپورٹس سے دلچسپی تھی، اُس کے پُرکشش نقوش سے دانائی مترشح تھی، اُس کی گہرے بلو آنکھوں کی چمک سے ذہانت ٹپکتی تھی، اُس کے مضبوط جبڑے اُس کی استقامت کا پتہ دیتے تھے ــــ اُس کے انداز میں اختیار کی جھلک تھی اور شخصیت کی سحر کاری آس پاس کی فضا کو سحر انگیز بنا رہی تھی۔

نظریں نیچی کرتے ہوئے وہ اپنی خالی پلیٹ کو تکنے لگی۔

"شروع کرو بیٹی"۔دادا جان گویا ہوئے۔

اور ــــ وہ آہستہ آہستہ چمچ سے سوپ پینے لگی۔

اپنے بالکل سامنے بیٹھے اِس آدمی نے کچھ عرصہ قبل اُسے ایئرپورٹ سے اغواء کرایا تھا، قید میں رکھا تھا، پھر جگہ جگہ اُس کی بنی بنائی نوکری سے اُسے جواب دلوایا تھا، کسی بھی شہر میں اُسے ٹکنے نہیں دیا تھا۔یہاں تک کہ وہ اُس کے خیال میں ــــ واپس بیرون ملک چلی گئی تھی۔

کون یقین کرسکتا تھا اِس پر؟

اُس کی سمشنگ پرسنیلٹی، بردباری، انداز گفتگو ــــ کہیں بھی تو مجرمانہ رمق نہیں پائی جاتی تھی۔چہرہ شخصیت کا ہی تو آئینہ دار ہوتا ہے، اور چہرہ اور شخصیت انسانی کردار کی ہی تو ترجمانی کرتے ہیں۔

وہ اُلجھی اُلجھی سی اپنے سامنے رکھے سوپ پر نظریں جمائے تھی۔

"بیٹی یہ ہرن کا گوشت لو۔زارا شکار کرکے لایا ہے"۔دادا جان نے بھنے ہوئے ہرن کے گوشت کے ڈش کی طرف اشارہ کیا۔

وہ چونک کر اُس طرف دیکھنے لگی۔

مہارت سے بھنا ہوا اشتہا انگیز گوشت بڑی سی ڈش میں دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔

اس کے علاوہ چکن روسٹ تھا۔مرغ میں پکے چاول تھے، تکے تھے، سیخ کباب، تیتر، تلی

ہوئی مچھلی تھی اور کئی قسم کی سلاد تھی۔

وہ چھری سے گوشت کے موٹے سے ٹکڑے میں سے پیس کاٹنے لگی مگر۔۔۔ کام جیسے ذرا مشکل تھا۔

''کھانے کے وقت بھی کوئی آس پاس منڈلاتا رہے ہمیں اچھا نہیں لگتا۔ یہی تو وقت ہوتا ہے ہم اور زار اپنی باتیں کرتے ہیں۔ اس لئے ہم نے بیرے کو کھانا سرو کرنے سے منع کیا ہے۔'' دادا جان اُس کی تگ و دو دیکھ کر کہنے لگے۔

زار کی بھی نظریں اُٹھ گئیں۔ وہ اِس کام کے لئے خاصی نازک تھی اُس کے انداز سے ہی لگ رہا تھا۔

ایک مبہم سی مسکراہٹ ہونٹوں پر آنے سے پہلے ہی اُس نے دبالی۔

''تم پورا پیس لے لو بیٹی''۔ دادا جان شفقت سے بولے۔

''میں... پورا نہیں کھا سکوں گی''۔ وہ کچھ بے بسی سے بولی، اور چھری آہستہ سے واپس رکھ دی۔

زار چونکا۔۔۔ اپنے سراپے کی نزاکت کی طرح اُس کا لب و لہجہ بھی بہت نرم بہت ملائم تھا۔

دبی ہوئی مبہم مسکراہٹ نمودار ہو ہی گئی۔

ہاتھ آگے بڑھا کر اُس نے اُسی چھری سے لمحوں میں پیس کے ٹکڑے کر لئے۔

''تھینک یو''۔ نی شے نے ایک چھوٹا سا پیس اپنی پلیٹ میں لیتے ہوئے کہا۔

تھوڑے سے چاول لے کر۔۔۔ وہ آہستہ آہستہ کھانے لگی۔

دادا جان زار سے باتیں کر رہے تھے۔ شکار سے متعلق، اُس کے چند روز اِسی سلسلے میں باہر رہنے کے متعلق، اُس کے وہاں رہنے کے بندوبست اور آرام کے متعلق، اُس کی صحت کے متعلق۔

زار بہت مؤدب طریق سے۔۔۔ گو بہت دوستانہ انداز میں۔۔۔ کبھی خالص پشتو، کبھی انگریزی، اور کبھی اُردو میں۔۔۔ اُن کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔

اُس کی باتوں کا انداز بہت دھیما، بہت شائستہ، بہت دلکش تھا۔

اردو کے لفظ بمشکل جوڑتا، معصومیت سے ادا کرتا اُس کا انداز بہت۔۔۔ یونیک تھا!

مختلف سوچوں کے درمیان اُس نے کھانا ختم کر لیا۔ چھری اور کانٹا پلیٹ میں سیدھے رکھ دیئے۔

''بس''۔ دادا جان چونک کر اُس کی خالی پلیٹ کو دیکھنے لگے۔ اُن کے خیال میں اُسنے بہت کم کھایا تھا۔

ایک لمحے کو زار نے بھی اُس طرف دیکھا۔

''وہ... میں نے چائے بھی پی تھی''۔ وہ دونوں کی توجہ سے کچھ سٹپٹا سی گئی تھی۔

''تب بھی تم نے صرف چائے پی تھی''۔ دادا جان بولے۔ ''کچھ کھایا نہیں تھا''۔

بہانہ پکڑے جانے پر لمبی خمیدہ سیاہ پلکیں جھپکاتی وہ خاموش رہی۔

ایک بار پھر۔۔۔ ایک غیر محسوس سی مسکراہٹ زار کے لبوں کو چھوگئی۔

''خوب کھایا پیا کرو بیٹی''۔ دادا جان اپنائیت سے اُسے دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔

''اِسی لئے تو دھان پان سی ہو''۔

وہی غیر محسوس مسکراہٹ اب بھی زار کے لبوں پر چھائی تھی۔

پھر۔۔۔ بیرا آیا۔۔۔ اور انہیں سویٹ ڈش سرو کرنے لگا۔

تین مختلف قسم کے سویٹ ڈش تھے۔ ایک کے بعد ایک اور۔۔۔ دادا جان کی اُس پر نظر بھی!

وہ پریشان سی ہوگئی۔ اتنا تو وہ واقعی نہیں کھا سکتی تھی۔

ایک میں سے تھوڑا سا لے کر اُس نے دوسرے میں سے بھی لیا اور پھر تھوڑی دیر بعد بیرا تیسری ڈش اُس کے سامنے لا کھڑا ہوا تو۔۔۔ دادا جان کی نظر بچا کر اُس نے چپکے سے سر انکار میں ہلا دیا۔

نگاہ زار پر پڑی۔ اُس کی نظریں اُسی سمت اُٹھی تھیں۔ پھر اُس نے توجہ اپنے پیالے پر مبذول کر لی تھی مگر۔۔۔

پرکشش لب اب بھی دھیمے سے متبسم تھے، دلنشیں آنکھوں میں روشن سی دمک تھی۔

خفیف سی ہو کر اُس نے نظریں جھکا لیں۔

بیرا دادا جان کی پیالی میں سبز چائے ڈال رہا تھا۔

''قہوہ میڈم؟'' وہ اُس کے قریب آ گیا۔

''نو تھینک یو''۔ یہاں اُس نے صاف انکار کر دیا۔

بیرا زار کی طرف بڑھا۔

''مارک اور سٹنگر نے کھانا کھالیا؟'' اُسے حسبِ عادت اپنے شکاری کتوں کی فکر تھی۔

''سر''۔

''ظفر کو کہو اُن لوگوں کا خیال رکھے، تھک گیا ہے دونوں''۔

''اپنے سے زیادہ اِس کو اپنے کتوں کا خیال رہتا ہے''۔ دادا جان بولے۔

وہ مسکرا دیا۔ اُس کی مسکراہٹ بہت دلآویز تھی۔

''ٹائیگر تھا نا پیچھے۔ جب میں جا رہا تھا اُس کا آنکھ بہت سرخ تھا۔ ظفر کو بولا بھی کہ دوائی ڈالے مگر اب دیکھا تو آنکھ اُسی طرح سرخ تھا۔ سستی کرتا ہے ظفر''۔ تشویش سے کہہ رہا تھا۔

اور نی شے نے آئی مسکراہٹ روک لی کہ اُسے تو بس یہی لگی تھی کہ کب یہ لوگ قہ ختم کریں اور کب وہ جائے اپنے کمرے میں۔

''بیٹی۔ رات کو اکیلے میں ڈر تو نہیں لگے گا''۔ دادا جان قہوے کا گھونٹ بھر۔ ہوئے اچانک بولے۔

سویٹ کے پچھلی طرف سائیں سائیں کرتا گھنے درختوں کا جنگل سا اُس کے ذ میں تو تھا مگر ــــ

''ن... نہیں''۔ اُس نے فوراً کہا کہ ــــ

اُسے یقین تھا اُس نے ''ہاں'' کہا تو زار اپنی مخصوص مبہم مسکراہٹ میں اُس لڑکی 'ہونے پر اُس کا مذاق اُڑائے گا۔

مگر ــــ اِس کے باوجود ــــ اپنی مدھر مسکان چھپانے اُس نے قہوے کی ہونٹوں سے لگالی۔

اُس کے 'نہیں' کہنے کے باوجود وہ اُس کی اندر کی کیفیت سمجھ گیا تھا۔ وہ سٹپٹا کر پلکیں جھپکاتی رہ گئی۔

''اعظم''۔ دادا جان نے بیرے کو اور مخاطب کیا۔

''جی صاحب''۔

''بی بی کو اپنے سویٹ تک چھوڑ آؤ۔ اسلم سے کہو وہیں سویا کرے تاکہ بی بی اکیلی نہ ہو''۔ وہ بھی شاید اُس کا ردِعمل بھانپ گئے تھے۔

''بہتر صاحب''۔

کرسی سے اُٹھتے ہوئے جانے کیسے؟ نیچے قالین تک لٹکے اُس کے بال کرسی کی ٹانگوں میں اُلجھ گئے اور ــــ اُسے کھچ کر واپس آنا پڑا۔

جیسے گھبرا کر اُس نے سب سے پہلے زار کی طرف دیکھا۔

سنبھال سنبھال کر رکھی مسکراہٹ مکمل کر ہونٹوں پر آ رہی تھی۔ گو نظریں اب بھی اپنی پیالی پر جمائے وہ بے نیازی سے قہوہ پی رہا تھا۔

وہ جلدی سے جھکتے ہوئے اپنے بال کرسی کی ٹانگوں میں سے چھڑانے لگی۔ شومئی قسمت جتنی وہ جلدی کر رہی تھی اُتنی ہی سلجھنے میں دیر ہو رہی تھی۔

بہرحال ــــ کچھ دیر کی تگ و دو کے بعد اُس نے بال چھڑا ہی لئے۔

''گڈ نائیٹ'' بالوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر پیچھے کرتے ہوئے اُس نے اِدھر اُدھر دیکھے بغیر ہی کہا اور ــــ اعظم کے ساتھ چلتی ڈائننگ ہال سے باہر آ گئی۔

آج اُس کی آنکھ جلدی کھل گئی تھی۔ اُٹھ کر اُس نے منہ ہاتھ دھوئے، رات کے
کپڑے بدلے۔ گرے اور مسٹرڈ چیک کی کف کالر والی قمیض شلوار پہنی، گرے لید
کے شوز پہنے اور گرے ہی سمارٹ سی جیکٹ پہن کر سر پر خوبصورت کیپ لیتی وہ پچھ
دروازہ کھول کر باہر ٹیریس میں آ گئی۔

کچن میں برتنوں کی کھنک اور کٹلری کے شور سے اندازہ ہو رہا تھا اسلم جاگ کر کا
میں لگ چکا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی کچن کے دروازے میں سے نمودار ہوا۔

’’بی بی آپ کے لئے بیڈ ٹی؟‘‘ اُس نے مؤدب طریق سے پوچھا۔

’’نہیں شکریہ، صرف ناشتہ بنا دو‘‘۔

’’جی بہتر‘‘۔ وہ واپس مڑا۔

اور نئی شے سامنے دیکھنے لگی۔

صبح کی سپیدی نمودار ہو رہی تھی۔ سامنے کا جنگل، اِس میں پھیلی تا حدِ نظر ہریالی، سب روشن ہو رہے تھے اور۔۔۔ وہیں سے آتی اَن گنت چڑیوں کی چہکار کانوں کو بہت بھلی لگ رہی تھی۔

اُسے یہ سب بہت اچھا لگا۔ منجمد کر دینے والی سردی میں وہ اُسی طرف بڑھنے لگی۔

جگہ جگہ خشک گھاس تھی، درختوں سے گرے سوکھے پتے تھے خودرو جھاڑیاں تھیں اور۔۔۔ درختوں کے پتوں اور جھاڑیوں میں سرسراتی یخ بستہ ہوا تھی۔

سوچوں میں گم وہ چلتی گئی۔

معاً۔۔۔ کسی زبردست کتے کے غرانے پر وہ چونکی۔ گھبرا کر اُس سمت دیکھا۔

تھوڑے فاصلے پر، مخالف سمت سے، اوورکوٹ کے کالر چڑھائے ایک جسیم ایشین کتے کی زنجیر پکڑے زار شاید صبح کی واک سے واپس آ رہا تھا۔ بھاری بھرکم کتا نئی شے کو اجنبی سمجھ کر رک گیا تھا، غرانے لگا تھا۔

سہم کر وہ قریبی درخت کا تنا پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔

’’نو ٹائیگر‘‘۔ زار اُسی کی طرف بڑھنے لگا۔

تو یہ ٹائیگر تھا!

اُس کے غرانے کی آواز قدرے مدھم ہوئی۔ نئی شے کو گھورتے ہوئے وہ اپنے مالک کے ساتھ اُس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

خوفزدہ سی ہو کر وہ درخت کی آڑ میں ہونے لگی۔

اور وہی۔۔۔ رات ڈنر والی مخصوص موہوم سی مسکراہٹ اُس کے پُرکشش ہونٹوں پر اُبھر آئی۔

’’گڈ مورننگ‘‘۔ وہ دھیرے سے بولا۔

’’ہیلو‘‘۔ ٹائیگر کو دیکھتے دیکھتے وہ بمشکل بولی۔

اُس کی شربتی آنکھیں پھیل سی گئی تھیں، گلابی رنگ اُڑ سا گیا تھا۔ ٹائیگر اب بھی غرا رہا تھا۔ گو آہستہ آہستہ، وقفے وقفے سے۔

''سٹاپ اِٹ ٹائیگر''۔ اُس کی آواز میں اپنے چہیتے کتے کے لئے تنبیہ تھی۔

ٹائیگر چپ ہو گیا۔ محبت سے زار کو دیکھتے ہوئے دم ہلانے لگا۔

''رات آپ ٹھیک سے تو سویا نا''۔ جھک کر اپنے کتے کی پیٹھ پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اُس نے نی شے سے پوچھا۔

''جی''۔ وہ ہولے سے بولی۔

''آپ شاید واک کرنے نکلا ہے''۔ وہ سیدھا ہو کھڑا ہوا۔

''جی''۔

ہوا کا سرد ریلا آیا اور اُسے کپکپا کر گزر گیا۔

''یہاں بہت سردی ہے۔ ہوا بھی چل رہا ہے''۔

زار نے دیکھا سردی کی شدت سے اُس کے چہرے کا رنگ سرخ اور درخت تھا۔ اُس کے ہاتھوں کے ناخن نیلے ہو رہے تھے۔

وہ حد سے زیادہ ہی نازک تھی۔ مخصوص مبہم تبسم اِس وقت پھر اُس کے لبوں کو چھو گیا۔

''You better go back کمرے میں ہیٹر تو جل رہا ہے نا''۔

''ابھی نہیں۔ میں سیدھی باہر آ گئی تھی''۔

اُس کی آواز کتنی نازک، لہجہ کتنا ملائم اور انداز کتنی آہستگی لیے تھا۔

اتنی سی بات کرتے ہوئے اُسے لمحے گزر گئے۔ وہ تو جیسے اپنی باتوں کا بوجھ بھی نہیں اُٹھا سکتی تھی۔ اِس سے قبل اُس نے کسی کو اِس انداز میں بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔۔۔ اُس کا سٹائل بڑا انوکھا تھا۔

جیسے دور کہیں پریوں کے دیس میں گھنٹیاں بج اُٹھی ہوں، جیسے پروں کے وہ نازک پنکھے جھلنے لگے ہوں، جیسے ٹھنڈا میٹھا جھرنا بہہ نکلا ہو!

اُسے دیکھتے دیکھتے وہ آہستگی سے مسکرا دیا۔

''چلیے۔۔۔ واپس چلتا ہے''۔ وہ نرمی سے بولا۔

اور۔۔۔ وہ بھی واپس مڑ گئی۔ کہ وہ واقعی ہوا کے یخ بستہ جھونکوں کا تاب

لا سکتی تھی۔

پسِ پردہ وہ جو کچھ کرتا آیا تھا اُسے سامنے پا کر۔۔۔ اُس کی خوش اخلاقی، اُس کی ہمدردی دیکھ کر۔۔۔ وہ جیسے بے یقینی میں مبتلا ہونے لگی تھی، شک سا ہونے لگا تھا اُسے۔ کیا وہ واقعی اتنی گری ہوئی حرکت کر سکتا تھا؟ اتنی کمینگی؟ اُس کا یقین ڈانواں ڈول ہونے لگا۔ لیکن۔۔۔ کیا تو تھا! پر کیوں؟

تجسس اور بھی بڑھ گیا۔۔۔ کیوں؟

اُس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ اور۔۔۔ اُس نے گہری سانس لی۔

اِس 'کیوں' کے لئے شاید ابھی وقت درکار تھا۔ خیال جھٹکتے ہوئے وہ ناشتے میں مصروف ہو گئی۔

دس بج چکے تھے۔ اُسے ابھی تک دادا جان کی طرف سے کوئی بلاوا نہیں آیا تھا۔ ابھی تک اُسے صحیح معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ اُس کی جاب میں کیا کیا کام شامل تھا۔ کیا وہ خود جا کر معلوم کرے؟

یہ سوچتے ہی اُس نے ہاتھ میں پکڑا ناول بند کیا۔ اور بیڈ روم سے نکلتے ہوئے کوٹھی کی طرف چل دی۔

سفید پھولوں سے لدے دروازے میں سے گزرتی وہ اندر کی طرف بڑھی۔ دیکھا وہیں پچھلے لان میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھے دادا جان اخبار پڑھ رہے تھے۔ ساتھ ہی وہیں کھڑے ایک معمر ملازم سے گاہے گاہے باتیں بھی کیے جا رہے تھے۔

''آؤ بیٹی آؤ''۔ انہوں نے اخبار تہہ کرتے ہوئے درمیان کی میز پر رکھ دیا۔

''بیٹھو''۔ انہوں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''بہو رات کیسی گزری؟ ٹھیک سے نیند تو آئی نا''۔ وہ شفقت سے بولے۔

''جی دادا جان۔ شکریہ''۔ وہ اُن کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی۔

''ناشتہ کر لیا؟''

"جی صبح ہی کرلیا تھا"۔

"جلدی جاگ جاتی ہو ہمارا خیال ہے"۔

"جی۔ نماز کے لئے اُٹھ جاتی ہوں"۔

"بہت خوب"۔ اُس کی نماز کی عادت انہیں اچھی لگی۔ "ہم بھی بہت سویرے اُٹھتے ہیں۔ خوب رہے گی پھر تو۔ زار کو بھی سویرے اُٹھنے کی عادت ہے ـــ پھر کام پر بھی جاتا ہے"۔ اپنی عینک اُتار کر وہ کپڑے سے اُس کے شیشے صاف کرنے لگے۔

"کرامت نی شے بیٹی کو ہم نے بلوایا ہے۔ یہیں رہے گی اب"۔ اب کے وہ بوڑھے ملازم سے مخاطب ہوئے۔ خاص ملازموں میں سے تھا شاید، دادا جان نے اُسے بالکل دوستوں کی طرح بتایا۔ "اور بیٹی یہ کرامت ہے۔ بچپن میں ہم دونوں ساتھ کھیلے ہیں۔ تب سے یہ ہمارے ساتھ ہے، ایک بار البتہ"۔ وہ خوبصورتی سے ہنسے۔ "ہم سے بگڑ کر بھگوڑا ہو گیا تھا بیچ میں کچھ عرصے کے لئے مگر ـــ واپس آ گیا۔ تب سے ہم نے اِس کی بھاگیں مضبوط پکڑ لیں ہیں۔ اب کہیں نہیں جاتا"۔

اور ـــ نی شے کو اِن تقریباً ہم عمر بزرگوں کی آپس میں گپ شپ بہت اچھی لگی۔

"کیوں شرمندہ کرتے ہیں صاحب نی شے بیٹی کے سامنے"۔

"یہ اپنی بیٹی ہے اِس سے کیا شرمندہ ہونا"۔ دادا جان بہت اپنائیت سے بولے۔

"وہ... دادا جان"۔ اُسے لگا اُسے خود ہی پوچھنا پڑے گا۔ انہیں بات ختم کرتے دیکھ کر اُس نے خود ہی بات شروع کی۔ "میں پوچھنے آئی تھی کہ ... مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

تبھی ـــ کرامت بابا وہاں سے چل دیئے۔

"کیا مطلب؟"

"میرا کام کیا ہوگا؟"

"اوہ ـــ کام کیا ہوگا۔ کام کے لئے تو بہتیرے لوگ موجود ہیں"۔ وہ شفقت سے مسکرائے۔

پھر اُسے کیوں بلایا تھا؟ وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

"تم ـــ ایسا کرو کہ ..." وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ "زار کا کمرہ دیکھ لیا کرو۔ اُس کی ہر چیز جگہ پر ہے یا نہیں"۔

"بس؟" وہ حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"چلو میرا بھی دیکھ لیا کرو"۔ وہ اُس کی حیرت دور کرنے کو آرام سے بولے۔

"اور؟"

"بس یہی بہت ہے۔ اور ہاں تمہیں ماہوار جتنی رقم چاہئے ہم سے چیک لے لیا کرو۔ اِس کے علاوہ تمہارے ڈریسز وغیرہ اور باقی جو بھی ضروریات ہوں، بل اعجاز کو دے دیا کرو وہ بندوبست کر دیا کرے گا"۔

وہ اور بھی اُلجھ گئی۔ اتنے سے کام کے لئے اُس کی جو مرضی چاہے اُن سے وصول کر لیا کرے؟

"اِس گھر کو اپنا سمجھو بیٹی۔ حساب کتاب غیروں میں ہوتے ہیں"۔ اُس کی اُلجھن بھانپ کر وہ مزید بولے۔

اور ـــ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی اِس عظیم انسان کا کن الفاظ میں شکریہ ادا کرے۔ جس نے اِس اجنبی جگہ اُس کی اپنے بچوں جیسی پذیرائی کی تھی اچانک ہی اُسے زبردست تحفظ کا احساس ہوا۔ اپنی قسمت پر خود آپ رشک آنے لگا۔

"زار کے کمرے کی دیکھ بھال بذاتِ خود ایک بڑا کام ہے"۔ وہ دھیرے دھیرے بتانے لگے۔ "وہ کبھی نوکروں سے مطمئن نہیں ہوا۔ بڑا نفاست پسند ہے۔ بچپن سے لے کر اب تک وہ سختی سے اپنے اصولوں پر کاربند ہے۔ دن کے کپڑے الگ، شام کے الگ اور رات کے الگ ہونے چاہئیں۔ اِسی طرح کھانے کے اوقات کا بھی وہ سختی سے پابند ہے۔ اور ـــ یہ بھی کہ اُس کا کوئی کام اُس کی مرضی کے خلاف نہیں ہونا چاہئے۔ کاروبار کے معاملے میں وہ بڑی جانفشانی سے کام کرتا ہے مگر شام اُس کی اپنی ہوتی ہے۔ کلب جاتا ہے، ٹینس کھیلتا ہے، سوئمنگ وغیرہ ہاں ..." وہ مسکرائے۔ "سارا مہینہ باقاعدگی سے آفس جائے گا مگر آخری چار دن اُس نے ہم سے مانگ رکھے ہیں۔ اِن میں وہ گھر سے باہر رہتا ہے۔ شکار پر جاتا ہے، فشنگ، رائیڈنگ،

سوئمنگ وغیرہ جو مرضی چاہے کرتا ہے۔تب ہم بھی پوچھ گچھ نہیں کرتے۔چھوٹا سا تھا کہ باپ ختم ہوگیا، پھر ماں۔تب سے ہی کسی آیا کسی نوکر کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ہم ہی تھے اُس کے سب کچھ۔اتنے بھاری کاروبار کے ساتھ ہم نے اُسے کلیجے سے لگا کر پالا ہے۔پھر دل پر پتھر رکھ کر بہتر مستقبل کی خاطر پڑھائی کے لئے باہر بھجوایا۔بزنس مینجمنٹ کا کورس کرکے چند سال قبل لوٹا تو___ خاصا سنجیدہ اور مدبر ہوگیا تھا۔کچھ عادتوں میں سختی ہے کچھ میں بہت ہی نرمی ہے۔دل کا بہت اچھا ہے۔جانِ دادا ہے...''

دادا جان اُسے اپنے آپ سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے اِس کا اُسے اِن چند گھنٹوں میں بخوبی اندازہ ہوگیا تھا اور___

وہ چاہتے تھے کہ نی شے بھی اُس کا، اُس کی آسائشوں کا خیال رکھے یہ بھی اُن کی اِس وقت کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا۔

اُسے کوشش کرنی ہوگی کہ ___ لگتا تھا دادا جان کی عین خواہش ہی یہی تھی

بہرحال___

''دادا جان آپ کو اخبار پڑھ کر سناؤں؟'' اُسے اُن کے اخبار میں ایڈ کی بات یاد آ گئی۔

''نہیں بیٹی۔ہم خود پڑھنے کے عادی ہیں''۔وہ جیسے اپنے اشتہار کی بات بھول بھال گئے تھے۔ہاتھ بڑھا کر اخبار دوبارہ اُٹھا لیا۔

''مگر آپ نے اپنے اشتہار میں تو یہی...''

''اوہ۔'' انہیں یاد آ گیا۔''چھوڑو اُسے۔تم بس زار کا خیال رکھو''۔

ایک بار پھر وہ اخبار پر نظریں جمائے تھے۔

اور___ نی شے کا خیال درست نکلا۔وہ یہاں اِسی لئے بلائی گئی تھی۔کسی بھی بہانے دادا جان کو اپنے پوتے کی دیکھ بھال کے لئے کسی نسوانی ہاتھ کی ضرورت تھی کہ اُن کے خیال میں شاید ایک عورت زیادہ صحیح دیکھ بھال کر سکتی تھی بہ نسبت گھر میں موجود بے شمار مردوں کے۔

وہ کچھ کنفیوزڈ سی بھی تھی کہ وہ یہ سب کر بھی پائے گی؟

وہ اپنے گھر میں بہت ناز و نعم میں پلی تھی۔خدا کا دیا سب کچھ تھا اور وہ ایک ہی ایک اولاد تھی اپنے والدین کی۔گرچہ کچھ عرصہ سے حالات نے پلٹا کھا لیا تھا۔گھر سے بے گھر ہوکر یکے بعد دیگرے کئی تکلیف دہ واقعات سے دوچار ہوئی تھی مگر___

تھی تو وہی___ دھان پان سی، جلدی سے تھک جانے والی، کسی کی غیر ضروری پرواہ نہ کرنے والی، دھونس میں نہ آنے والی!

زار لگتا تو اچھی عادتوں کا تھا___ وہ کوشش کرے گی اپنی ڈیوٹی نبھانے کی لیکن___ اگر اُس نے رعب جمانے کی کوشش کی جیسا کہ وہ بوس قسم کا لگتا تھا تو___ خیر وہ رعب میں تو نہیں آنے والی تھی کسی کی۔بہرحال___

یہ جاب اب اُس نے کرنی تھی۔کہ وہ جس مقصد سے یہاں آئی تھی، جو راز جاننے آئی تھی، وہ جان کر رہنا تھا اور___

اُسے یہ بھی تو دکھانا تھا کہ اِس ملک میں نہ سہی وہ اُس کے گھر میں تو جاب کر سکتی تھی___ خود اُسی کی دیکھ بھال!

ایک پل کو اُس کے خوبصورت ہونٹوں پر مسکراہٹ اُبھر آئی۔

ٹریٹ تو اُسے یوں کر رہا تھا۔جیسے وہ ہی اُس کی دیکھ بھال پر متعین ہو۔بڑا سا، ذمہ دار سا، افیکشنیٹ سا!

اُسے شاید معلوم نہیں تھا کہ دادا جان نے اخبار میں اشتہار اُسی کی دیکھ بھال کے لئے دلوایا تھا۔خیر___

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''اعجاز صاحب۔پلیز مجھے زار صاحب کا کمرہ دکھا دیں''۔اُس نے قریب آتے اعجاز سے کہا۔

''یس میڈم''۔

اور وہ اُسے ساتھ لئے چل دیا۔

کوریڈور طے کرتی وہ ہال میں داخل ہوئی اور پھر___ کئی نیچی چوڑی خوبصورت بل کھاتی کارپٹڈ سیڑھیاں چڑھتی اوپر گئی۔

بہت بڑے لاؤنج میں اعجاز اُسے زار کے بیڈروم کے پاس لے آیا۔

پھر۔۔۔ دروازہ کھول کر پٹ تھامتے ہوئے وہیں کھڑا ہوگیا۔

جانے کیوں نئی شے اُس کی موجودگی میں ان ایزی سا محسوس کرنے لگی۔ وہ اُسے کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے خوبصورت ماتھے پر شکن اُبھر آئی۔ اُسے اُس کی نظریں اچھی نہیں لگیں۔

''آپ جائیے میں دیکھ لوں گی''۔ اُس نے کہا اور اندر داخل ہوگئی۔

زار کا وسیع وعریض بیڈروم حیران کن حد تک خوبصورت تھا۔

ڈارک بلو قیمتی قالین جس کے کناروں پر سفید بیل اور درمیان میں گولائی میں سفید پھول تھے، یہاں سے وہاں تک بچھی ہوئی تھی۔ نیلے ہی بھاری ویلوٹ کے پردے ایک طرف ہٹا دیئے گئے تھے۔ بائیں جانب کمرے کا ایک تہائی حصہ دو نیچی سی سیڑھیوں کی اونچائی پر تھا جسے ایک خوبصورت محراب باقی کمرے سے الگ کرتی تھی۔ اِس تمام پورشن میں گولائی میں چھت سے لے کر نیچے تک محرابی کھڑکیاں تھیں، تمام کھڑکیوں کی درمیانی جگہ کٹ گلاس سے مزین تھی، اور یہ تمام بالکونی نما حصہ باہر کھلتا ایک خوبصورت ریلنگ پر ختم ہوتا تھا۔

اِسی ایک تہائی حصے میں درمیان میں ایک چھوٹی سی خوبصورت کوفی ٹیبل اور دو کرسیاں رکھی تھیں۔ اور ایک کونے میں بہت بڑا سا دیدہ زیب سنہری پتھروں والا منقش گلدان رکھا تھا۔

اُس نے دائیں طرف دیکھا۔ سامنے ہی اُس کا بے حد خوبصورت کشادہ بیڈ تھا۔ اُس پر بچھا بلو قیمتی ویلوٹین بیڈ کور تھا، بڑے بڑے بیڈ سائیڈ ٹیبل تھے اور۔۔۔ اُسی کونے میں خوبصورت پیڈسٹل پر رکھا عورت کا ایک بیش قیمت، بہت حسین، مگر نیم عریاں مجسمہ تھا۔ اکیلی ہوتے ہوئے بھی شپٹاتے ہوئے اُس نے نظریں دوسری طرف کر لیں۔

کھڑکی کے پاس ایک چوڑی رائیٹنگ ٹیبل اور کرسی لگی تھی، بیڈ کے بالکل سامنے ٹیلی ویژن اور وی سی آر تھا۔ دیوار پر نایاب پینٹنگ آویزاں تھی۔ تمام فرنیچر ٹیک وڈ کا تھا، ایک سرے سے لے کر دوسرے تک باقی تمام کوٹھی کی طرح یہاں بھی چھت سفید

اور منقش تھی، قیمتی کرسٹل کا بھاری دلفریب فانوس یہاں بھی لٹک رہا تھا۔

آگے بڑھ کر وہ بالکونی کی طرف گئی۔ کھڑکیاں صاف اور روشن تھیں۔ کوفی ٹیبل پر تازہ اخبار نفاست سے تہہ کیا رکھا تھا۔۔۔ دو سیڑھیاں اُتر کر چلتی ہوئی وہ بیڈ کے پاس آ گئی۔ بیڈ کور کا کونہ پلٹا، تکیوں کے کور تازہ بدلے سفید بے داغ تھے۔ نرم وگرم کمبل احتیاط سے تہہ کئے رکھے تھے۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھا ٹیلی فون سیٹ صاف تھا۔ نیچے شیلف میں ریڈرز ڈائجسٹ اور ٹائم کا نیا شمارہ ترتیب سے رکھا تھا۔ وہ رائیٹنگ ٹیبل پر آ گئی۔ کئی کاغذات، فائل، خطوط کاروباری قسم کے غیر کاروباری اور۔۔۔

اُس نے اُسے کیوں اغواء کروایا تھا؟ کیوں مقید رکھا تھا؟۔۔۔ خیال کوندے کی طرح ذہن میں لپکا۔

وہ جلدی جلدی کاغذات الٹ پلٹ کرنے لگی مگر۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں تھا اُن میں۔۔۔ ایسی بات جو اُس سے متعلق ہو، ایسا اشارہ جو اُس کی ذات کی طرف ہو!

ایک پل کو تجسس نے جو اُسے اِس گھر تک کھینچ لایا تھا، راز جان لینے کی خواہش نے جس کی وجہ سے اُس نے خطرے مول لئے تھے اُس کا ہاتھ اُس کے پرائیویٹ خطوط تک بڑھا مگر۔۔۔

اگلے ہی لمحے اِس غیر اخلاقی حرکت پر زور زور سے دھڑکتے دل نے اُسے ملامت کیا ضمیر چبھنے لگا۔ اُس نے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ اُس کے ذاتی خطوط دیکھنا اُس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ وہ انتظار کرے گی۔ ابھی وقت چاہئے تھا شاید۔

وہاں سے نظریں ہٹا کر وہ صفائی دیکھنے لگی۔ ہر چیز شفاف تھی۔ میز پر کاغذات، فائلیں، پیڈ لفافے بھی چیزیں قرینے سے رکھی تھیں۔

وہ آگے بڑھی۔ دروازہ کھولا۔ ڈریسنگ روم تھا۔۔۔ یہاں قد آدم آئینہ لگا قیمتی ڈریسنگ ٹیبل تھا۔ ایک الماری کھولی۔ یہاں سے وہاں تک ہینگرز میں نفاست سے لٹکے اُس کے سوٹ تھے۔ دوسری الماری کھولی۔ اعلیٰ کوالٹی کے شوز کی جیسے دکان چمک اُٹھی تھی۔

وہ اور آگے بڑھی۔۔۔ دروازہ کھولا۔

وسیع وعریض باتھ روم تھا۔ اس طرف کارپٹڈ حصے میں ٹوائیلٹ تھا اور دو سیڑھیاں اُتر کر سوئمنگ پول۔ جگہ جگہ فل سائیز آئینے لگے تھے، پول کے کنارے پر کئی بڑے بڑے صاف تولیے تہہ کئے رکھے تھے، قیمتی مہکتے صابن خوبصورت طشتریوں میں سجے تھے، اعلیٰ شیمپوز تھے، بیش قیمت باتھ پرفیومز تھے، ٹیلی فون سیٹ یہاں بھی رکھا تھا۔ ہر چیز صاف، چمکتی اور مہکتی ہوئی تھی۔

دروازہ بند کر کے وہ واپس بیڈ روم میں آ گئی۔

ہر چیز اپنی جگہ پر تھی بلکہ جیسے بہت سوچ بچار کے بعد رکھی گئی تھی۔ صفائی اتنی تھی کہ عکس نظر آتا تھا اپنا ہر شے میں۔

اس میں اور کیا اضافہ کرنا تھا؟ وہ الجھ سی گئی۔

پھر باہر نکل آئی۔ آس پاس اور بھی کئی کمرے تھے۔ لاؤنج میں وہی قیمتی قالین، عمدہ فرنیچر نایاب پینٹنگز۔۔۔ یہاں بھی ہر چیز صاف چمکتی ہوئی۔

وہیں اُسے کچھ دیر قبل دادا جان کے پاس کھڑے کرامت بابا نظر آ گئے۔

"کیا بات ہے بیٹی؟" وہ اُسے متردد سا دیکھ کر پاس چلے آئے۔

"بابا... یہاں... زار صاحب کے کمرے میں کون صفائی کرتا ہے"؟ وہ اب بھ الجھی الجھی سی تھی۔

"بیٹی کون سے کمرے میں؟ یہ تو سارے ہی اُن کے کمرے ہیں۔ یہ اگلی کوٹھی پوری اُن کے پاس ہے۔"

اوہ۔۔۔ تو وہ ایک دو کمروں میں نہیں پوری کوٹھی پر محیط تھا۔ اور۔۔۔ دادا جان پچھ کوٹھی میں رہائش پذیر تھے۔ جبکہ دونوں کوٹھیاں ایک کوریڈور کے ذریعے آپس میں دی گئی تھیں۔

"تو پھر کون صفائی کرتا ہے"؟ اُسے یہ سب اپنے بس سے باہر معلوم ہونے لگا۔

"ملازم کرتے ہیں"۔

"ٹھیک ہے بابا۔" کچھ نہ سمجھتے ہوئے۔۔۔ وہ واپس محلانہ شان کی سیڑھ اُترنے لگی۔

"تم بس زار کا خیال رکھو"۔ اچانک اُسے دادا جان کی بات یاد آ گئی۔

مگر۔۔۔ کیسا خیال؟

وہ اُلجھ اُلجھ گئی۔ دادا جان بھی بس۔۔۔ پھر اُس کے لب دھیرے سے متبسم ہوئے۔

وہ اُسے اپنے بھی بس۔۔۔ دادا جان ہی لگے۔

پھر اُس نے سوچا۔ وہ روز اِس طرف آئے گی۔ ہر کمرے میں جھانکے گی۔ سب ٹھیک ٹھاک ہوگا اور وہ واپس چلدیا کرے گی۔

اول تو دادا جان نے پوچھنا نہیں تھا اُسے یقین تھا۔ اور اگر ایسا ہوا بھی تو وہ کہہ دے گی کہ سب ٹھیک ہے۔ وہ اُس سے پوچھ گچھ کبھی نہیں کریں گے۔

ہاں۔۔۔ کل زار آفس کے لئے تیار ہوگا تو اُس وقت دیکھ لے گی۔ شاید کوئی ہو بات دیکھ بھال کی۔ ورنہ تو۔۔۔

بس وہ تھی۔۔۔ اُس کے دادا جان، اُس کا خوبصورت سویٹ اور اُس کے آس پاس ہریالیوں سے لدا سحر زدہ ماحول!

شام کی چائے پی کر وہ اپنے سویٹ کے سامنے والی طرف تاحدِ نظر پھیلے سرسوں کے کھیتوں میں نکل گئی۔

سردیوں کا چھوٹا سا دن ڈھل رہا تھا، یخ بستہ شام کی لرزتی کانپتی دھوپ کی آخری کرنیں سرسوں کے پھولوں کو مزید سنہری بنا رہی تھیں، نیچے خشک نالے میں گڈریا اپنے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کو ہانکتا گھر کی طرف چل پڑا تھا، اُس پار کچے پکے چھوٹے چھوٹے مکانوں سے شام کی پکوان کا دھواں اُٹھ رہا تھا اور۔۔۔ پرندوں کے تھکے ہارے غول اپنے آشیانوں کی اور رواں دواں تھے۔

سرشاری وہ پگڈنڈی پر آہستہ آہستہ واپس آنے لگی۔

ناشتے کے فوراً بعد وہ اپنے بیڈروم میں آئی اور تیار ہونے لگی۔

سکارلٹ ریڈ گرم سوٹ پہن کر اُس نے دھاری دار گرے رنگ کی سمارٹ جیکٹ پہنی، گرے شوز پہنے، جلدی جلدی برش کر کے بڑے بڑے بل دیتی چوٹی بنا حسب عادت اپنی پسندیدہ پرفیوم لگائی اور ___

تیزی سے داداجان کا سائیڈ طے کرتی وہ زار کی طرف آ گئی۔

"ٹھک ٹھک..." اوپر پہنچ کر اُس نے ہولے سے اُس کے دروازے پر دستک دی۔

"یس کم اِن"۔ اُسی کی آواز تھی۔

اور وہ ___ جھجکتی ہوئی اندر داخل ہوگئی۔

ایک خاموش سا ہنگامہ برپا تھا اندر۔ ایک ملازم زار کو پیچھے سے کوٹ پہنا رہا تھا۔ دوسرا جھکا اُس کے بوٹ کے تسمے باندھ رہا تھا۔ ایک بھاگ دوڑ سی مچی ہوئی تھی۔

زار کی نظر اُس پر پڑی تو کچھ حیران سا ہوا۔ سب چھوڑ چھاڑ اُس کی طرف بڑھا۔

"کیا بات ہے مس نی شے"۔ وہ بہت شائستگی سے بولا۔

"وہ... وہ..." دو دو ملازموں کی دوڑ دھوپ کے باوجود اُس کا یہ کہنا کہ وہ بھی اس کی دیکھ بھال کرنے آئی تھی اُسے کچھ مضحکہ خیز سا لگا۔

"بتائیں ___ پلیز!" وہ حوصلہ افزا انداز میں نرمی سے بولا۔

"وہ... داداجان کہتے تھے۔ میں... آپ کی... دیکھ بھال... کیا کروں"۔

"کیا؟" ایک پل کو تو وہ زور سے چونکا اور پھر ___

اُس کا جی چاہا اتنے زور سے قہقہہ لگائے کہ در و دیوار گونج اُٹھیں، بھونچال آ جائے۔

اول تو وہ عام سا جملہ پہروں میں ادا کرتی تھی، اوپر سے ایسی بات جس پر وہ جھجک بھی رہی تھی۔ کئی مدت لگ گئے تھے جیسے۔

داداجان کو اُس کا داداجان کہنا اُسے اچھا لگا مگر ___ جو ڈیوٹی داداجان نے اُس کے ذمے لگائی تھی اُسے سراسر زیادتی لگی۔

اتنی نازک چیز! اور اتنے بھاری کام!! سوچ کر بھی اُسے ہنسی آ رہی تھی۔

چند لمحے وہ اُسے یوں ہی دیکھتا رہا۔ اوپر سے نیچے تک۔

پھر ہولے سے مسکرا دیا۔

"اِس وقت ہم کو دیر ہو رہا ہے۔ واپس آئے گا تو بات ہوگا ہاں۔"

اور وہ ___ آہستہ سے وہاں سے چلی آئی۔

وہ ہر بار ___ ایک مبہم سی مسکراہٹ سے ہی ___ اُسے احساس دلا دیتا تھا کہ وہ روسٹ نہیں کاٹ سکتی تھی، سردی نہیں برداشت کر سکتی تھی اور ___ اُس کے ذاتی کام تو شاید مشکل ترین ہی تھے۔ اُس کا اُسے سر سے لے کر پاؤں تک گھورتے ہوئے مسکرا دینا ہی کہتا تھا۔

ہال سے نکل کر وہ دادا جان کی کوٹھی کو ملانے والے کوریڈور میں آ گئی۔ اس وقت
دادا جان اپنے کمرے میں ہوں گے، بے اختیار اُس کا جی چاہا اُن سے بھی مل لے
اُن کے مشفق رویے اور اپنی تشنگی کا ردعمل تھا شاید۔

آگے بڑھتے ہوئے اُس نے اُن کے دروازے پر دستک دی۔

''آجاؤ''۔

اور وہ آہستہ سے اُن کے کمرے میں داخل ہوئی۔

دادا جان حسب معمول لکڑیوں کی جلتی آگ کے قریب صوفے پر بیٹھے تھے۔

''صبح بخیر دادا جان''۔

''صبح بخیر بیٹی ۔ آؤ آؤ''۔ خوش ہوتے ہوئے وہ بے حد شفقت سے بولے۔ ''بیٹھو''۔

وہ اُن کے مقابل صوفے پر بیٹھ گئی۔

''تمہیں کسی قسم کی تکلیف تو نہیں ہے نا بیٹی''۔ وہ اپنائیت سے بولے۔

''بالکل نہیں دادا جان''۔ وہ یوں بولی جیسے وہ واقعی اُس کے بھی دادا جان تھے

''یہاں کا ماحول تمہیں کیسا لگا؟'' انہوں نے مزید پوچھا۔

''بہت اچھا۔ میں بہت خوش ہوں یہاں''۔ اُس کا مطمئن چہرہ اُس کے جذبا
آئینہ دار تھا۔

''اور ہم تمہیں کیسے لگے؟'' چشمہ نیچے کر کے دھیرے سے مسکراتے ہوئے وہ اُ
بغور دیکھتے ہوئے بولے۔

''بہت ... بہت اچھے''۔ پتہ نہیں کیوں؟ اُس کی بڑی بڑی شربتی آنکھوں
سی تیر گئی۔

دادا جان کچھ چپ سے ہو گئے۔ کچھ سوچنے لگے۔

''تمہارے ـــ والد کیا کرتے ہیں بیٹی؟'' وہ جیسے کچھ جاننا چاہتے تھے۔

''اُن کی ڈیتھ ہو گئی ہے''۔ آنکھوں کی نمی سوا ہو گئی۔

اور ـــ دادا جان کو اُس کی اُداسی کا جواب مل گیا۔

وہ بھی اُداس نظر آنے لگے۔

''والدہ تو حیات ہیں نا تمہاری؟''

''جی نہیں۔ تین چار مہینے پہلے وہ بھی فوت ہو گئیں''۔ دو موتی لڑھک کر اُس کے
وبصورت گالوں پر آ رہے۔

''اوہ''۔ دادا جان دکھ سے اُسے دیکھ رہے تھے۔

تین چار مہینے ـــ ماں کی موت کا صدمہ کیسے مندمل کر سکتے تھے؟

اُس کا درد اُنہیں اپنے دل پر محسوس ہوا۔ اُٹھ کر اُس کے قریب آ گئے۔ اُس کے
ر پر ہاتھ رکھا۔

''روؤ نہیں بیٹی۔ ہمیں اپنا سمجھو۔ کل تک تم بھلے یہاں جاب کے سلسلے میں آئی
تھیں۔ مگر آج سے ہمیں اپنا ماں باپ سمجھو۔ زار کے ساتھ اب ہم تمہارے بھی دادا
ہیں۔ اور... کبھی قدم پر بھی تم ہمیں پیچھے نہیں پاؤ گی، یہ ہمارا وعدہ رہا۔ انشاءاللہ۔''

اور ـــ اُن کا ہاتھ آنکھوں سے لگا کر وہ ـــ بے اختیار رو دی۔

''صبر کرو بیٹی۔ خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔ اُس کے سر پر شفقت سے
ہاتھ پھیرتے ہوئے انہوں نے اُسے تسلی دی۔

تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔ زار اندر داخل ہوا۔

نی شے نے چپکے سے آنسو پونچھ لئے۔ رخ آتش دان کی طرف کر لیا۔

''دادا جان ہم چلتا ہے''۔ وہ معمول کے مطابق دادا جان کو سلام کرنے آیا تھا۔

پھر ـــ اُس کی نظر رخ پرلی طرف کئے نی شے پر پڑی۔

جانے کیوں؟ کچھ دیر قبل کی نی شے کی اُس کی دیکھ بھال کرنے کی بات پر اس
وقت پھر ایک مختصر سی مسکراہٹ اُس کے لبوں کو چھو گئی۔

''اچھا بیٹا ـــ بہ امانِ خدا۔'' دادا جان نے آگے بڑھتے ہوئے اُس کا کندھا
تھپتھپایا۔

''خدا حافظ''۔ اُس نے کہا اور ـــ بڑے بڑے قدم اُٹھاتا باہر چل دیا۔

دادا جان حسب معمول باہر دھوپ میں رکھی کرسیوں پر بیٹھنے گئے تو نی شے نے اُن

کا بھی کمرہ دیکھ لیا۔ یہاں ضرور تھوڑی بہت گنجائش تھی ہاتھ پاؤں ہلانے کی۔

ایک تولیہ، کچھ دوائیں، ایک کتاب، گرم موزے۔ اِن میں سے کچھ صوفے پر اور کچھ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر بے ترتیب پڑے تھے۔ یہ بھی شاید ابھی ملازم آیا نہیں تھا ورنہ ٹھیک ہوتا یہ بھی سب کچھ۔

اُس نے سب جلدی جلدی ٹھیک کیا۔ ڈریسنگ روم گئی، باتھ روم گئی، یہاں بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ تھوڑی دیر میں فارغ ہو کر وہ اپنی طرف آ گئی۔

آج دنوں بعد اُسے خیال آیا افریقہ میں آنٹی کو یقیناً اُس واقعہ کا علم ہو گیا ہو گا اب تک اور وہ اُس کیلئے پریشان ہوں گی کہ وہ اُس کی ممی کی واحد مخلص دوست تھیں، وہاں اپنا بینک اکاؤنٹ جو اُس نے یہاں ٹرانسفر کرانا تھا، وہاں کرائے پر دیا ہوا اپنا مکان۔

مگر ـــ فی الحال نہ وہ آنٹی کو خط لکھ سکتی تھی، نہ اپنا اکاؤنٹ یہاں ٹرانسفر کر سکتی تھی اور نہ ہی اپنے کرایہ داروں سے کوئی خط و کتابت کرا سکتی تھی کہ ـــ افریقہ خط و کتابت کر کے اُس کا راز کھل جانے کا خطرہ یقینی تھا۔

یوں ہی سوچوں میں گم اُس نے اپنی الماری کھولی۔ خیال آیا اُسے کئی چیزوں کی ضرورت تھی۔

گو اُسے کبھی کبھی زار کے مخبر ڈرائیور کا خیال آتا مگر ـــ جانے کیا تھا۔ کچھ تو یہاں آ کر وہ بہت محفوظ محسوس کر رہی تھی۔ اور کچھ حالات کا مقابلہ کرنے کی بھی ٹھان لی تھی اور پھر آج نہیں تو کل۔ کبھی نہ کبھی تو نکلنا ہی تھا باہر ـــ اُس نے اپنا ہینڈ بیگ اُٹھایا، چھوٹی سی چادر اچھی طرح لی اور کمرہ لاک کرتی دادا جان کی طرف آ گئی۔

''دادا جان مجھے کچھ ضروری شوپنگ کرنی ہے''۔ وہ آہستہ سے بولی۔

''ہاں ہاں ضرور۔ اعجاز سے کہو تمہیں جتنی رقم چاہئے دے اور ڈرائیور لے جائے گا''۔

''نہیں شکریہ۔ پیسے میرے پاس ہیں''۔ ابھی کچھ رقم اُس کے پاس باقی تھی۔

''بس ڈرائیور لے جائے''۔

''بیٹی کسی قسم کا تکلف مت کرو، ہم نے کہا ہے اب ہم تمہارے بھی دادا ہیں۔

جاؤ گاڑی لے جاؤ۔ اور ہاں ـــ اپنا خیال رکھنا''۔

اپنائیت کے ساتھ ساتھ جیسے اُن کے لہجے میں ذمہ داری کا بھی احساس تھا۔

اُسے اپنے نصیب پر ناز ہوا۔ والدین کے بعد کسی نے اُس کی ذمہ داری اُٹھانے کا سوچا تھا۔

خوشی خوشی شوپنگ کر کے وہ گھر لوٹی۔ اسلم نے اُس کی فرمائش پر مٹر چاول اور بھنا گوشت بنایا تھا۔ مزے سے کھا کر وہ سو رہی۔

آنکھ کھلی تو ـــ شام کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔

اُٹھ کر وہ باتھ روم میں نہانے چلی گئی۔ گرم پانی سے نہائی دھوئی تو طبیعت خوش ہو گئی۔ اُس نے ڈرٹی گرین کلر کی قمیض شلوار پہنی، آج ہی خریدا مسٹرڈ رنگ کا خوبصورت نرم سویٹر پہنا، مسٹرڈ رنگ کے ہی شوز پہنے پھر ـــ اپنے بے اندازہ لمبے اور گھنے بالوں کو سلجھاتے سلجھاتے اُس کے ہاتھ تھک گئے۔ بال برش ہو چکے تو اُس نے کپڑوں کے ہمرنگ دوپٹہ لیا اور کمرے کے پیچھے سے نکل کر ٹیرس سے ہوتی کچن کی طرف آ گئی۔

اسلم شاید دوسری طرف گیا تھا۔ وہ سامنے سے نکل کر برآمدے میں آ گئی۔

دھوپ ڈھل چکی تھی۔ سامنے کی دور تک پھیلی سرسوں بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ بل کھاتی پگڈنڈی اور بھی بھلی لگ رہی تھی۔

اُس کے قدم خود بخود اُس طرف اُٹھنے لگے۔

اردگرد کے سحر سے مسحور وہ چلتی رہی۔ پھر اُسے احساس ہوا۔

شام کے سائے ملگجے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ نیچے نالے میں وہی کل شام والا گڈریا بھیڑ بکریوں کا ریوڑ ہانکتا واپس آ رہا تھا اور پرندے پھر اپنے اپنے گھونسلوں کی طرف چل پڑے تھے۔

وہ بھی واپس مڑی۔ کہ نہائی بھی تھی، بال بھی اب تک نم تھے، کوٹ بھی نہیں لیا تھا اور سردی بہت گھِر آئی تھی۔

''گڈ ایوننگ میم''۔

جھکا سر اُٹھا کر اُس نے دیکھا۔ زار تھا۔ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ دیئے قدم
کے فاصلے پر آ کھڑا ہوا تھا۔

وہ بھی رک گئی۔

''ایوننگ''۔ وہ دھیرے سے بولی۔

''میں آپ کا طرف گیا تھا۔ اسلم نے بولا آپ اِدھر آیا ہے۔ سو اِدھر آ گیا''۔

وہ سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔

''صبح آپ آیا تھا نا۔ اُس وقت ہم کو آفس جانے کا دیر ہو رہا تھا''۔

اوہ ___ تو اُسی بات کے سلسلے میں آیا تھا۔ کہا تھا واپس آئے گا تو با
ہو گی ___ خاصا پابند تھا اپنی بات کا!

''تو کیا کہا تھا دادا جان نے؟'' واپس مڑ کر اُس کے ساتھ ساتھ چلتے ہو
سامنے دیکھتا وہ بولا۔

اُس کی دلنشیں آنکھوں میں چمک تھی، ہونٹوں پر دلآویز مسکراہٹ۔

''وہ... کہ... میں آپ کی دیکھ بھال کیا کروں''۔

وہی مدھم آواز، دھیما لہجہ، مدھر رفتار!

وہی ادائیگی کا آہستہ آہستہ، منفرد انداز!

اُس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ دلآویز مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

''دادا جان کو چاہیے تھا۔ پہلا آپ کا وزن کرتا۔ پھر آپ کا آواز اور رف
بات ناپتا پھر...''

اور ___ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ خوبصورتی سے ہنس دی۔

اُس کے دانت کتنے خوبصورت تھے، موتیوں کی لڑیوں جیسے۔ ہنسی کی کھنک
نازک تھی موسیقی کی مدھر تانوں جیسی۔ کیا چیز تھی! کیا دنیا کی تمام تر نزاکتوں نے اُ
ہستی میں آ کر ختم ہونے کی ٹھان لی تھی!

''آپ کو معلوم ہے۔ میرا دیکھ بھال یعنی میرا کام کرنا کتنا مشکل ہے۔ اول ا
میرا کام بہت زیادہ ہے، آپ جیسا نازک لڑکی کا بس کا نہیں۔ دوسرا یہ کہ...

کام ٹھیک صحیح وقت پر چاہتا ہے، یہ بھی آپ جیسا Fragile لڑکی نہیں کر سکتا۔ تیسرا یہ
کہ مجھ کو بعض وقت کام صحیح نہ ہونے پر غصہ آ جاتا ہے۔ آپ تو میرا ایک ہی گرج سے
غائب ہو جائے گا''۔ خوشدلی سے کہتا وہ ہنس دیا۔

غصہ اور گرج وہ برداشت کرنے کے حق میں بھی نہ تھی۔

''غصہ مجھے بھی آ جاتا ہے''۔ اُس کے منہ سے نکل ہی گیا۔

مگر ___ ایک فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔

اور وہ ___ چونک کر زار کو دیکھنے لگی۔

''آپ اپنا ہات کا بوجھ تو اُٹھا سکتا نہیں۔ غصہ کیا کرے گا''۔ اُس کے باتوں کے
دلفریب انداز پر لطیف چوٹ کرتا وہ اب بھی ہنس رہا تھا۔

وہ بھی مسکرا دی۔ کہ اُسے معلوم تھا کوشش کے باوجود وہ جلد جلد نہ بول پاتی تھی۔

''مِس...'' جانے کیا کہنے والا تھا وہ۔

وہ اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

''ہائے داوے۔ آپ کا نام کا مطلب کیا ہے۔ "It sounds strange"۔
اُس نے خوشگواری سے پوچھا۔

اوہ ___ وہ چند لمحے خاموش رہی۔ جھجک سی رہی تھی جیسے۔

''Soft.'' اُس نے ہولے سے کہا۔ ''ٹرکش ہے''۔

اور وہ ___ مبہوت سا رہ گیا۔

کیا سراپے، لب و لہجے، ناز و انداز کی مناسبت سے اتنا موزوں نام بھی ہو سکتا تھا؟

وہ مسکرا دیا۔ دھیرے سے۔

معاً ہوا کا ایک یخ بستہ ریلا آیا اور نی شے کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔

زار نے دیکھا۔ اُس کے پورے وجود پر کپکپی سی طاری ہو گئی تھی۔

وہ شاید نہائی تھی۔ اُس کے گھٹنوں سے نکلتے سیاہ گھنے بال اب بھی بھیگے ہوئے تھے
۔ کچھ خاص گرم بھی نہیں پہنے تھی اور سردی خاصی گھر آئی تھی۔

''جلدی جلدی چلو تم کو زکام ہو جائے گا''۔ اُس کے لہجے میں تشویش تھی۔ اُسے

آپ کے وزنی تخاطب سے بھی مخاطب نہیں کیا تھا۔

نی شے نے واقعی قدم تیز کر لئے۔ ساتھ ہی جانے کیسے اُس کا ننھا سا رومال اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پگڈنڈی کے قریب جھاڑی میں جا گرا۔

وہ رک گئی۔ ایک قدم احتیاط سے جھاڑی کے اندر رکھا اور رومال اُٹھانے کو جھکی۔ رومال تو ہاتھ آ گیا مگر ـــ پورے بال جھول کر جھاڑی میں جا اُلجھے۔

وہ بے بس سی کبھی ایک طرف سے تو کبھی دوسری طرف سے انہیں چھڑانے میں لگ گئی۔

زار بھی رک گیا تھا۔ پریشان سا اُسے دیکھ رہا تھا۔

پھر ـــ اُس سے اُس کی بے بسی نہ دیکھی گئی۔ پاس چلا آیا۔ وہیں جھاڑی کے پاس دوزانو بیٹھ کر ـــ اُس کے بال خاردار جھاڑی سے الگ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

عجیب تجربہ تھا۔ وہ ہولے سے ہنس دیا۔

''اتنا بہت سارا بال کے ساتھ تم کو جھاڑی کے پاس نہیں جھکنا چاہئے تھا''۔

''مگر میرا رومال...''

''تم ہم کو کہہ دیتا''۔

وہ چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔ اپنے تسمے تک ملازموں سے بندھوانے والا کہہ رہا تھا یہ!

''اپنا نہ سہی ـــ دوسرے کا تو کام آتا ہے ہم۔'' وہ جیسے اُس کی نظریں پڑھ گیا۔ خوبصورتی سے ہنس دیا۔

اُس کے تو وہ پچھلے دنوں بڑا کام آیا تھا! اُس نے تلخی سے سوچا۔

کتنے متضاد دو روپ تھے اُس کے۔ ایک کتنا بھیانک، ظالم، بے رحم ـــ دوسرا کتنا خوبصورت نیکدل، ہمدرد!

بہرحال ـــ اُس نے خیال جھٹکا۔ کہ اُس کے بال بجائے سلجھ کر جھاڑی سے نکلنے کے اور بھی اُلجھ کر پھنسے جا رہے تھے اُس میں۔

زار اب بھی برابر انہیں نکالنے سلجھانے کی کوشش میں لگا تھا۔ پتہ نہیں کیوں؟ اُسے پھر پہلے اپنی تلخ سوچ پر افسوس سا ہوا۔ شاید وہ ویسا نہیں تھا۔ ایک بار پھر وہ بے یقینی میں مبتلا ہو گئی۔ پر ـــ کیوں کیا تھا اُس نے ایسا؟ ذہن میں ایک بار پھر سوال اُٹھا اور ایک بار پھر وہ اُلجھنے لگی۔

''تم ـــ جھکو ذرا پلیز!'' وہیں بیٹھے بیٹھے زار نے کہا۔

وہ چونکی ـــ اُس کے کندھے پر تو پہلے ہی جھکی کھڑی تھی اور کتنا جھکتی۔

''جھکو نا پلیز!'' اُس نے جھکا سر اُٹھایا۔

اور ـــ نی شے توازن برقرار نہ رکھ سکی، سیدھی جا گری اُس کے زانو پر۔

زار نے اُسے سنبھالا دیا۔ کھڑا کیا مگر ـــ

اُس کی ٹپٹاہٹ، گھبراہٹ اور سفید پڑتے رنگ پر ـــ اپنی بے طرح اُمڈ آئی ہنسی نہ روک سکا۔

وہ خجل سی کھڑی رہی ـــ کہ اس کے سوا چارہ نہ تھا۔

بال اُس کے اب بھی اُلجھے ہوئے تھے ـــ زار اب بھی انہیں نکال رہا تھا۔

بہرحال کافی تگ و دو کے بعد بال جھاڑی سے الگ ہو ہی گئے۔

''ہہہ۔'' کھڑے ہو کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے زار نے جیسے نجات کی سانس لی۔

''آؤ''۔

وہ اُس کے ساتھ ساتھ چل پڑی۔

''یہ بال تم کو اسی طرح ہر جگہ پریشان کرتا ہے''۔ اُس کا اشارہ جھاڑی کے علاوہ ڈنر والی رات کرسی کی ٹانگوں میں اُلجھنے کی طرف بھی تھا۔

''ہر جگہ تو نہیں پر کبھی کبھی ضرور ہوتا ہے ایسا''۔

''اُس کو تو ـــ وہ...'' نی شے نے نوٹ کیا تھا اردو بولتے وقت وہ کبھی کبھی اٹک جاتا تھا۔ لفظ تلاش کرنے لگتا تھا۔ اِس وقت بھی اشاروں سے جیسے کنگھی کی بات کر رہا تھا۔ ''وہ... سیدھا کرتے وقت بھی بہت مشکل ہوگا''۔ اُس نے بمشکل بات پوری کی۔

اور ـــ نی شے کے لبوں پر اُس کے لفظ 'کنگھی' کی بجائے 'سیدھا کرنے' پر ہی اکتفا

کر لینے پر دھیمی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

گرے پینٹ پر بلوئش گرے ہاف لیتھ اوورکوٹ پہنے، بے انتہا شاندار لگنے کے باوجود۔۔۔

زبان پر عبور نہ ہونے کے باعث اُس کے دھیمے لہجے کی اٹکن سی اُس کی گرے بلو آنکھوں کی اُلجھن سی، اُسے بے حد معصوم بنا رہے تھے۔

''جی۔۔۔ مشکل تو ہوتی ہے''۔ اُس نے دھیرے سے کہا۔

''اصل میں۔۔۔ بہت زیادہ ہے نا، تنگ تو کرے گا''۔ وہ اب بھی ایک متحیر سی نظر اُس کے ڈھیر سارے بالوں پر ڈالتے ہوئے بولا۔

اور۔۔۔ اُس کی معصومانہ بات اُس کے تحیّر پر ایک بار پھر ثانی شے کے ہونٹ متبسم ہوگئے۔

پھر اُسے خیال آیا۔ زیادہ تنگ تو وہ ہوا تھا، جھاڑی سے اُلجھے ہوئے بال تو اُس نے نکالے تھے۔

''آئے ایم سوری۔ آپ بھی پریشان ہوئے''۔ وہ نادم سی بولی۔

''نہیں۔۔۔ ایسا بات نہیں ہے''۔ وہ خوشدلی سے بولا۔

اُسے تو۔۔۔ پتہ نہیں کیوں؟ اچھا سا لگ رہا تھا یہ سب۔ اور پھر۔۔۔ وہ اُس کے زانو پر آ کر گری تھی، سٹپٹائی تھی گھبرائی تھی رنگ سفید پڑا تھا، تو وہ اور بھی محظوظ ہوا تھا۔

وہ اب بھی ہنس دیا۔ آہستہ سے۔

اُس کی باتوں میں، اُس کی اداؤں میں، بے پناہ نزاکت تھی۔

نزاکت بھی ایسی کہ۔۔۔ خود نزاکت بھی دیکھ کر شرما جائے!

اُس کا رنگ بہت شفاف تھا، گال بہت سرخ۔ جیسے دودھ میں چیری نچوڑ دی جائے، جہاں تحلیل ہو جائے رنگ ہلکا گلابی اور جہاں قطرے گاڑھے ہوں رنگ تیز آتشی گلابی۔ ہونٹ جیسے ہر دم عنابی رنگ لگایا ہو۔ بڑی بڑی آنکھیں جیسے سرخ سنہری زعفرانی رنگ بھیگ کر گھل مل گئے ہوں۔ سیاہ جھالریں پلکیں، سیاہ بھوئیں اور سیاہ بال۔ مناسب قد اور بے حد متناسب جسم۔

اُس پر اُس کا بے پناہ دلکش اندازِ گفتگو!

وہ جیسے اس قدر بے شمار خوبصورتیوں کا بڑے غور سے جائزہ لے رہا تھا۔

معانی شے چھینکی، سردی اپنا اثر دکھا گئی تھی جیسے۔

وہ چونک اُٹھا۔ گھبرا سا گیا۔

''میں نے کہا تھا نا تم کو زکام ہو جائے گا''۔

دونوں نے قدم تیز کر لئے۔

''اوکے۔ اب چلتا ہے''۔ اُسے اُس کے برآمدے تک لا کر اُس نے کہا۔

اور۔۔۔ بڑے بڑے قدم اُٹھاتا دادا جان کی طرف کے باڑ کے دروازے کی طرف بڑھا۔

وہ ساری رات بے کل رہی۔ صبح ہوتے ہی اُس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ سینہ میں
درد اور سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ شاید بخار بھی تھا۔ بستر سے اُٹھا ہی نہیں
رہا تھا۔

بمشکل خود کو گھسیٹتی وہ باتھ روم تک گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر کمرے میں آئی۔ اسلم کو
کر کے نڈھال سی دوبارہ بستر میں گھس گئی۔

"جی بی بی جی"۔

"اسلم ایک پیالی چائے لا دو"۔

اور ــــ جب اسلم چائے لایا وہ بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔

"بی بی چائے"۔ اُس نے چھوٹی سی ٹرے میں رکھی پیالی اُس کے بیڈ سائیڈ

ٹیبل پر رکھ دی۔

ہمت کر کے خود کو تقریباً گھسیٹ کر اُس نے مسہری کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

"بی بی آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" اسلم اُس کی خلاف معمول صرف چائے
اور اُس کی حالت بھانپ کر تشویش سے بولا۔

"پتہ نہیں کیا ہے سانس لینا مشکل ہو رہا ہے"۔

"بڑے صاحب کو بتاؤں جا کر؟"

"نہیں نہیں۔ ٹھیک ہو جائے گا"۔ وہ جلدی سے بولی۔ اُنہیں پریشان کرنا نہیں
چاہتی تھی۔

مگر نو دس بجے تک بھی حالت یہی رہی تو اسلم خود سے ہی دادا جان کے پاس پہنچ
گیا۔

منٹوں میں دادا جان اُس کے کمرے میں تھے۔

"کیا ہوا بیٹی؟" اُس کی نبض ٹٹولتے ہوئے وہ فکرمند سے بولے۔

"پتہ نہیں"۔

"ٹھنڈ تو نہیں لگ گئی"۔ اُس کی بے ترتیب سانسوں اور تیز بخار سے انہوں نے
اندازہ لگایا۔ "اعجاز سے کہو ڈاکٹر کو فوراً آنے کو کہے"۔ اب انہوں نے اسلم سے کہا۔

دادا جان وہیں اُس کے قریب کرسی پر بیٹھ گئے۔ کبھی اُس کا ماتھا چھوتے کبھی
نبض۔

بن ماں باپ کے بے سہارا بچی تھی۔ اُن کے امان میں آئی تھی اُسے کچھ نہیں ہونا
چاہئے تھا۔

پھر ڈاکٹر آ گیا۔ نمونیہ بتایا۔ دوائیں لکھ کر دیں۔ مکمل آرام کرنے کو کہا اور کمرہ
گرم رکھنے کی تاکید کرتا ہوا چلا گیا۔

دادا جان خاصے پریشان تھے۔ فوراً دوائیاں منگوائیں۔ نرس کا بندوبست کیا۔

دوائیاں شروع ہوئیں اور سسٹر فلورنس نے اُسے اپنی تحویل میں لیا تو تب جا کر
قدرے مطمئن ہوئے۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ سسٹر نے کمرے کی بتیاں جلالیں، پردے برابر کر دیئے، اور ہیٹر کے پاس صوفے پر واپس بیٹھ کر قریب رکھا رسالہ دوبارہ اُٹھا لیا۔

نی شے نے آنکھیں کھولیں۔ اِردگرد دیکھا۔ وہ شاید سوگئی تھی۔

"کیسی طبیعت ہے اب؟" سسٹر اُٹھ کر پاس چلی آئی۔ "آپ کافی دیر تک سوئی رہی ہیں اِس کا مطلب ہے آپ ٹھیک ہو رہی ہیں"۔ مسکراتے ہوئے سسٹر نے تھرمامیٹر جھٹکتے ہوئے اُس کے منہ میں رکھ دیا۔

اُس کا ٹمپریچر کم ہو رہا تھا۔ سسٹر نے اُسے دوائیں دیں اور کمبل درست کر دیئے۔

تبھی بھاری قدموں کی آہٹ کے ساتھ دروازے پر دستک ہوئی۔

آگے بڑھ کر سسٹر نے دروازہ کھول دیا۔

"گڈ ایوننگ سر"۔ سسٹر فلورنس نے کہا۔

"ایوننگ"۔ زار تھا۔ متردد سا تھا۔ آگے بڑھ آیا۔

"اب کیسا طبیعت ہے اِن کا۔" اُس نے سسٹر سے پوچھا۔

"بہتر ہیں سر"۔ سسٹر بولی۔ "ٹمپریچر صبح سے کم ہے اور بہتر بھی محسوس کر رہی ہیں"۔

"I see."۔ وہ نی شے کے بستر کے پاس آ گیا۔

"آپ کی چائے لگا دی ہے"۔ اسلم نے آکر سسٹر فلورنس سے کہا۔

"شکریہ۔ آتی ہوں۔" سسٹر نے کہا۔ "سر میں ذرا چائے پی لوں"۔

"Sure."۔

اور وہ ڈائننگ روم میں چلدی۔

"تو میم صاحب ___ آپ بیمار پڑ ہی گیا۔" خوشگواری سے کہتے ہوئے وہ اُس کے بستر سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔

"آپ نے زکام کہا تھا"۔ پتہ نہیں کیسے؟ وہ آہستگی سے بولی۔

"اوہ۔" اُس کی بات سے وہ محظوظ ہوا۔ "ہم تمہارے نزاکت کا صحیح اندازہ لگا سکا تھا"۔

نی شے کی نظریں اوپر اُٹھیں۔

اُس کی آنکھوں میں چمک سی تھی، لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ۔

نی شے کی پلکیں لرز سی گئیں۔ نظریں سامنے جما دیں۔

"تم کل نہایا یا تھا شاید ___ ہوں۔" کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ دیئے وہ ___ دھیرے سے بولا۔

"ہاں۔" اُسے حیرت سی بھی ہوئی اُسے کیسے پتہ چلا؟

"اصل میں تمہارا بال ___ کافی دیر تک گیلا تھا نا ___ تم کو چاہیئے اِس کو ڈرائیر سے خشک کرو..."

"اوہ۔" تو اُسے اُس کے گیلے بالوں سے اندازہ ہوا تھا۔ "مگر ڈرائیر سے بھی بہت سا وقت لگ جاتا ہے۔ پھر بھی پورے خشک نہیں ہو پاتے..."

اور وہ ___ دھیرے سے مسکرا دیا۔

"خوبصورت ___ پرابلم"۔

ایک بار پھر ___ نی شے کی نظریں اوپر اُٹھیں۔

ایک بار پھر ___ اُس کی دلنشیں آنکھیں اُس پر جمی تھیں، پرکشش لب متبسم تھے۔

اور ___ ایک بار اور ___ نی شے سامنے دیکھنے لگی۔

"دادا جان تمہارا واسطے بہت پریشان ہیں۔ آفس سے آتے ہی مجھ کو آرڈر دیا کہ میں تم کو دیکھنے آجائے۔ "He likes you very much." اُسے دیکھتے دیکھتے وہ کہہ رہا تھا۔

نی شے کی آنکھوں میں دادا جان کے لئے ممنونیت اُبھر آئی، عقیدت جھلک آئی۔

"اچھا ___ میں چلتا ہوں۔ اپنے کو گرم رکھنا۔ ہوں"۔

اور باوقار انداز میں چلتا وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

شام کے سائے لمبے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ سسٹر فلورنس نے پردے گرا لئے
، بتیاں روشن کر لی تھیں۔

آج نی شے کی طبیعت کل کی نسبت بہت اچھی تھی۔ نرم گرم بستر میں لیٹی وہ
محسوس کر رہی تھی۔

"نی شے رضا صاحب نے آپ کا ٹمپریچر چارٹ منگوایا ہے۔ میں لے کر جا
ہوں"۔ سسٹر اُس کا ٹمپریچر چارٹ اُٹھاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

اور نی شے یوں ہی ہاتھ میں پکڑے اپنے رومال کے منے سے پھول کو تکنے لگی
تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔ زار تھا، اندر آ گیا۔

ڈارک بلو قیمتی سوٹ میں ملبوس وہ ہمیشہ کی طرح شاندار لگ رہا تھا۔ اُس کا مخ
مدھر پرفیوم اُس کی آمد کا پتہ دے رہا تھا۔

"گڈ ایوننگ"۔ وہ آگے بڑھ آیا۔

"ہیلو"۔ نی شے دھیرے سے بولی۔

"کیسا طبیعت ہے اب؟" اُس نے نی شے کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقوں اور دو
ہی دن میں زرد پڑے چہرے کو دیکھتے ہوئے اپنائیت سے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں"۔

"نرس کہاں ہے؟" اُس نے اِردگرد دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میرا ٹمپریچر چارٹ لے کر گئی ہیں دادا جان کے پاس"۔

"I see."

"آپ... بیٹھیے نا"۔ نی شے آہستہ سے بولی۔

"تھینک یو"۔ وہ قریبی کرسی اُس کے بستر کے نزدیک کر کے بیٹھ گیا۔

"تم ــــ سوپ وغیرہ تو لیتی ہے نا"۔ اُس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے وہ کچھ
تشویش سے بولا۔

"ہہ... ہاں"۔

"گڈ"۔ اُس نے ٹانگیں اُس کے بستر کے نیچے سیدھی پھیلا لیں۔ سر تھکے تھکے
انداز میں کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔

"نرس ٹھیک سے دیکھ بھال تو کر رہا ہے نا؟"

"ہاں"۔

"اور اسلم؟"

"سب ٹھیک ہے"۔ وہ ہولے سے مسکرائی۔ "آج پھر آپ کو دادا جان نے آفس
آتے ہی اِدھر بھیج دیا۔ اُس کی تھکی تھکی حالت دیکھ کر وہ سادگی سے بولی۔

"اوہ۔" اُسے جیسے یاد آیا۔ سیدھا ہوا، پھر مسکرایا۔ "نہیں ــــ آج میں خود آیا
ہا"۔ پھر اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "کیا میں خود نہیں آ سکتا؟"

اُس کی پلکیں کانپنے لگیں۔ نظریں سامنے کر لیں۔

اور ایک ــــ مبہم سی مسکراہٹ زار کے لبوں کو چھو گئی۔

"چوکلیٹ کھاؤ گی؟" کوٹ کی جیب سے قیمتی برانڈ کا چوکلیٹ نکال کر وہ ک
اُتارنے لگا۔

وہ مسکرا دی۔ اُسے چوکلیٹ اچھے لگتے تھے۔

"لو" وہ اُس کے منہ کے پاس لے گیا۔

ایک پل کو وہ جھجکی مگر ــــ دوسرے ہی لمحے ایک بائیٹ لے لیا۔

باقی کا زار نے اُس کے تکیے کے قریب رکھ لیا۔

"ڈرائے فروٹ کھا سکو گے؟" اُسے ڈر تھا نمونیہ میں شاید پرہیز ہو۔ "نرس
پوچھتے ہیں پھر میں بھجواتا ہے"۔

"تھینکس۔ لیکن میرا خیال نہیں کہ ڈرائے فروٹ میرے لئے ٹھیک ہے"۔

"پھر ٹھیک کیسا ہو گا تم۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ "ایک تو ویسے ہی ــــ ہوا چلتا تھا تو گ
تم کو اڑا کر لے جائے گا۔ کیا پتہ تھا اُٹھا کر بستر پر ہی ڈال دے گا۔"

اُس پر بھی اُس کی دلنشیں آنکھوں میں شوخ سی چمک تھی۔ لبوں پر چھائی مسکرا
میں لطیف سی شرارت تھی۔

وہ پھر نظریں چرانے لگی۔ پلکیں جھپکانے لگی۔

"ٹھک ٹھک..." دروازے پر دستک ہوئی اور ــــ اسلم ٹرے میں زار ے
کوفی اور نی شے کے لئے سوپ لے کر آ گیا۔

نی شے کے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر اُس کا سوپ رکھ کر اُس نے ٹرے میں رکھا گ
کوفی کا مگ زار کو پیش کیا۔

"تھینک یو۔ اِس وقت واقعی ضرورت تھا ہم کو کوفی کا"۔ اُس نے مگ اُٹھا لیا
اور اسلم مؤدب طریقے سے پیچھے ہٹ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

زار نے ایک نظر نی شے کے سوپ پر پھر نی شے پر ڈالی۔ وہ اب بھی کمبل
تک لئے لیٹی ہوئی تھی۔ اُس نے اپنا مگ رکھا۔ نی شے کے پاس آیا۔

ایک پل کو کچھ رک سا گیا اور پھر ــــ آگے بڑھتے ہوئے ایک ہاتھ
دے کر اُس کا سر اُٹھایا دوسرے سے اُس کے تکیے مسہری کی پشت سے

ور ــــ جھجکتی سمٹتی نی شے کو موقعہ دیئے بغیر آرام سے کھینچتے ہوئے تکیوں سے اُس کی
ت نکالی۔

وہ جھکا سر لیے لمبی لمبی پلکیں جھپکاتی اپنے خوبصورت ناخنوں کو تکتی رہ گئی۔

چند ثانیے زار اُسے دیکھتا رہا۔ پھر ایک مدھری مسکراہٹ اُس کے لبوں پر بکھر گئی۔

"اب یہ سوپ پی لو"۔ اُس نے قریب رکھے سوپ کے پیالے کی طرف اشارہ
کیا۔

اور خود دوبارہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنی کوفی کا مگ ہونٹوں سے لگا لیا۔

"گرم ہے"۔ سوپ کی طرف دیکھے بغیر ہی نی شے نے دھیرے سے کہا۔ بہانہ بنایا
ں نے کہ سوپ اُسے کبھی اچھا نہیں لگا تھا۔ سسٹر فلورنس اور اسلم کو بھی دِق کر رکھا تھا کل
ے۔

"تھوڑا ٹھنڈا ہونے دو"۔ گرم گرم کوفی سے اُٹھتے بھاپ کو گھورتے ہوئے وہ
گھونٹ گھونٹ کر کے پی رہا تھا۔

پھر وہ چونکا۔ نی شے چپکے سے دوبارہ بستر میں سلپ ہو رہی تھی۔ سوپ اُسی طرح
رکھا تھا۔

وہ سمجھ گیا وہ جان چُرا رہی تھی سوپ سے۔

اُس نے کوفی ختم کی مگ واپس رکھا۔

"یہ سوپ تو پینا ہو گا"۔ وہ اُس کے بستر کے پاس آ کھڑا ہوا۔

"نہیں"۔ کمبلوں کے اندر سے آواز آئی۔

اور وہ ــــ اپنی ہنسی نہ روک سکا۔

پھر ــــ آگے بڑھا ــــ کمبل ہٹائے، کسی احتجاج کا موقعہ دیئے بغیر اُسے بٹھایا اور
سوپ کا پیالہ اُس کے منہ سے لگا دیا۔

اُس نے ایک گھونٹ لے لیا۔ مگر پھر ــــ اُس کا ارادہ پکا دیکھ کر اُس نے ہونٹ سختی
سے بند کر لئے۔

"اوں ہوں۔" اُس نے سر نفی میں ہلایا۔ کہ سوپ پینا واقعی اُس کے بس کی بات

نہ تھی۔

زاراب بھی سوپ کا پیالہ لئے وہیں کھڑا تھا۔ چند لمحے انتظار کیا اور پھر ــــ
دوسرے ہاتھ سے اُس کی ناک جو بند کی تو منہ خود بخود کھل گیا اور لمحوں میں
اُسے بڑے بڑے گھونٹ پلا کر اُس نے خالی پیالہ میز پر رکھ دیا۔

مڑ کر دیکھا۔ چونکا۔ اُس کی خوبصورت آنکھوں میں یہ موٹے موٹے آنسو تھے۔

بے اختیار اُس کا قہقہہ لگانے کو جی چاہا۔ کیا موم کی بنی چیز تھی!

وہ پھر سے بستر میں گھس گئی۔ کمبل سر تک لے لیا۔

وہ یوں ہی کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ پھر اسلم آ گیا۔ ٹرے اُٹھا کر جانے لگا۔

''صاحب۔ اعجاز صاحب کہتے ہیں جہاز آنے کا وقت ہو رہا ہے، آپ نے کم
لینے جانا تھا''۔ اطلاع دے کر اسلم کمرے سے باہر نکل گیا۔

''اچھا مَیم ــــ میں جاتا ہے اب''۔ وہ نی شے سے بولا۔

مگر ــــ اُس کی طرف سے کوئی رسپانس نہیں تھا۔

وہ ہنس دیا ــــ وہ تو بالکل بچوں جیسی تھی۔

اور پھر ــــ بڑے بڑے قدم اُٹھاتا وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

دروازے سے نکلتے نکلتے اُس کی نظر اُس کے بستر پر پڑی۔ کمبل تھوڑے سے
کر وہ اُسی طرف دیکھ رہی تھی۔ منہ پھولا پھولا سا تھا، نظریں خفا خفا سی!

وہ ہولے سے مسکرا دیا۔ اور نی شے نے کمبل پھر سے اُوپر کھینچ لئے۔

آج وہ تقریباً ٹھیک تھی، ٹمپریچر نارمل تھا اور طبیعت بشاش۔

شام کی چائے اُس نے اور سسٹر فلورنس نے اکٹھی پی۔ پھر سسٹر نے اُس کے تکیے
کی پشت سے ٹکا کر اُسے بٹھا دیا۔ اُس کے اوپر کمبل درست کئے اور اُسے تازہ
ین تھما دیا۔

''نی شے۔ میں ذرا باہر ہو آؤں''۔ اِن چند دنوں میں ہی وہ نی شے کی ملنساری
رُش اخلاقی کی وجہ سے اُس سے خاصی بے تکلف ہو گئی تھی۔ ''شام بہت خوبصورت
ہی ہے''

''ضرور جائیں۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں''۔

اور وہ باہر چلدی۔ وہ یوں ہی میگزین کے اوراق پلٹتی رہی، رنگین تصویریں

دیکھتی رہی۔

معاً دروازے پر دستک ہوئی۔ دادا جان تھے ساتھ ہی زار بھی۔

"سناؤ بیٹی کیا حال چال ہیں؟" وہ پاس آ کر قریبی کرسی پر بیٹھ گئے۔

زار سامنے کے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"بالکل ٹھیک ہوں دادا جان"۔

"کچھ کھا پی بھی رہی ہو؟" انہوں نے شفقت سے پوچھا۔

"جی"۔

"سوپ نہیں پیتا"۔ یہ زار تھا۔ مسکرا رہا تھا۔

"تمہیں کیسے معلوم؟" دادا جان نے غور سے اُسے دیکھا۔

"وہ... وہ کل شام میں آیا تھا نا"۔ وہ وہیں صوفے کے بازو پر انگلی سے لکیر
بنانے لگا۔ "تو یہ سوپ نہیں پی رہا تھا"۔

"پھر؟" دادا جان نے چشمہ قدرے نیچے کیا۔

"میں نے اِس کا ناک بند کر کے زبردستی پلا دیا"۔ وہ دادا جان کو دیکھتے د
ہنس دیا۔

"بہت خوب"۔ وہ گویا خوش ہو گئے۔ اور پھر کچھ دیر یوں ہی زیرِ لب دھ
دھیرے مسکراتے رہے۔

"یہ فلورنس کہاں گئی؟" انہیں جیسے اچانک خیال آیا۔

"باہر گھومنے نکلی ہیں ذرا"۔

"اچھا اچھا"۔

وہ دونوں کچھ دیر بیٹھے رہے۔ زار نے نوٹ کیا وہ جیسے اُس سے کل ز
سوپ پلا دینے پر اب بھی خفا خفا سی تھی۔ دادا جان سے بڑی اپنائیت سے
رہی تھی مگر — جوں ہی زار کی نظروں سے نظریں ملتیں، چپ سی ہو جاتی، نظریں
سی نظر آنے لگتیں۔ کیا ادا تھی! وہ محظوظ ہوئے بنا نہ رہ سکا۔

پھر — اُس نے گھڑی پر نگاہ کی، اُٹھ کھڑا ہوا۔

"میں چلتا ہوں — کلب جانا ہے"۔

"ہم بھی چلتے ہیں"۔ دادا جان بھی اُٹھے۔ "نماز کی تیاری کرنی ہے
اچھا بیٹی..."

اور وہ دونوں چلدیئے۔

دن گزرتے رہے۔ دوائیوں کے مسلسل استعمال، آرام اور مناسب نگہداشت
سے وہ بتدریج اچھی ہوتی گئی۔ طبیعت بہتر اور کمزوری بحال ہوتی گئی۔

اِس دوران دادا جان اُسے روزانہ دیکھنے آتے۔ اُس کی خوراک کا طاقت کی
دوائیوں کا آرام کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھتے۔ اب تو وہ بھی مارے عقیدت کے جیسے
نظریں بچھائے رکھتی تھی اُن کی راہ میں۔ اُس کی رہی سہی جھجک اور اجنبیت بھی جاتی
رہی تھی اِن چند دنوں میں۔ وہ واقعی جیسے اُس کے بھی دادا جان ہی تھے۔

زار البتہ اُس کے بعد پھر نہیں آیا تھا۔ شاید ضروری کاموں میں مصروف تھا۔ یا پھر
کہیں باہر گیا تھا بہرحال —

آج سسٹر فلورنس واپس جا رہی تھی۔ رات ہی دادا جان سے اجازت لے چکی
تھی۔ کیونکہ اب ڈاکٹر کے خیال میں اُس کی مزید ضرورت نہ رہی تھی۔ نی شے اب
بالکل تندرست تھی، غسل بھی لے چکی تھی۔

گلابی شام بہت حسین تھی، پیارا سا کمرہ بہت کوزی تھا۔ اور نرم و گداز صوفے میں
دھنسی بیٹھی وہ جو ٹیلی ویژن پروگرام دیکھ رہی تھی بہت دلچسپ تھا۔

دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی۔ قدموں کی بھاری چھاپ اور مخصوص دستک۔ یہ
یقیناً زار تھا۔ پتہ نہیں کیوں؟ اُس کا دل کچھ بے ترتیبی سے دھڑکا۔

"یس"۔

اور وہ — اندر داخل ہوا۔ ڈارک گرے سٹرائیپڈ سوٹ اُس کی پرکشش شخصیت کا
وقار بڑھا رہا تھا، آنکھوں کی گرے بلو چمک اور لبوں پر کی دھیمی مسکراہٹ اُس کے
مردانہ وجاہت میں اضافہ کر رہے تھے۔

''کیسے حال چال ہیں میم''۔ وہ پاس چلا آیا۔
نی شے نے کوئی جواب نہیں دیا بس ___
وہیں بیٹھے بیٹھے خاموشی سے ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی بند کر دیا۔
وہ مسکرا دیا۔ وہ تو اب تک خفا تھی، بات نہیں کر رہی تھی اُس سے۔
''خفا ہو اب تک''۔
وہ اب بھی نہیں بولی۔ نظریں جھکائے اپنے ناخنوں سے کھیلتی رہی۔
آج اُس کے چہرے پر صحتمندی کی جھلک تھی، تازگی کی دمک۔ پستئی رنگ کے کپڑوں پر سفید نرم و گرم سویٹر پہنے بہت اچھی لگ رہی تھی۔
''بیٹھنے کو نہیں کہے گا''۔ وہ اپنے مخصوص مدھم لہجے میں بولا۔
مگر ___ اُس نے جیسے واقعی نہ بولنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ خاموش رہی اب بھی۔
''میں سوپ نہیں پلائے گا''۔ اُس نے قریب کی الماری سے کندھا لگایا۔ اُس کے ادھ کھلے پٹ کو ہاتھ سے بند کیا۔ ''پلا بھی نہیں سکتا۔ میرا ہاتھ پر زخم آیا ہے۔ ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا راستے میں''۔
نی شے کا جھکا سر یکبارگی اُٹھا۔ نظریں بے چین سی اِدھر اُدھر اُس پر بھٹکنے لگیں۔
''یہ دیکھو''۔ زار نے پٹی بندھا اپنا ہاتھ دکھایا۔ ''تمہارا بددعا لگا ہے''۔
''اوہ''۔ وہ بے کل سی نظر آنے لگی۔ ''مگر ... میں نے ... یہ تو نہیں چاہا تھا''۔
''تم نے چاہا تھا یا نہیں میم۔ ہم تم کو ضرور چاہتا ہے ...''
بے اختیار نی شے کی نظریں اُٹھیں۔
''ہاں''۔ وہ آرام سے کہنے لگا۔ ''بہت سوچا۔ بہت غور کیا۔ کہیں ہم کو غلطی تو نہیں لگا مگر ___'' وہ بے بسی سے ہنس دیا، خوبصورتی سے کندھے اُچکائے۔ ''ایسا نہیں ہے میں واقعی تم کو چاہتا ہے''۔
نی شے کی پلکیں تیورا کر گر پڑیں۔ اتنا براہ راست اتنی بڑی بات!
''اچھا چھوڑو ___ بتاؤ کیسے رہے اتنے دن؟'' وہ اب بھی وہیں کھڑا تھا۔ صو- کے پاس الماری سے لگا۔

''ٹھیک''۔ وہ اتنا ہی کہہ سکی کہ قوت گویائی سلب ہو رہی تھی۔
''اے''۔ وہ اُس کے صوفے کے بازو پر ٹکتے ہوئے اُس پر قدرے جھک آیا۔ اُس کے چہرے پر سے بالوں کی بے ترتیب لٹ پیچھے ہٹائی۔ ''باتیں کرو نا مجھ سے۔ تمام راستہ میں یہ ہی سوچتا تھا۔ ہم دونوں بات کرے گا کہ میں نے یہ چند دن کیسا گزارا۔ بار بار تمہارا خیال آیا ...'' وہ اُس کے جھکے سر کو اپنائیت سے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
نی شے کچھ دنوں سے اُس کی آنکھوں کی چمک سے اُس کی مسکراہٹوں کی مدھرتا سے ___ کچھ کچھ سمجھ تو رہی تھی مگر ___ اتنا بہت سا اور اتنا یکدم وہ سب کہہ دے گا۔ اِس کی توقع بالکل نہ تھی۔ اور ___
پہلے نہ سہی ___ اِس وقت اُسے بھی احساس ہو رہا تھا اُس کے بھی دل میں زار کے لئے نرم گوشہ پیدا ہو چلا تھا۔ کب؟ کس وقت؟ یہ اندازہ مشکل تھا۔ مگر تھا موجود کہیں ___ پہلے ہی سے!
اور ___ اب زار نے پہل کی تو معلوم ہوا۔ وہ بھی ___ وہ بھی اُسے پسند کرنے لگی تھی۔ نادانستگی میں، غیر شعوری طور پر۔ دھیرے دھیرے آہستہ آہستہ۔
انجام سے بے خبر، نتائج سے بے نیاز ___ وہ انجانے میں اُسی شخص کو من مندر کا دیوتا سمجھ بیٹھی تھی۔ جو اُس کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کا مقروض تھا، جس کے وہ راز جاننے یہاں آئی تھی۔ اور جس سے وہ ہر جگہ اپنی نوکری چھڑوانے کا بدلہ لینے اُس کے گھر تک آ پہنچی تھی۔
''کیا سوچ رہے ہو''۔ وہ اب بھی اُس کے بالکل پاس بیٹھا تھا۔ اُس کی جھکی جھکی پلکوں کو دیکھ رہا تھا۔
اُس کی نظروں میں اپنائیت تھی، پیار تھا، محبت تھی ___ اور نظروں کے سامنے ___ اتنا نازک، اتنا حسین، اتنا دلربا محبوب تھا۔
وہ جھکا ___ اور دھیرے سے اپنے ہونٹ اُس کے ماتھے پر رکھ دیئے۔
نی شے سُن سی رہ گئی۔ جھکتے ہوئے سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔

محظوظ ہوتا۔ زار ہولے سے ہنس دیا۔

"تم ویسے بھی بات آہستہ آہستہ کرتا تھا۔ تھوڑا تھوڑا کرتا تھا۔ اب تو پتہ نہیں کریگا بھی یا نہیں"۔ صوفے کے بازو سے ہٹ کر وہ پھر سے الماری کے پاس کھڑا ہو گیا۔

الماری کا وہی کچھ دیر پہلے والا پٹ پھر سے کھل گیا۔

اور وہ یوں ہی کھلے پٹ میں سے دیکھنے لگا۔

"چارلی، ایسٹی، ٹی روز، انٹیمیٹ، شینل ... پورا پرفیومری ہے یہ تو ..."

پھر اُس کی نظر نچلے خانے پر گئی۔

"یہ گلوز بہت خوبصورت ہے"۔

اور نی شے ___ سب بھول بھال اُٹھتے ہوئے لپک کر اُس کے سامنے آ گئی۔

"نہیں"۔ اُس نے احتجاج کیا۔ ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے الماری بند کر دی۔ اُس کی سب چیزیں اِسی الماری میں رکھی تھیں۔ آخر ایک لڑکی کی کچھ تو پرائیویسی ہوتی ہے۔

"آپ نہیں دیکھیں گے میری الماری"۔

"گلوز ہیں، سکارف ہیں اور ... اور ..." وہ پھر سے چبا چبا کر کہنے لگا۔ پٹ اب بھی پوری طرح بند نہیں ہوا تھا۔

"بس"۔ اُس نے بے اختیار اپنا ہاتھ اُس کے منہ پر رکھ دیا۔

چند لمحے وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ پھر ___ آہستہ سے اُسے دونوں بازوؤں میں بھر لیا۔

اپنے منہ سے اُس کا ہاتھ ہٹایا اور ___ ایک بار پھر ___ ہولے سے اپنے ہونٹ اُس کے ماتھے پر رکھ دیئے۔

نی شے چپ سی کھڑی رہ گئی۔ وہ یوں ہی اُسے شوخ نظروں سے دیکھتا رہا۔

پھر ___ اچانک اُس کی نظر نیچے فرش پر گئی۔

"یہ تصویر کس کا ہے؟" جھکتے ہوئے اُس نے تصویر نیچے سے اُٹھا لی۔

"م ... میرے ... منگیتر کی"۔ اُس نے بتا دیا۔ کہ وہ کچھ اور ہی سمجھ لیتا تو؟

نی شے نے دیکھا۔

اُس کے ہشاش بشاش پرکشش چہرے پر اچانک سیاہیاں چھا گئی تھیں۔ ہنسی بستی دلنشیں آنکھوں میں یکدم چنگاریاں بھر گئی تھیں۔ سحر انگیز شخصیت ہمہ تن چنگھاڑ بن گئی تھی۔

وہ سہم سی گئی۔ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

شعلے اگلتی نظروں سے نی شے کو دیکھتے دیکھتے زار نے تصویر پرے اچھال دی اور ___ ایک بھی لفظ کہے بغیر ___ بڑے بڑے قدم اُٹھاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

خوب ___ کیا تضاد تھا!

ابھی چند لمحے پہلے ___ وہ نرمی، پیار، محبت کا دیوتا تھا اور اب ___ گرمی، غصہ، مجسم آگ تھا۔

وہ شاید صرف Extremes جانتا تھا۔ شروع کا سرا یا پھر آخر کا!

کوئی اعتدال نہ جانتا تھا، کسی میانہ روی سے واقف نہ تھا۔

پیار کی وہ حد ___ جسے پاٹتے شاید مدتیں لگتی ہیں اُس نے لمحوں میں پار کر لی تھی اور ___ غصہ کی وہ سیما ___ جسے پھلانگتے بھی کچھ وقت درکار ہوتا ہے اُس نے پل میں عبور کر لی تھی۔ سب جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔

وہ ___ حیران سی، پریشان سی کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔

پردہ ہٹا کر دیکھا۔

شام کے سائے گھر آئے تھے۔ تاحدِ نظر پھیلی سرسوں اُداس تھی، دور افتادہ درخت چپ چاپ تھے اور ___ اُس پار سرمئی پہاڑ کے پیچھے سے اُبھرتے بگلہ سے سفید بادل خفا خفا سے!

اُس دن کے بعد سے وہ پھر کبھی اُس کی طرف نہیں آیا۔ ایک آدھ بار دادا جان کی طرف کوریڈور میں آتے جاتے سامنا ہوا بھی مگر ـــــ وہ یوں کترا کر نکل گیا جیسے اُسے جانتا تک نہیں تھا۔

وہ ٹوٹ سی گئی۔ کاش! وہ چند لمحے، وہ چند پل، وہ اپنے پیار کا اظہار نہ ہی کرتا۔ وہ جی تو لیتی!

اُس کے اظہار سے قبل وہ تو اپنے جذبوں سے واقف بھی نہ تھی۔ وہ نہ کہتا کچھ تو وہ شاید جان بھی نہ پاتی اپنے جذبے ـــــ زندہ تو رہ لیتی!

اُس کا دعویٰ کہ وہ کسی کے رعب میں آنے والی نہیں تھی، کسی کی غیر ضروری پرواہ نہ کرتی تھی۔ آج اُسے بے معنی سا لگا۔ اُس کا غیظ و غضب دیکھ کر وہ اُس سے سہم بھی گئی

تھی اور ـــــ اُس کی پرواہ بھی کرتی تھی!

شاید اِس لئے کہ ـــــ اُس کا غصہ زیادہ بے وجہ بھی نہیں تھا اور ـــــ وہ اُس سے پیار بھی کرنے لگی تھی مگر ـــــ

وہ تو یوں پاس سے گزر جاتا جیسے کبھی دیکھا تک نہ ہو اُسے۔ پہچانتا ہی نہ ہو۔ وہ آگ بگولہ شاید اِس لئے ہوا تھا کہ اُس کے خیال میں نی شے نے اُسے اندھیرے میں رکھا تھا۔ دھوکہ دیا تھا مگر ـــــ چند پل چند لمحے وہ مہلت تو دیتا، وہ بتا تو سکتی اب اُس کا اپنے منگیتر سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ ذرا بھی گنجائش چھوڑتا تو وہ اُسے بتاتی کہ اُس نے تو اپنے منگیتر کو دیکھا تک نہیں تھا۔ بلکہ ـــــ کاش اُسے بتا سکتی خود اس نے ہی اُس کی صورت اُسے دیکھنے نہیں دی تھی۔

اُس کی چٹان جیسی سنگینی اور پتھر جیسی بے حسی دیکھ کر اُسے اندازہ ہوا۔ وہ واقعی ظالم، بے درد اور بے رحم تھا۔ بھلے درمیان میں چند پل اُس نے اُس کی رحم دلی، خلوص اور ہمدردی کے دیکھے تھے۔

زار کا ایک شادی شدہ دوست جوڑا یہاں سے بیرون ملک شفٹ ہو رہا تھا۔ دادا جان نے آج انہیں ڈنر پر بلایا تھا۔ ساتھ ہی اور بھی کئی لوگ مدعو تھے۔ نی شے کو دادا جان نے خود آ کر انوائیٹ کیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے شرکت کرنا پڑی۔

مرون ریشم کی ساڑھی، نفاست سے بنا بڑا سا جوڑا اور خوبصورت صراحی دار گردن پر یاقوت جڑا زیور پہنے وہ ہال میں داخل ہوئی تو ـــــ

ایک پل کو تو ـــــ چٹان کو بھی جیسے اپنی جگہ سے جنبش ہوئی، پتھر بھی ہل گیا اپنی جگہ سے مگر ـــــ

دوسرے ہی لمحے سنگینی سوا ہو گئی، بے حسی میں اضافہ ہو گیا۔ چوڑے ماتھے پر شکنیں اُبھر آئیں، نظروں میں حقارت اُتر آئی۔ رخ دوبارہ سیڑھیوں کے نزدیک اپنے سامنے کھڑی دو لڑکیوں کی طرف کر لیا۔

وہ آگے بڑھ آئی۔ اِرد گرد دیکھا۔ نزدیک کوئی سیٹ خالی نظر نہیں آ رہی تھی۔

''آپ ـــــ اِدھر آ جائیے پلیز!'' پاس ہی سے ایک نوجوان نے اپنے ساتھی آدمی

کو اُٹھاتے ہوئے اُسے پیشکش کی۔

وہ چلی آئی۔ کیونکہ کئی لوگوں کی نظریں اُسی پر پڑ رہی تھیں اور وہ کنفیوز ڈسی ہوئی جارہی تھی۔

''شکریہ۔'' وہ بیٹھ گئی۔ غیر ارادی طور پر اُس کی نظریں دو چار قدم پر کھڑے زار کی طرف اُٹھیں وہ اُن دونوں کو ہی دیکھ رہا تھا۔

اُس کی محسوسات کیا تھیں؟ یہ وہ نہ دیکھ سکی کیونکہ بہت جلدی اُس نے وہاں سے نظریں ہٹالی تھیں۔

''ہائے ہینڈسم''۔ ایک ستائیس اٹھائیس سالہ ایڈوانس، بے باک سی لڑکی زار کی طرف بڑھی۔ یہ شازیہ تھی، دادا جان کے بزنس پارٹنر کی بیٹی۔

''ہیلو''۔ زار نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا میں نزدیک سے سونگھ سکتی ہوں اِس جادوگر پرفیوم کو''۔ شازیہ نے ہی آگے بڑھ کر اُس کے کوٹ کے کالر پر اپنا چہرہ رکھا۔

کچھ ـــ بیزاری سے وہ قدرے پیچھے ہٹ گیا۔

اور نئے شے کا ذہن میں پچھلے دنوں اچانک سر اُبھارنے والا خیال جھوٹ پڑ گیا۔

زار کا اُس سے بلا تمہید بھرپور اظہار محبت اور پھر بعد میں بھول کر بھی اُس کی خبر لینے پر ـــ اُسے خیال گزرا تھا، بے تحاشا امارت نے اُسے فلرٹ بنا دیا تھا اور ـــ اُس کے علاوہ بھی لڑکیاں اُس کی منظور نظر تھیں۔ پتہ نہیں کیوں؟ اُسے ایک گونہ اطمینان ہوا۔

''کتنی خوبصورت ہیں آپ''۔ وہ چونکی۔ اُس کے قریبی سیٹ پر بیٹھا وہی نوجوان کہہ رہا تھا ''میں قسم اُٹھاتا ہوں اتنی نزاکت اور اتنا حسن میں نے اکٹھا اِس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا''۔

''آپ تمیز سے بات کریں۔ میں اِس قسم کی باتیں سننے کی عادی نہیں''۔ اُس کا رنگ سرخ ہوگیا۔

ایک نظر زار نے پھر اِس طرف دیکھا۔ کان جیسے اِدھر ہی لگے تھے

مگر پھر ـــ جلدی سامنے دیکھنے لگا۔

''سنا ہے آپ کے دادا جان جلد ہی آپ کی شادی کر دینے والے ہیں''۔ ایک اور لڑکی آکر شازیہ کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے زار سے پوچھنے لگی۔

''آپ کو کس نے بتایا؟'' وہ قدرے مسکرایا۔

''میرے پاپا آپ کے دادا جان کے جاننے والے ہیں مائے ڈیئر''۔

''اوہ''۔ وہ خوبصورتی سے کہنے لگا۔ ''ہمارا دادا جان نے کہا آپ کا پاپا سے''۔

''یس ڈیئر۔ اور ـــ وہ لڑکی بھی شاید یہیں کہیں موجود ہے''۔ ایک بار پھر وہ شازیہ کو دیکھنے لگی۔ دوست تھی شاید اُس کی اور کوئی دل کا راز بھی جانتی تھی جیسے اُس کا!

''آپ کچھ نہیں بولتا مس جہانگیر؟''۔ خوبصورتی سے بات بدلتے ہوئے زار پہلے سے موجود دو لڑکیوں میں سے ایک سے مخاطب ہوا۔

''کب ہو رہی ہے شادی آپ کی؟'' وہ مسکرا کر بولی۔

''اوہ۔'' وہ جیسے تھک سا گیا۔ ''آپ بھی وہی بات کریگا''۔

''نہیں ڈارلنگ''۔ مس جہانگیر نے اُس کے انداز کی تھکن اور لب ولہجے کی اجنبیت سے محظوظ سا ہوتے ہوئے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ''میں وہی بات نہیں کروں گی''۔

''دیکھیں۔'' اُس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں سے نکال لیا۔ ''آپ لوگ مجھ کو چھونے کا کوشش مت کریں''۔ وہ خوشگواری سے بولا۔

''کیوں؟''

''دادا جان میرا شادی کر دینے والا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اُس لڑکی سے پہلے مجھ کو کوئی اور چھوئے''۔

''اور اگر میں نے چھو لیا تو؟'' شازیہ بڑے اعتماد سے بولی۔

''اوں ہوں''۔ اُس نے خوبصورتی سے سر نفی میں ہلایا۔ ''آپ ایسا نہیں کرے گا''۔

''اوہ''۔ شازیہ کو اپنی توہین سی لگی، وہ شاید باقی لڑکیوں سے اپنے آپ کو زیادہ

اہم سمجھ رہی تھی۔ ''مگر مجھے اُس لڑکی کی کوئی پروا نہیں''۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے ہاتھ
بڑھا کر زار کے ماتھے پر گھر آئی گھنے ڈارک براؤن بالوں کی لٹ مزید اُلجھا دی۔

''But she does care.'' اب کے زار نے کچھ ناگواری سے اُس
ہاتھ پرے ہٹایا۔ سب کے سامنے ایسی حرکتیں کر کے وہ اُسے Embarrass کر
رہی تھی۔

''کیا وہ یہاں موجود ہے؟'' شازیہ کی دوست کی آواز میں وہ گرمجوشی نہ رہی تھی
زار کے پرکشش نقوش سایوں کی زد میں آ گئے۔ دلنشیں آنکھیں تاریک سی لگ
لگیں۔

''نہیں''۔ دوسرے ہی لمحے اُس نے سختی سے کہا۔

''آپ اپنے کام سے کام رکھیں پلیز۔'' اچانک زار کے کانوں میں نی شے
آواز پڑی۔

مڑ کر دیکھا۔

''وہ ___ آپ کی ساڑھی کا پلو سینڈل میں اٹکا تھا نا''۔ وہی نوجوان کھسیانا کہ
سا کہہ رہا تھا اور ___

نی شے غصے غصے میں سامنے دیکھ رہی تھی۔

زار کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گزر گئے۔ چہرہ تپ اُٹھا، کنپٹیاں
اُٹھیں۔

''تم ___ یہاں سے اُٹھ نہیں سکتا'' وہ برق رفتاری سے وہاں جا پہنچا۔ ''پورا
میں تم کو یہی جگہ نظر آیا''۔ وہ نی شے پر برس پڑا۔

''ایڈیٹ''۔ دانت کچکچاتے ہوئے وہ نوجوان کی طرف پلٹا۔ ''یہاں مہمان
نام سے آیا ہے ورنہ ... میں کبھی کا کہہ چکا ہوتا۔ You get out
here.''

''مجھ کو بعض وقت غصہ آ جاتا ہے۔ آپ تو میرا ایک ہی گرج سے غائب ہو
گا''۔ اُسے اُس کی کئی دن پہلے کی بات یاد آ گئی۔

وہ دہل سی گئی۔ اُٹھ کر وہاں سے دوسری طرف چلدی اور پھر ___ وہاں سے بھی
اُٹھ کر اپنے سویٹ میں چلی آئی۔ کہ کھانے کو اُس کا ویسے بھی دل نہیں کر رہا تھا۔
کپڑے بدل کر وہ بستر میں گھس گئی۔

آج چند نئی باتیں اُس کے مشاہدے میں آئیں تھیں۔ زار ٹپیکل
امیرزادوں کی طرح فلرٹ نہیں تھا۔ باقی لڑکیوں سے بھی لئے دیئے رہتا تھا
اور ___ شاید اب بھی اُس کا خیال تھا اُسے!

یوں ہی خیالوں میں کھوئی وہ ___ سوگئی۔

چھوٹے موٹے کاموں سے فارغ ہو کر وہ دادا جان کی طرف آ گئی۔ حسـ
معمول وہ لان میں دھوپ میں کرسی پر بیٹھے تھے۔ پاس ہی اعجاز کھڑا تھا۔ دادا جان
ہاتھ میں چابیوں کا گچھا تھا اور خود وہ اُلجھے اُلجھے سے تھے۔

"کیا بات ہے دادا جان؟" وہ پاس چلی آئی۔

"بیٹی ہمارے بیڈ روم کے پاس والے کمرے میں الماری لاک ہو گئی۔ اعجا
کہنا ہے کہ اِن چابیوں میں سے اُس پر کوئی نہیں لگتی۔ چلو تم دیکھ آؤ"۔ انہوں نے
اُسے تھمایا۔ "ہمیں کچھ کام ہے اُس الماری میں"۔

"جی اچھا"

"اعجاز تم بھی جاؤ مدد کرو بی بی کی"۔

اعجاز اُس کے ساتھ چلدیا۔ گو اُس دن کے بعد سے جس دن وہ یہاں پہلی بار
اُسے زار کے کمرے تک لے گیا تھا اور پھر دروازے کا پٹ تھامے اُسے گھور رہا تھا،
نی شے کو وہ بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔ ایک آدھ بار اُس نے پھر بھی اُسے آتے جاتے اپنی
طرف گھورتے نوٹ کیا تھا۔ مگر چونکہ اُس کا اُس سے کوئی خاص واسطہ نہ پڑتا تھا اِس
لئے اگنور کر لیا تھا۔

آج پھر وہ اُس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ مگر وہ محتاط تھی۔ کمرے کے اندر بھی وہ اُس
کے ساتھ تھا مگر فاصلے پر کھڑا تھا۔ شاید اُس کی نظریں سمجھ گیا تھا۔

وہ ایک کے بعد ایک چابی آزماتی گئی مگر بے سود۔ معاً اُسے خیال آیا۔ دادا جان
کے بیڈ روم میں چیسٹ پر بھی کچھ چابیاں رکھی تھیں، یہ والی تو شاید تھیں ہی نہیں اِس
کمرے کی الماری کی۔

"اعجاز صاحب۔ پلیز ذرا دادا جان کے بیڈ روم میں چیسٹ پر دیکھئے گا چابیاں
ہیں۔"

وہ چلدیا۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں کی چین میں لگی چابیاں لے آیا۔

نی شے نے لینے کے لئے احتیاط سے ہتھیلی آگے بڑھائی مگر —— اُس کی ہتھیلی پر
چابیاں رکھتے رکھتے جیسے دانستہ اعجاز کی انگلیاں اُسے چھو گئیں۔

"مسٹر اعجاز! You come out of the room" زار تھا، جانے کس
م سے بے وقت آفس سے گھر چلا آیا تھا۔ دروازے میں کھڑا مجسم قہر تھا۔

اعجاز باہر نکل گیا۔

اور —— نی شے لرز کر رہ گئی۔ رات ڈنر پر بھی اُس نوجوان کی باتوں پر اُس کی جیسے
رگوں میں خون اُتر آیا تھا۔ آج —— جانے کیا طوفان آنے والا تھا؟

"تم اپنا سامان چیک کرو۔ and leave this house at once"
لاؤنج میں سے اُس کی گرجتی ہوئی آواز آ رہی تھی۔

نی شے نے کانپتے ہاتھوں سے الماری کے تالے میں چابی گھمائی۔ حواس گرچہ بجا
نہ تھے پھر بھی تکا لگ ہی گیا۔ الماری کھل گئی اور وہ ——

چابیاں ساتھ لئے چپکے سے دوسرے دروازے سے نکل کر دادا جان کے پاس
آ گئی۔

"الماری کھل گئی دادا جان"۔ دھیرے سے کہتے ہوئے اُس نے چابیاں دادا
جان کے آگے میز پر رکھ دیں۔

"یہ ہوئی نا بات"۔ وہ اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے خوشگواری سے کہنے لگے۔"
ہم پہلے ہی کہتے تھے اِس گھر کو تمہاری ضرورت ہے۔ بیٹھو"۔ انہوں نے پاس والی کرسی
کی طرف اشارہ کیا۔

وہ آہستہ سے بیٹھ گئی۔ دل اب بھی دھک دھک کر رہا تھا۔

دادا جان نے اخبار دوبارہ اٹھا لیا اور ___ ایک سیاسی خبر پر اپنی رائے کا اظہار
کرنے لگے۔ وہ ہاں، ہوں، کرتی رہی۔ سمجھ اُسے ایک لفظ کی نہ آ رہی تھی۔

تبھی ___ کرامت بابا آ گئے، کچھ پریشان سے دادا جان کے قریب کھڑے
گئے۔

"کیا بات ہے کرامت"۔ دادا جان نے رخ اُن کی طرف کر لیا۔

"وہ... چھوٹے صاحب آئے تھے..."

"اچھا۔ کچھ بھول گیا ہو گا۔ یا پھر کوئی فائل وغیرہ لینے آیا ہو گا..."

"وہ... انہوں نے اعجاز کو برطرف کر دیا۔"

"کیا مطلب؟" ایک ملازم خاص کے فرائض اعجاز جس خوبی سے نبھا رہا تھا زا
خود بھی اُس کا معترف تھا۔

"پتہ نہیں صاحب مگر ہال میں اُس کی پٹائی بھی کر رہے تھے۔ پھر اعظم اور میں
میں آ گئے..."

"کیا کہہ رہے ہو؟" دادا جان پریشان نظر آنے لگے۔ "تم نے پوچھا کیا ہوا؟"

"صاحب۔ آپ کو معلوم ہے چھوٹے صاحب غصہ میں ہوں تو اُن سے
جواب نہیں کیا جا سکتا"۔

"اوہ۔" دادا جان خاصے پریشان تھے۔ "اعجاز نے بھی کچھ نہیں بتایا؟"

"چھوٹے صاحب نے اُس کو مہلت ہی نہیں دی، باہر سے ہی چلتا کر دیا"۔

"ہوں..." دادا جان قدرے سوچ میں پڑ گئے۔ "ہم پتہ کر لیں گے۔ ملازموں
ے اُس نے کبھی برا برتاؤ نہیں کیا..."

اگر دادا جان کو پتہ چل جائے کہ کچھ عرصہ قبل اُس نے نی شے کے ساتھ کیا برتاؤ کیا
تو؟ نی شے کو اچانک خیال آیا۔

گو ___ اِس واقعہ میں زار حق بجانب تھا، اعجاز کی حرکت غلط تھی۔ یہ الگ
ت ہے کہ سزا دینے کا ہر آدمی کا الگ انداز ہوتا ہے۔ کسی کا کم کسی کا زیادہ اور
ر___ زار تو غصہ میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ مگر ___

اُس نے ایسا کون سا قصور کیا تھا جس کی اُس نے اِس قدر کڑی سزا دی تھی؟۔
ک لڑکی کی شادی تک نہ ہونے دینا کیا کم ظلم تھا؟ کیا وہ ___ ظالم تھا؟

"نہیں۔" دل نے کہا۔ غصہ کا تیز تھا، جلدی آتش پا ہو جاتا تھا مگر غصہ کا اندھا
یں تھا۔ وہ چاہتا تو اُسے بھی برا بھلا کہہ سکتا تھا، ڈانٹ سکتا تھا مگر ___ اُس نے ایسا
یں کیا، جانتا تھا کہ اِس میں اُس کی کوئی غلطی نہیں تھی۔ بغیر کسی وجہ کے وہ کبھی غصہ نہیں
تا تھا۔ کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ضرور تھی۔ پھر ___

اُس کے ساتھ ایسا کیوں کیا تھا؟ اِس کے پیچھے کیا وجہ تھی؟ سوال نے پھر سر اُبھارا۔

اُسے پتہ چل گیا کہ نی شے وہی لڑکی ہے تو؟ تو؟

پھر غصے کا کیا عالم ہو گا؟ باوجود دل میں سامنا کرنے کا عزم لئے اِس وقت اُسے
جھرجھری سی آ گئی۔

وہ چونکی ___ دادا جان پاس رکھے کورڈلیس پر اُس سے بات کر رہے تھے۔ کرامت
آہستہ آہستہ واپس جا رہے تھے۔

"ہوں... ہوں... اوہ... اچھا... اچھا... ٹھیک کیا تم نے... اچھا کیا...
۔ پتہ نہیں کیوں دادا جان کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ 'جانِ دادا ٹھیک کیا تم
نے، ہمیں معلوم ہے تم کوئی غلط کام نہیں کرو گے۔ ہوں... بھول جاؤ بچے۔ او کے...

خدا حافظ''۔ اور انہوں نے بات ختم کر لی۔

تھوڑی دیر جیسے کچھ سوچتے رہے۔ پھر ___

''کسی اور لڑکی کا ساتھ وہ ایسا کرتا تو ہم مار کر سیدھا کر دیتا مگر ___ بات نی شے کا تھا ہم نے نکال دیا اُس کو... '' زار کی بات پر اس وقت پھر اُن کے لب دھیرے سے متبسم ہوئے۔

اپنی رو میں یہ بات کہہ کر اُس نے اُن کے شبے کو تقویت بخشی تھی۔ وہ نی شے کو پسند کرنے لگا تھا!

یہ اُن کی بھی تو عین خواہش تھی۔ اتنی نیک سیرت، خوبصورت اور حیادار تم وہ۔ پاس بیٹھی نی شے اس وقت انہیں اور بھی اچھی لگی۔ تھوڑی دیر چشمہ قدرے نیچے کر کے اُس کے جھکے سر کو اپنائیت سے دیکھتے وہ دھیرے دھیرے مسکراتے رہے۔

''جاؤ بیٹی ___ اندر سے ڈرائے فروٹ لے آؤ مل کر کھائیں گے دونوں دادا پوتی۔'' انہوں نے انتہائی شفقت سے کہا۔

کتنے سویٹ تھے دادا جان۔ اُس واقعہ کو یوں بھلا کر بات کی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

وہ ڈرائے فروٹ لے آئی۔ چلغوزے چھیل چھیل کر دادا جان کو بھی دیتی رہی خود بھی گاہے گاہے کھاتی رہی۔

''یہ ___ زار ___ کیسا لڑکا ہے''۔ باتیں کرتے کرتے دادا جان اچانک بیت داری سے بولے۔

''ج۔ جی؟'' دو چلغوزے چھوٹ کر اُس کے ہاتھ سے نیچے جا گرے۔

''ویسے ہی ___ زار رعب غصے میں رہتا ہے۔ تمہیں اُس سے ڈر وغیرہ نہیں لگتا۔''

''جی... جی پتہ نہیں''۔ اُس سے بات ہی نہ بن پڑ رہی تھی۔

اُن کی نظریں جیسے بتا رہی تھیں وہ کچھ کچھ جان رہے تھے اُن دونوں کے بارے میں مگر ___ انہیں شاید یہ معلوم نہیں تھا کہ زار تو بغیر کچھ کہے سنے ہی

سے قطع تعلق کر بیٹھا تھا۔

''پتہ نہیں سے کام نہیں بنے گا۔ تمہیں پتہ لگا لینا چاہئے۔ وہ کیسا ہے؟ کیا پسند کرتا ہے، کیا ناپسند کرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ''۔ چلغوزے کھاتے کھاتے وہ بہت پیارے انداز میں کہہ رہے تھے۔

وہ چپ رہی، کہتی بھی کیا؟

''وہ برا نہیں ہے، دل کا بہت اچھا ہے، بہت سٹریٹ فارورڈ ہے...'' کہتے کہتے وہ اُس کے جھکے سر اور چپ سے چہرے کو دیکھنے لگے۔ ''ویسے ___ تم کچھ چپ چپ سی ہی ہو آج کل ___ اور زار بھی کچھ اُلجھا اُلجھا سا۔ کوئی ___ اَن بَن تو نہیں''۔

کچھ دنوں سے واقعی انہوں نے محسوس کیا تھا۔ نی شے کے چہرے پر وہ والی طمانیت نہیں رہی تھی۔ اور زار بھی کچھ بجھا بجھا سا رہتا تھا۔

''ن... نہیں تو۔'' اُس نے جلدی سے کہا۔

مگر ___ دادا جان کو شبہ گزرا وہ حقیقت چھپا رہی تھی۔ پھر ___ کچھ سوچتے سوچتے دھیرے سے مسکرائے۔

''ہوتا ہے ایسا۔ اِن دنوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ عمر ہی کچھ ایسی ہوتی ہے...'' وہ جیسے خود سے کہہ رہے تھے۔

وہ تو ___ شاید سب جان رہے تھے۔

''وہ... دادا جان۔ میں اپنی تھنگ لے آؤں''۔ وہاں سے کھسکنے کا سوچنے لگی۔

اور دادا جان اُس کا ارادہ بھانپ گئے۔ آہستہ سے مسکرا دیئے۔

''ہاں ہاں''۔ وہ شفقت سے بولے۔

اور نی شے ___ وہاں سے اُٹھ کر اپنی طرف چلی آئی۔

کھلی کھڑکی سے دور اُس پار دیکھنے لگی۔ تو آج کے واقعات نظروں میں گھومنے لگے۔

صبح اعجاز والا واقعہ۔ زار کا اعجاز کا نی شے کو چابیاں پکڑاتے دیکھ کر آتش پا ہو جانا، اعجاز کی پٹائی پھر نوکری سے برطرف کر دینا ___ پتہ نہیں کیوں دور دل کے کسی گوشے نے

سرگوشی کی اُسے اب بھی اُس کی فکر تھی، اُسے اب بھی اُس کا خیال تھا!

اعجاز نے غلط حرکت کی تھی۔ مگر اُسے تنبیہہ بھی کی جاسکتی تھی، ڈانٹا ڈپٹا بھی جاسکتا تھا۔ اُسے پیٹنا اور نوکری سے نکال دینا۔۔۔ اُس کا نی شے سے کسی تعلق کا ہی تو اظہار کرتا تھا!

دو قدم چل کر وہ دوسری کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔

''یہ۔۔۔ زار کیسا لڑکا ہے''۔ اُسے دادا جان کی بڑی رازداری سے کہی گئی بات یاد آ گئی۔

وہ مسکرادی۔ وہ تو تھے ہی بہت کیوٹ بہت سویٹ۔۔۔ دادا جان ہی کی مالا جپتے اُس نے دور نگاہ کی۔

سرمئی پہاڑ بادلوں میں چھپا جا رہا تھا، دور افتادہ درخت ہوا میں جھوم رہے تھے افق میں پھیلتی گھٹائیں یوں ہر شے کو لپیٹ میں لے رہی تھیں۔۔۔ جیسے، آسمان جھک آ ہو!

دن گزرتے رہے آہستہ آہستہ ہولے ہولے۔ منجمد کر دینے والی سردی کی شدت ذرے کم پڑنے لگی تھی۔ چھوٹے مختصر دن ذرا پھیلنے لگے تھے اور۔۔۔ درختوں کی ننگی چکیلی شاخوں میں کونپلیں آنے لگی تھیں۔

زار اب بھی اُس سے بات نہیں کرتا تھا۔ گو انداز میں وہ سنگینی نہ رہی تھی، نظروں میں وہ بے حسی نہ رہی تھی۔ بلکہ کبھی کبھار۔۔۔ کوریڈور میں سے اُس کے پاس سے گزرتا تو 'گڈ مورننگ'، 'گڈ ایوننگ' بھی کہہ جاتا۔ مگر۔۔۔ نظریں ملائے بغیر، بالکل مشینی انداز میں۔ چہرہ اس قدر سپاٹ ہوتا کہ وہ ہر بار کچھ پڑھنے سے قاصر رہ جاتی۔

اس وقت بھی وہ کوریڈور میں اُس کے پاس سے گزرا تھا، حسب عادت اُسے صبح کا

سلام کیا تھا اور ـــــ اب بھی وہی مشینی انداز تھا، چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

بڑے بڑے قدم اُٹھاتا وہ ہال میں داخل ہوا۔ آفس جانے والا تھا شاید، دادا جان کو حسبِ معمول سلام کرنے آیا تھا غالباً۔

وہ بھی دستک دے کر دادا جان کے کمرے میں آ گئی۔

''آؤ بچے۔'' ہمیشہ کی طرح سفید کپڑے پہنے وہ اپنے مخصوص صوفے پر بیٹھے تھے۔

آگے بڑھ کر اُس نے بھی اپنی سیٹ لے لی۔

''اچھا ہوا تم خود آ گئیں، تم سے کچھ کام بھی تھا۔'' اپنی عینک کا شیشہ صاف کرتے ہوئے انہوں نے ابتدا کی۔

''جی دادا جان''۔

''آج شام زار ایک دو روز کے لئے جا رہا ہے ایک میٹنگ کے سلسلے میں۔ ساتھ میں اُس کا پی اے بھی ہے۔ ہم چاہتے ہیں تم بھی چلی جاؤ...''

''میں؟'' وہ حیرت سے بولی، وہ کیا کرتی وہاں؟

''ہاں۔ تم وہاں جاؤ گی اور وہاں کی مقامی دستکاری کے چند نایاب ڈریسز خرید کر لاؤ گی۔ دراصل اگلے ہفتے ہمارا آدمی جرمنی جا رہا ہے۔ یہ ڈریسز ہم اُس کے ہاتھ اپنے وہاں کے چند دوستوں کی فیملیز کو بھجوانا چاہتے ہیں۔ زار تم جانتی ہو اِس قسم کے کام نہیں جانتا۔ تم نے ہی کرنا ہے یہ کام''۔

وجہ اتنی معقول تھی کہ انکار کی گنجائش نہ تھی اور پھر وہ انکار کرنے کی مجاز بھی نہ تھی مانا کہ اُسے اِن لوگوں نے گھر کے ایک فرد کی حیثیت دے رکھی تھی مگر ـــــ رہتی تو ان کے رحم و کرم پر تھی یہاں۔

''جی اچھا'' وہ آہستہ سے بولی۔

''ہم ٹکٹس کا بندوبست کرتے ہیں۔ کرامت بھی جائے گا، تمہارا خیال رکھے گا۔''

واہ ـــــ زار کی میٹنگ نہ ہوئی پوری پلٹن کی پریڈ ہوئی۔

''جی۔'' اُس نے اپنی مسکراہٹ بمشکل روکی۔

دادا جان اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ڈریسنگ روم میں جانے لگے۔

''اور وہاں۔ زار سے ڈرنے ورنے کی کوئی ضرورت نہیں''۔ بیچ راستے میں رک کر وہ اُس کی طرف پلٹے۔

وہ ـــــ چپکے سے مسکرادی۔ نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ دادا جان اُسے بغور دیکھتے دھیرے دھیرے مسکرا رہے تھے۔

''اگر وہ میٹنگ پر جا رہا ہے تو تم بھی ہمارے کام سے جا رہی ہو۔ رعب وعب میں مت آنا''۔

کہیں ـــــ ڈریسز منگوانے کی آڑ میں دادا جان اُسکو اور زار کو...

پتہ نہیں ـــــ اُس نے خیال جھٹکا مگر ـــــ

مسکرادی۔ کہ دادا جان کچھ بھی کر سکتے تھے۔ کوئی بھی توقع کی جا سکتی تھی اُن سے۔

وہ ڈریسنگ روم میں گئے۔ اور نی شے اپنے سویٹ میں آ گئی۔

شام چار بجے وہ جلدی جلدی سوٹ کیس میں کپڑے رکھنے لگی۔ گرم کپڑے، سویٹرز، کوٹ، جرابیں، دستانے۔ کہ وہاں آج کل بھی برف جمی ہوئی تھی۔

نیلی زمین پر رنگ برنگے پھولوں والے خوبصورت کپڑے پہن کر اُس نے نیلا ہی ہلکا سا سویٹر پہنا، ہمرنگ جوتے اور ہمرنگ دوپٹہ لیا۔ بالوں کی ڈھیلی سی چوٹی بنائی، اپنی پسندیدہ پرفیوم لگاتے لگاتے اُسے خیال آیا۔

زار کیا اُس کا ساتھ گوارا کرے گا؟ اگر نہیں تو کیا وہ ایک لمحہ بھی اُس کی ہمراہی میں گزار پائے گی؟

مقررہ وقت پر پہلی گاڑی میں زار کا پی اے اور کرامت بابا اور دوسری میں نی شے اور زار ائیرپورٹ کی طرف چل دیئے۔

زار خاموش تھا کہ اُسے بھی دادا جان کا حکم ماننا پڑ رہا تھا۔ جواز اتنا معقول تھا کہ وہ کوئی بہانہ نہیں بنا سکا تھا۔ اور پھر مانا کہ وہ جانِ دادا تھا مگر اُن کی حکم عدولی کی اُس میں تاب نہ تھی۔

دونوں پلین کے اندر داخل ہوئے۔

نشستوں کے پاس پہنچ کر زار رک گیا۔ اُسے آگے جانے دیا کھڑکی والی سیٹ پر۔ دوسری پر وہ خود بیٹھ گیا۔ چپ چپ سا۔

جہاز اوپر اُٹھا اور پھر فضا میں لیول ہو گیا۔

ایئر ہوسٹس چائے اور کوفی لے کر آ گئی۔

''کوفی پلیز!'' زار نے کہا۔ اور اپنے آگے کی ٹرے کھول لی۔

ایئر ہوسٹس نے اُس کے سامنے چھوٹی سی ٹرے میں کپ اور سنیک رکھا اور کپ میں کوفی انڈیلنے لگی۔

نی شے بے نیازی سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

''آپ؟'' زار کے بعد ہوسٹس نے اُسے مخاطب کرنا چاہا مگر ــــ

وہ اب بھی محو تھی۔ نیچے پھیلے بادلوں کو دیکھ رہی تھی۔

زار نے ایک اُچٹتی نظر اُس پر ڈالی ــــ رخ خاموشی سے واپس ہوسٹس کی طرف کیا۔

''کوفی۔'' اُس کی جگہ بھی وہ ہی بولا۔

ایئر ہوسٹس نے کپ میں کوفی بھر کر ٹرے زار کو ہی پکڑائی اور آگے بڑھ گئی۔

زار نے پھر ایک نظر اُسے دیکھا۔ اُس کا رخ اب بھی باہر کی طرف تھا۔

ایک جھنجلائی سی سانس لیتے ہوئے اُس نے ہاتھ بڑھا کر اُس کے آگے کی ٹرے کھول لی۔

تبھی ــــ نی شے کی محویت ٹوٹی۔ اندر دیکھا۔

زار نے اُس کے سامنے کوفی کی ٹرے رکھی۔

''اپنا کام خود کرو۔'' اُس کی طرف دیکھے بغیر وہ جھنجلایا جھنجلایا سا بولا۔

مگر ــــ وہ چونکی۔

اُس کے لہجے میں جیسے محض جھنجلاہٹ نہ تھی۔ کچھ خفگی کی بھی جھلک تھی اُس میں کچھ ناراضگی بھی تھی جیسے۔

اُس سے وہ بہت معصوم سا لگ رہا تھا، بچہ سا ــــ روٹھا روٹھا سا، جھنجلایا جھنجلایا سا۔

وہ چپکے سے مسکرا دی۔ اچانک ہی جیسے اُسے کھوئے خزانے مل گئے ہوں۔

اُس کی سوچ کے بالکل برعکس اس وقت اُس کا انداز مشینی نہیں تھا، چہرہ سپاٹ نہیں نا۔ انداز گوشت پوست کے انسانوں کا تھا، چہرہ روٹھے پن کے لطیف جذبات لئے نا۔ وہ باخبر تھا یا نہیں یہ الگ بات تھی!

پچھلے دنوں وہ شاید اُس پر غصہ تھا کہ کیوں اُس نے اُسے اپنی منگنی کے متعلق نہیں نایا تھا؟ یا پھر ــــ شاید اِس لئے کہ اُس کی منگنی ہی کیوں ہوئی تھی تب وہ سنگین تھا، بے س تھا۔

بعد میں شاید سوچ لیا تھا کہ دونوں صورتوں میں اُس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اُس نے ے منگنی کا نہیں بتایا تھا اِس لئے کہ اُس سے قبل زار نے اپنی محبت کا اظہار بھی نہیں کیا نا۔ اور ــــ اُس کی منگنی ہی کیوں ہوئی تھی؟ اِس میں بھی اُس کا کوئی دوش نہیں تھا کہ ب وہ زار سے ملی بھی نہیں تھی۔ تب اُس کی سنگینی معدوم ہو گئی تھی، بے حسی جاتی رہی تی اور ــــ اب شاید ــــ یہ سوچ لیا تھا کہ ایک ایسی بات پر جس میں دونوں کا کوئی بس نہ چلتا تھا ایک دوسرے کے ساتھ سفر کے دوران بات نہ کرنا کچھ اچھا نہیں لگتا تھا، زیادہ لکن بھی نہیں تھا۔

اِس وقت چپ چپ سا، جھنجلایا جھنجلایا سا تھا۔ چپ چپ اِس لئے کہ اُس کی الت میں وہ کسی اور کی ملکیت تھی اور ــــ جھنجلایا جھنجلایا سا اِس لئے کہ ــــ منگنی کی ات اپنی جگہ ہونے کے باوجود وہ ــــ اُس سے منسلک تھا۔ ایسے کہ اُسے پا بھی نہیں لکا تھا اور ایسے کہ ــــ اُسے چھوڑا بھی نہیں جا رہا تھا۔

دفعتاً جہاز ڈول سا گیا۔ گھبرا کر نی شے نے اگلی سیٹ کی پشت تھام لی۔

زار نے ایک نظر اُسے دیکھا۔ پھر سامنے دیکھنے لگا۔

جہاز بار بار ہچکولے کھانے لگا۔ نی شے سخت گھبرائی اپنے سے اگلی نشست کی پشت بوطی سے پکڑے تھی۔

تبھی ایئر ہوسٹس نے مائیک پر اعلان کیا۔

موسم کی خرابی کی وجہ سے جہاز اپنی منزل مقصود پر لینڈ نہیں کر سکتا تھا۔ بلکہ اب وہ

لوگ کسی اور شہر جا کر اُترنے والے تھا۔ مزید کہ موسم ٹھیک ہونے تک اُن لوگوں نے
وہیں قیام کرنا تھا...

اور ـــ بے اختیار نی شے کی نظریں زار پر جا ٹکیں۔

مبہم سی مسکراہٹ ہونٹوں میں دباتے ہوئے اُس نے رخ دوسری طرف کر لیا۔

''اب کیا ہوگا؟'' وہ سخت خوفزدہ تھی۔

زار رخ واپس کرتے ہوئے سامنے دیکھنے لگا۔

''مجھے ڈر لگ رہا ہے''۔ نی شے اُسے دیکھتے ہوئے مزید بولی۔

زار کچھ نہیں بولا۔ بلکہ اُسے جیسے ایک گونہ اطمینان ہو رہا تھا۔

ایک بار جہاز نے اور زور سے ہچکولہ کھایا۔ اور ـــ

''یہ تو... یہ تو...'' غیر اِرادی طور پر اپنا ہاتھ اگلی سیٹ سے ہٹا کر اُس نے زار کا
بازو پکڑ لیا۔

زار نے اپنے بازو کی طرف دیکھا، پھر اُس کو۔

''ہاتھ ہٹاؤ'' وہ اپنے بازو پر رکھے اُس کے ہاتھ کو دیکھتے دیکھتے بولا۔

اور ـــ نی شے نے بیچارگی سے وہاں سے ہاتھ ہٹا لیا۔

''ہم لوگ... کب تک وہاں رہیں گے؟'' نی شے نے سہمے سہمے سے لہجے میں
پوچھا۔

''نہیں معلوم۔'' رکھائی سے کہتے ہوئے وہ پھر سامنے دیکھنے لگا۔

''آپ بہت... بے حس ہیں''۔ اِس مصیبت کے موقعہ پر بھی وہ پچھلی باتوا
کو لئے بیٹھا تھا۔

''ٹھیک ہوں جیسا بھی ہوں''۔

اب جہاز آہستہ آہستہ ہموار ہو رہا تھا۔ باقی لوگوں نے بھی نجات کی سانس لی۔

''میں نے یہ شہر پہلے کبھی نہیں دیکھا۔'' نی شے نے اپنے مخصوص آہستہ آہستہ اند
میں باتوں کی ابتدا کرنے کی خاطر کہا۔ ورنہ تو اُس نے یہاں دو شہروں کے علاوہ ا
دیکھے ہی کب تھے۔

''تم... تم نے تو بس ایک ہی چیز دیکھا ہے''۔ اُس کے لہجے میں طنز سا چھپا تھا۔

''کیا؟'' وہ خوش ہوئی وہ بولا تو۔

''تمہارا منگیتر۔'' وہ سامنے دیکھ رہا تھا۔

اُس کے لب و لہجے پر وہ کھل کر مسکرا بھی نہ سکی کہ اُسے مسکراتے دیکھ کر وہ جو تھوڑی
بہت بات کرنے لگا تھا وہ بھی کرنا چھوڑ دیتا۔

تھوڑی دیر دونوں طرف خاموشی چھائی رہی۔ وہ جھنجلایا جھنجھلایا سا تھا اور
نی شے ـــ دنوں بعد بہت خوش!

''دس بج چکے ہیں''۔ نی شے نے گھڑی دیکھتے ہوئے ایک بار پھر بات چھیڑی۔

وہی نرم و ملائم لہجہ وہی ہولے ہولے آہستہ رفتار۔

''کیوں۔ جلدی کس بات کا ہے؟'' اُس کا لہجہ اب بھی درشتگی لئے تھا۔

''کچھ نہیں۔ نیند آ رہی ہے''۔ اُس کے لہجے سے وہ پھر سہم گئی۔

''سو جائے گا۔ زیادہ شور کرنے کا ضرورت نہیں''۔ اُس نے اپنے سامنے اٹکا
اخبار اُٹھا لیا۔ صبح دیکھ چکا تھا یہ اخبار ـــ خواہ مخواہ نظریں دوڑانے لگا۔

''ایک منٹ''۔ وہ صفحہ پلٹنے لگا تو نی شے وہی صفحہ پیچھے سے دیکھتے دیکھتے بول
پڑی۔

''کیا ہے؟''

''کارٹون دیکھ رہی تھی''۔ وہی آہستہ، ملائم اور سہما سا انداز۔

اور زار نے وہی صفحہ اپنے سامنے کر لیا۔

''ہمہ ـــ بالکل ویسا ہے''۔

''کیسا؟''

''تمہارا منگیتر کی طرح''۔

اور ـــ نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے ہنسی آ گئی۔

''ہنستا کیوں ہے؟''

''غلطی ہو گئی''۔ ملائم لہجے میں سہم کے ساتھ خفگی بھی گھل مل گئی۔

اوراب کے۔۔۔ بڑی دیر بعد۔۔۔ وہ اُس کے لب و لہجے پر ہنس دیا۔

''شادی کب ہو رہا ہے تمہارا؟'' اُس کا لہجہ قدرے دوستانہ ہو گیا۔

''نہیں معلوم''۔ اُس نے رُخ کھڑکی کی طرف کر لیا۔ پہلے کیسا بات بات پر کرخت ہو رہا تھا۔

''یہ۔۔۔ انگوٹھی...'' اُس کی خفگی کا ہی ردِعمل تھا شاید، وہ نرم پڑتا گیا، سیٹ کے بازو پر رکھے اس کے ہاتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا، ''تمہارا منگنی کا ہے؟''

''نہیں۔'' انگوٹھی تو وہ اُسی دن اُتار چکی تھی۔ جب پہاڑ پر چوکیدار کا بھانجا زمان اُس کی سسرال والوں کی طرف سے اُس کے رد ہونے کی خبر لایا تھا۔

''وہ کیوں نہیں پہنتا؟''

''بس نہیں پہنتا۔'' واپس رخ اُس کی طرف کرتے ہوئے جانے کیسے وہ اُسی کے سے پختون لب و لہجے میں بولی۔

اور۔۔۔ زار سامنے دیکھتے ہوئے مسکرا دیا۔

''ہمارا۔۔۔ اردو پر ہنستی ہے''۔

''نہیں۔'' اُس کی بڑی بڑی شربتی آنکھوں میں اب بھی ناراضگی تھی۔ ''ویسے یہ ہماری قومی زبان ہے''۔

''اِس لئے تو سیکھا ہے۔ ورنہ ہمارا مادری زبان پشتو ہے''۔

''مجھے پتہ ہے۔ اِسی لئے تو اُردو بھی پشتو میں بولتے ہیں''۔ پھولا پھولا منہ لئے وہ بولتی جا رہی تھی۔

''میں ماروں گا''۔

''میں رو دوں گی''۔ وہ اُس بچے کی طرح بولی جو رونے سے پہلے منہ بسور کر رونے کی دھمکی دے۔

چند ثانیے وہ اُس کی ناراض ناراض آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

''اور مجھ کو بالکل ترس نہیں آئے گا۔ "Because I hate you." وہ اچانک سیریس ہو گیا۔ مگر۔۔۔

کیا ایسا ہی تھا؟ اُس کی آنکھیں اُس کی بات کا تو ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔

جہاز لینڈ کر چکا تھا۔

باقی مسافروں کے ہمراہ وہ دونوں بھی پینجرز لاؤنج میں آ گئے۔

پھر۔۔۔ آگے چل کر کنویئر بیلٹ کے پاس کھڑے ہو کر وہ اپنے اپنے سوٹ کیس کا نظار کرنے لگے۔

پہلے زار کا آ رہا تھا۔ اُس نے اُتار لیا۔ دو چار چیزوں کے بعد نی شے کا آ رہا تھا۔

اُس نے ایک نظر زار کو دیکھا، پھر سوٹ کیس کو، پھر زار کو۔۔۔ کہ اُس کا سوٹ کیس ا بھاری تھا، اُس کو اُٹھانے کی اُسے ہمت نہ ہو رہی تھی۔

اور۔۔۔ زار سامنے دیکھنے لگا۔ ہونٹوں پر آئی مبہم سی مسکراہٹ صاف چھپا گیا۔

نی شے کا سوٹ کیس آ کر گزر گیا۔ وہ دیکھتی رہ گئی۔ بے بسی سے۔

تھوڑی دیر بعد چکر کاٹ کر وہ پھر پاس آنے لگا تھا۔

''زار پلیز! میری مدد کریں میں اکیلی نہیں اُٹھا سکوں گی''۔ پتہ نہیں کیسے اُس کا نام ں کی زبان پہ آ گیا۔ اب کے اُس نے پیشگی درخواست کی اُس سے۔

''زار نہیں۔۔۔ مسٹر زار کہو۔ اور دوسرا یہ ہے کہ میں۔۔۔ نہیں اُٹھاؤں گا''۔

اور... اِسی اثناء میں سوٹ کیس ایک بار پھر اُس کے سامنے سے گھوم کر واپس چلا یا۔

نی شے نے اِدھر اُدھر دیکھا، کرامت بابا بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ زار کا پی اے کی شاید بھیڑ میں کہیں گم تھا۔

''پلیز!'' اُس نے پھر زار کا سہارا لیا۔

''نہیں''۔

''کیوں؟''

''بس۔۔۔ نہ میں تمہارا بوجھ اُٹھا سکتا ہے''۔ اُس کا اشارہ ایک بار اوران کی طرف اور اُن نی شے کے سوٹ کیس کی طرف تھا۔ ''اور نہ تمہارا منگیتر کا''۔ اب کے اُس اشارہ خود نی شے کی طرف تھا۔

معاً اُس کا سوٹ کیس پاس آ گیا۔ ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے زار نے آرام سے
اُتار لیا۔

''بات کرتا ہے''۔ ہاتھ جھاڑتے ہوئے وہ نظروں ہی نظروں میں اپنے پی اے
اور کرامت بابا کو تلاش کرنے لگا۔

پھر اُسے ۔۔۔ اپنا پی اے تو تیزی سے اپنی طرف آتا دکھائی دیا مگر ۔۔۔ کرامت
بابا اب بھی دور مسافروں اور سامان میں گھرے کھڑے تھے۔

''ویسے ۔۔۔ کچھ معلوم ہوا دادا جان نے کس خوشی میں اپنے بچپن کے دوست
قربانی دے کر یہاں بھیجا''۔ وہ اب بھی اُدھر ہی دیکھ رہا تھا۔

ایئر لائین کی بس انہیں خوبصورت ہوٹیل میں لے آئی۔

وہ اور نی شے لوبی میں بیٹھے تھے۔ زار کا پی اے اور کرامت بابا کمروں کی بک
میں مصروف تھے۔

وہ جب بھی کسی کاروباری ٹوئر پر جاتا۔ اُس کا پی اے ہمیشہ اُس کی مدد کے
اُس کے پاس والے کمرے میں ٹھہرتا۔ مگر آج ۔۔۔

جانے کیوں وہ نہیں چاہتا تھا وہ قریب کہیں ٹھہرے۔

مبادا وہ اُس کے اور نی شے کے درمیان کچھ نوٹ کرے۔ ماتھے پر آئی معمو
شکن، ہونٹوں پر اُبھری غیر محسوس مسکراہٹ بھی تو بعض وقت بہت کچھ سمجھا دیتی ہے
اور وہ کوئی سکینڈل نہیں چاہتا تھا۔ خاص طور سے اِس قسم کی کوئی بھی بات نی شے
لئے مشکل پیدا کر سکتی تھی۔

بہر حال پی اے پاس آ گیا۔ اُس نے واقعی اُن کے لئے چوتھی اور اپ
تیسری منزل پر کمرے پسند کر لئے تھے۔ شاید خود خیال آیا تھا کہ اُس کے ساتھ کم
لڑکی تھی۔ یا پھر اُس کو نچلی منزل پر بھیجنے میں کرامت بابا کا ہاتھ تھا۔ مگر ۔۔۔

کرامت بابا نے خود اُن کے ساتھ وہیں اوپر کمرہ لے لیا تھا۔

وہ سمجھ رہا تھا یہ سب پلان دادا جان کا تھا۔ اُس کا وہیں ماتھا ٹھنکا تھا جب دادا
نے بتایا تھا کہ کرامت بابا بھی ساتھ جائیں گے۔ کمرہ اُن کے ساتھ لے لینے کی

انہیں کی پڑھائی ہوئی لگتی تھی۔ اُسے دل ہی دل میں ہنسی آئی۔ کرامت بابا کو اُس کی
اور نی شے کی رکھوالی کرنے بھیجا گیا تھا۔ گو بہانہ بڑا معقول تھا نی شے کا خیال رکھنے کا!
مگر اوپر جا کر ۔۔۔ وہ اور بھی زور سے چونکا۔ جب اُسے پتہ چلا کرامت بابا کا کمرہ
نی شے اور زار کے کمروں کے بیچوں بیچ واقع تھا۔

یہ بھی یقیناً دادا جان کا حکم تھا۔

مگر ۔۔۔ دادا جان کو شاید یہ معلوم نہ تھا کہ نی شے کے جملہ حقوق کسی اور کے حق
محفوظ تھے اور اُسے کسی اور کا حق اُٹھا لے جانے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ اُس نے تلخی سے
سوچا۔

تھوڑی سی اُسے اپنے پی اے اور کرامت بابا سے خفت سی بھی محسوس ہوئی۔ کیا
سوچ رہے ہوں گے وہ لوگ مگر ۔۔۔ پھر ۔۔۔ جیسے دادا جان اِس وقت بھی اپنے پلان پر
خوش خوش دھیرے دھیرے مسکرا رہے تھے۔ وہ ہر بات بھول گیا۔ اپنے دادا پر پیار
آنے لگا، ٹھیک کیا تھا انہوں نے جو بھی کیا تھا۔

آگے بڑھ کر وہ اپنے کمرے میں گھس گیا۔ رات کا کھانا کھاتے ہی وہ لوگ سو
گئے۔ کیونکہ زار سارے دن کا تھکا ہوا تھا اور نی شے کو حسب عادت نیند آ رہی تھی۔

یہاں موسم معتدل تھا۔ اُس کے ڈریسز ظفر نے یقیناً گرم رکھے ہوں گے
رات ہی اُس کا پی اے دادا جان کو موسم کی خرابی کی وجہ سے اُن لوگوں کی یہاں آمد
اطلاع دینے لگا تھا تو اُس نے صبح تڑکے کی فلائٹ سے اپنے ہلکے کپڑے منگوا لئے تھے
نی شے سے بھی پوچھا تھا مگر اُس نے کہا تھا وہ گزارا چلا لے گی۔

صبح نہانے کے بعد وہ تیار رہا۔ نیچے ڈائننگ ہال میں ناشتہ کرنے جانے لگا تو ایک
پل کو غیر ارادی طور پر نی شے کے دروازے پر رکا مگر ـــــ پھر سوچا سو رہی ہوگی۔ اُسے
ڈسٹرب نہیں کرنا چاہئے تھا۔

ناشتہ کر کے وہ دوبارہ اوپر آ گیا۔ کمرے میں آ کر تھوڑی دیر یوں ہی بلا مقصد کھ
کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ ٹریفک، شور، وہ مڑا اور ـــــ بستر پر آ کر اوندھا لیٹ گیا۔

تھوڑی دیر یوں ہی پڑا رہا۔ پھر سیدھا ہوا۔ دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھ کر
اِردگرد دیکھتا رہا۔ دوبارہ اوندھا لیٹا۔ چند لمحوں میں پھر بور ہو گیا۔ کروٹ لے کر کہنی
کے بل لیٹا۔

“Hell...” وہ اُٹھ گیا۔ “بیکاری بھی کیا چیز ہے”۔ وہ بڑبڑایا کہ دن کو تو عام
حالات میں اُس کے روٹین میں پانچ منٹ بھی کہیں نہ کہیں فکس ہوتے تھے۔

دروازہ کھول کر وہ کوریڈور میں نکل آیا۔ سامنے ہی تازہ اخبار لگے ہوئے تھے۔
خوش ہوتے ہوئے آگے بڑھا۔

تبھی ـــــ اُس نے دیکھا۔ بیرا نی شے کے کمرے میں ناشتہ دے رہا تھا۔ اخبار
اُٹھاتے اُٹھاتے وہ جیسے ایک پل کو سوچ میں پڑ گیا اور پھر ـــــ قدم خود بخود اُس کے
دروازے کی طرف بڑھے۔

“ٹھک ٹھک”۔ اُس نے دستک دی۔ ایک نظر اُس نے کرامت بابا کے کمرے پر
بھی ڈالی، کہیں اُس پر مکمل کرفیو تو نہیں لگا تھا؟ مخصوص دھیمی مسکراہٹ اُس کے لبوں کو
چھو کر گزر گئی۔

“یس۔” اندر سے آواز آئی۔

اور وہ ـــــ کمرے میں داخل ہو گیا۔

“گڈ مورننگ میم”۔ اُس کا لب ولہجہ بالکل دوستانہ تھا۔

“ہیلو۔” اُسے غیر متوقع دیکھ کر اُسے خوشی کے ساتھ حیرت بھی ہوئی۔

وہ آگے بڑھ آیا۔ نی شے شاید نہائی تھی۔ بال تولیے میں لپیٹے تھی۔ اُس کے آگے
ٹرے پر ناشتہ لگا تھا اور وہ بس شروع ہی کرنے والی تھی۔

“کیا ہم یہاں بیٹھ کر اخبار دیکھ سکتا ہے”۔

“جی۔” وہ اور کہتی بھی کیا؟

“تھینک یو۔” وہ اُس کے دائیں طرف کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر میں جلدی جلدی تمام صفحات کی سرخیاں دیکھ لیں۔

پھر ـــــ اُنہی سرخیوں میں سے کچھ کی تفصیل پڑھ ڈالی۔ اور اب وہ یوں ہی صفحے

الٹ پلٹ کر کے چھوٹی موٹی خبروں پر نظریں دوڑا رہا تھا۔

"تم ___ رات کو ٹھیک سے سویا"۔ وہ اب بھی اخبار پر نظریں جمائے تھا۔

"جی۔" اپنے آگے نیپکن بچھاتے ہوئے اُس نے آہستہ سے کہا۔

"تمہارا باڈی گارڈ رات کو..." وہ 'چوکس' لفظ نہیں جانتا تھا۔ اٹک کر رہ گیا۔

"میرا مطلب ہے رات کو وہ ___ جاگتا تو رہا نا۔" اُس نے 'جاگتا' پر ہی اکتفا کیا۔

"رات کو کیوں جاگتا؟" ہنسی روکتے ہوئے وہ انجان بن گئی۔

"بھئی۔ میرا مطلب ہے رات کو اُس نے تمہارا خیال رکھا؟" اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے وہ اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ "تمہارا خیال رکھنے کو آیا ہے نا"۔ اُس کے آخری جملے میں دادا جان کے پلان پر لطیف سی چوٹ تھی۔

"میں تو سو رہی تھی"۔ نی شے نے خوبصورتی سے کندھے اُچکائے۔ وہ بھی اُسے چڑا رہی تھی۔

"میں بھی کل شام سے دیکھ رہا ہے پلین میں بیٹھنے سے لے کر اِس وقت تک اُسے تمہارا خیال آیا ہی نہیں۔ بیچارا تمہارا سوٹ کیس لیے لیے چکر کاٹ رہا تھا..."

"ٹھک ٹھک ٹھک"۔ دروازے پر دستک ہوئی۔

"آ جائیں"۔ نی شے نے کہا۔

کرامت بابا تھے۔ سر اندر ڈال کر ایک نظر اردگرد ڈالی۔ جوں ہی نظر زار پر پڑی وہ جیسے ایک لمحے کو ساکت سے ہو گئے۔

"کیا بات ہے کرامت بابا"۔ ہنسی ضبط کرتے ہوئے زار نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ جلدی سے بولے۔

"کچھ تو ہے"۔

"وہ... مردانہ آواز آ رہی تھی... میں نے کہا..." وہ واپس چل دیئے۔

اور زار ___ خوبصورتی سے ہنسنے لگا۔

"آپ... ناشتہ کریں گے"۔ نی شے نے دھیرے سے پوچھا

"نو تھینک یو۔ میں کر چکا ہوں"۔

"چائے پئیں گے؟"

جھکی جھکی نظریں، ملائم لب و لہجہ، رفتار دھیمی دھیمی۔

"ہاں۔ پی لوں گا"۔ وہ انکار نہ کر سکا۔ "مگر ___ تم کیا کرو گے؟"

پیالی تو ایک ہی تھی۔

"آپ پی لیں۔ میں تو ویسے بھی ناشتہ کروں گی پہلے"۔

"ٹھیک ہے بنا دو"۔

"آپ... خود... بنا لیں"۔ پتہ نہیں کیوں آج اُسے تنگ کرنے میں اُسے مزا آ رہا تھا۔

"اوہ ___" وہ چونکا۔ پھر دھیرے سے مسکرا دیا۔ "لاؤ ___ بنا لیتا ہے"۔ اُس نے پیالی اپنے قریب کر لی۔

چائے ڈالی، پھر دو چار قطرے دودھ کے ٹپکائے اور چمچ چلا کر پیالی ہونٹوں سے لگا لی۔

"یہ... چائے ہے؟" وہ غور سے اُسے سب کرتے دیکھ رہی تھی۔

"تم کو کیا لگتا ہے۔" وہ مسکرا دیا۔

"چینی تو ڈالیں"۔

اُس نے چپ چاپ کپ میز پر رکھ دیا۔

"یہ ___ اُٹھاؤ"۔ اُس کا اِشارہ چینی دان کے ڈھکن کی طرف تھا۔

"کیا؟" وہ جان بوجھ کر انجان بن رہی تھی۔ اُسے اٹکتے یا کوئی اور لفظ گھسیٹتے اُسے اچھا لگتا تھا۔

"یہ ___ شوگر پاٹ کا اوپر سے..." وہ اُس کی چھیڑ خانی سمجھ رہا تھا۔ مگر کیا کرتا کہ ہاں واقعی اُس سے مات کھا گیا تھا۔

"شوگر پاٹ کے اوپر کیا ہے؟" وہ باز نہیں آ رہی تھی۔

"تمہارا منگیتر۔" ہاتھ بڑھا کر اُس نے ڈھکن اُٹھا کر نیچے رکھ دیا۔ تھوڑی سی چینی پیالی میں ڈالی اور چمچ چلانے لگا۔

''اب اِس کو واپس اپنا جگہ پر رکھو''۔

اُس نے واپس نہیں رکھا۔ خاموشی سے اُسے تکتی رہی۔ اُس نے پھر اُس کے منگیتر کا ذکر چھیڑا تھا۔ کوئی اور بات بھی تو ہو سکتی تھی ــــ اُس سے ہٹ کر اُس سے پرے۔

''لاؤ ہم رکھ دیتا ہے ورنہ تم خفا ہو جائے گی کہ ہمارا منگیتر کو واپس اپنا جگہ نہیں رکھا۔'' اُس نے ڈھکن دوبارہ چینی دان پر رکھ دیا۔

''منگیتر، منگیتر... بھاڑ میں جائے میرا منگیتر۔'' وہ اچانک بولی۔ پتہ نہیں کیوں؟ نی شے چاہتی تھی وہ کوئی اور بات کرے۔ جو اُس کے اور زار کے متعلق ہو۔ کسی اور کا ذکر نہ آئے بیچ میں۔

''دیکھو ــــ ہم نے پہلا بھی کہا تھا مشکل اُردو نہیں چلے گا ہمارا ساتھ''۔ اُس نے واقعی پہلے بھی ایک بار نی شے سے صاف صاف کہہ دیا تھا وہ اردو میں مشکل الفاظ کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ''کیا مطلب ہے بھاڑ کا؟''

''جہنم ــــ جہنم میں جائے میرا منگیتر۔'' اُس نے اپنے مخصوص دھیرے دھیرے انداز میں کہا۔

اور ــــ زار مسکرا دیا۔ تیزی کے بول بولنا تو اُس کے بس میں ہی نہیں تھا جیسے۔

''اور جس دن وہ چلا جائے جہنم میں، ہم کو بتا دو ہم اُسی دن تم سے شادی کر لیگا''۔ اُس کی آنکھوں میں دیکھتے دیکھتے اُس نے کہا۔

نی شے کی پلکیں یکبارگی جھک گئیں۔ آہستہ آہستہ ٹوسٹ پر مکھن لگانے لگی۔

زار چند لمحے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر گھونٹ گھونٹ کر کے چائے حلق سے اُتارنے لگا۔

''لیکن تم ــــ حقیقت میں ایسا نہیں چاہتی۔ اپنے منگیتر کو چاہتی ہے تم''۔ وہ اپنے کپ میں چائے کو گھور رہا تھا۔ ''میں ہی بیوقوف تھا''۔ اُس نے گہری سانس لی۔ آخری گھونٹ لے کر خالی کپ میز پر رکھ دیا۔ ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ اُبھر آئی۔

''پچھلے دنوں تو میں سوچ رہا تھا گھر سے کہیں چلا جائے۔ نہیں دیکھ سکتا تھا میں تم کو ــــ پھر سوچا دادا جان کو کہکر تم کو ــــ بس جواب دے دے مگر ــــ ہہہ دادا جان! دادا تو تم کو Love کرتا ہے Love۔ پہلے ہی تمہارا واسطے دو خاتون کو رخصت کر دیا تھا

کہیں ہم کو ہی کہہ دیتا ــــ جاؤ...''

''میرے لئے دو خاتون۔'' اُس کا جھکا سر اُٹھا۔

''ہاں ــــ تمہارا آنے سے پہلے دو اور خاتون بھی آئے تھے انٹرویو دینے۔ دادا جان نے افسوس کے ساتھ واپس کر دیا تھا''۔

''مگر کیوں؟'' اِس وقت ایک بار پھر اُس کے ذہن میں سوال اُبھرا۔ دادا جان نے اُسے کیوں گھر میں خواہ مخواہ ایک فرد کی جگہ دے دی تھی؟

''بس ــــ عمر کا زیادہ تھا دونوں''۔ ایک بار پھر ــــ اُس کی آنکھوں میں کچھ دیر پہل کی ہشاش بشاش چمک لوٹ آئی۔

''کیا مطلب؟''

''کیا خبر دادا جان کہتا تھا۔ اب مجھ کو تھوڑا بتائے گا کہ چھوٹا لڑکی کا کیا ضرورت پڑ گیا اُن کو اِس عمر میں''۔

اور وہ خوبصورتی سے ہنس دی۔ اُسے زار کی اپنے دادا کی ــــ Ragging بہت اچھی لگی۔

ناشتے کے بعد وہ اُٹھی۔ باتھ روم جا کر ہاتھ صاف کئے، واپس آئی۔

زار وہیں ٹانگیں سیدھی پھیلائے سر کرسی کی پشت سے ٹکائے کرسی پر نیم دراز تھا۔ پرلی طرف جا کر کھڑکی کے قریب کھڑے ہوتے ہوئے اُس نے بالوں پر سے کلپ ہٹا لیا۔ جھول کر ڈھیر سارے نم بال نیچے لٹک گئے۔ وہ آہستہ آہستہ برش کرنے لگی۔

''تمہارا بال بہت خوبصورت ہے''۔ وہ چونکی۔ زار تھا، جانے کس وقت پاس کھڑا ہوا تھا۔ اپنی مخصوص دھیمی آواز میں بولا تھا۔

اُس کی نظروں میں وہی اپنائیت تھی۔ لہجے میں وہی یگانگت تھی۔

اُسے اپنی روح تک سرشار لگنے لگی۔ اُس کی زندگی لوٹ آئی تھی۔

مگر ــــ اگلے ہی لمحے ــــ جیسے وہ سنبھل گیا۔ محتاط ہو گیا۔

''میں تیار ہوتا ہوں جا کر ــــ ایک ضروری کام تھا یہاں ــــ موقعہ ملا ہی ہے تو کرتا

جائے گا۔ تم اپنا خیال رکھنا"۔

"کتنی دیر تک آئیں گے آپ؟" اُس نے دھیرے سے پوچھا۔

"آ جائے گا۔ یہاں کون انتظار کرتا ہے"۔ اُس نے مسکراتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔

اور نی شے جھنجھلا سی گئی۔ کیا وہ خود کچھ اندازہ نہیں کر سکتا تھا؟ کیا وہ اُسے چا نہیں تھی؟ کیا اُسے انتظار نہیں ہوگا؟

مگر ــــ دوسرے ہی لمحے وہ نارمل ہو گئی۔ اُس کے خیال میں وہ کسی اور کی جو تھی۔

مڑتے ہوئے اُس نے رخ کھڑکی کی طرف کیا اور ــــ گھوم کر اُس کے نم سارے بال زار کے ہاتھوں کو چھو گئے۔

"میں ــــ بارہ بجے تک آ جائیگا"۔ وہ غیر ارادی طور پر اُس کے بال ا ہاتھوں سے محسوس کرتے ہوئے پھر کہنے لگا۔ "کھانا اکٹھا کھائے گا۔ ہاں"۔

"جی"۔ رخ اُس کی طرف کئے بغیر ہی اُس نے کہا۔

"اتنا سیریس کیوں ہو گیا ہے"۔ وہ خود ہی اُس کے سامنے ہوتے ہوئے بشا لہجے میں بولا۔

"سیریس تو نہیں ہوں"۔ اور ــــ تمام نزاکتیں آنکھوں میں سمٹ کر دھواں دھوا ہونے لگیں۔

وہ چند لمحے اُسے یوں ہی تکتا رہا۔ پھر ــــ آہستہ سے کندھے اُچکائے۔

"دل چاہتا ہے تم سے بہت سا باتیں کریں ــــ مگر..." وہ کچھ اُلجھ سا گیا

"او کے۔ See you later چلتا ہے"۔

وہ بڑے بڑے قدم اُٹھاتا وہاں سے چلدیا۔

ٹھیک بارہ بجے وہ واپس آ گیا۔ سیدھا اُس کے کمرے میں۔

سفید بے داغ پینٹ کوٹ میں ملبوس وہ ــــ سمشنگ لگ رہا تھا۔ گرمی کے میں آج وہ اُسے پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

اُس کی سفید شفاف قمیض کے گلے کے اوپر کے دو بٹن کھلے تھے، اُس کا سینہ

وجاہت کا غماز تھا اور موسم کے لحاظ سے اُس کا مدھر پرفیوم سحر انگیز تھا۔

"کام ہو گیا آپ کا؟" کھڑکی کے پاس کرسی پر بیٹھی نی شے نے پوچھا۔

"ہاں ــــ تمہارا منہ دیکھ کر گیا تھا نا ــــ فوراً کام ہو گیا"۔ وہ خوش خوش بولا۔ پھر ــــ

جیسے کچھ خیال آ گیا ــــ بشاشت ماندی پڑ گئی۔

"تم کیسا رہا؟ کیا کرتا رہا؟" وہ اُس کے پاس آتے ہوئے بولا۔

"کچھ نہیں اخبار دیکھا۔ پھر یوں ہی لیٹی رہی اب اُٹھی ہوں"۔

"اچھا۔ اب تھوڑا دیر میں لیتا ہوں۔ بس کھانے تک ــــ ہاں"۔ اجازت طلب نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے اُس نے کوٹ اُتار کر کرسی کی پشت سے لٹکایا۔

اور ــــ دو قدم چل کر آرام سے اُس کے بیڈ پر لیٹتے ہوئے بازو آنکھوں پر رکھ

نی شے یوں ہی بیٹھی اُسے دیکھتی رہی۔

وہ کچھ دیر ساکت پڑا رہا۔ پھر ــــ بازو آنکھوں سے قدرے کھسکایا۔

"کیا دیکھتا ہے"۔ وہ دھیرے سے بولا۔

اور نی شے ٹپٹا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

مسکراتے ہوئے زار نے پھر آنکھیں ڈھک لیں۔

ایک بار پھر نی شے کی نظریں اُس طرف اُٹھیں۔

وہ جیسے بازو کے نیچے سے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ مسکراتے ہوئے کروٹ اُس کی رُخ لے لی۔ بازو پھر آنکھوں پر رکھ لیا۔

اب نی شے نے اُس طرف دیکھنا چھوڑ دیا۔ اپنے ناخنوں سے کھیلنے لگی۔

کافی دیر بعد جانے کیسے نظریں پھر اُس پر پڑیں۔

وہ بڑے اہتمام سے کہنی کے بل لیٹا اُسے دیکھ رہا تھا۔ پھر کہنی ہٹا کر، سر تکیوں پر رکھ دیا۔ پھر سے اُسے دیکھنے لگا۔

نی شے کی پلکیں گرنے اُٹھنے لگیں۔ اور پھر اُس نے نظریں سامنے کے لیمپ

پر جما دیں۔

وہ اب بھی ایک ٹک اُسے دیکھے جا رہا تھا۔

نی شے کی نظریں پھر بھٹکیں، اُس پر پڑیں۔

وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ نظروں میں جانے کیا کیا تھا؟ شکوے شکایتیں، شوخی شرارتیں، سب گڈمڈ۔

''بس کریں۔'' وہ بدحواس ہوئی جا رہی تھی اور وہ تھا کہ نظریں گاڑھے ہوئے تھا۔

''اوں ہوں۔'' اُس نے سر نفی میں ہلایا۔

اور تنگ آ کر وہ وہاں سے اُٹھ کر زار کے پچھلی طرف پڑی کرسی پر آ بیٹھی۔

زار نے لڑھک کر کروٹ اُس کی طرف لے لی۔ پھر سے اُسے اُسی انداز میں دیکھنے لگا۔

''کیا دیکھ رہے ہیں''۔ اُس سے نہ رہا گیا۔

''تم کو۔'' وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔

''کیوں؟''

''بس ـــ آنکھیں میری اپنی ہیں''۔

''اچھی بات نہیں ہے''۔

''مجھ کو کون روک سکتا ہے''۔ گرے بلو آنکھیں مزید شوخ ہو گئیں۔

لاجواب سی وہ پھر سامنے دیکھنے لگی۔ اور وہ ـــ

اور بھی محویت سے اُسے دیکھنے لگا۔

''میں ماروں گی''۔ اُس کی نظریں اُسے بے کل کئے دے رہی تھیں۔

''نہیں۔ مجھ کو مارنے کا تم کو کیا حق ہے''۔

نی شے کے خوبصورت چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔

''پھر آپکو مجھے اِس طرح دیکھنے کا کیا حق ہے؟''

''ہاں ـــ یہ تو ہے''۔ وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔ بازو ایک بار پھر آنکھوں پر رکھ لیا۔ ''پتہ نہیں کیوں ـــ کبھی کبھی میں بھول جاتا ہوں کہ ـــ '' اُس نے بات ادھوری

چھوڑ دی۔ آواز اُداس سی لگنے لگی۔

وہ اُٹھ کر کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔ یوں ہی باہر دیکھتی رہی۔ سڑک پر کی ٹریفک، ہوٹل کی وسیع پارکنگ۔

وہاں سے ہٹ کر وہ الماری کے پاس آ گئی۔ ایک بجنے میں پندرہ منٹ تھے۔ کپڑے نکال کر وہ باتھ روم گئی۔ جلدی جلدی تیار ہونے لگی۔

نیلی چیک شلوار قمیض پر نیلا شفون کا دوپٹہ لیا۔ بال درست کئے۔ اور اپنا مخصوص پرفیوم لگاتی کمرے کے اندر آ گئی۔

''پاگل کر دیتی ہو مجھ کو۔'' وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''کون سا پرفیوم ہے یہ؟''

''چلیں... کھانا کھاتے ہیں۔'' اُس نے اَن سنی کر دی۔

''چلو۔'' کوٹ دوبارہ پہنتے ہوئے اُس نے بال درست کئے۔

دونوں کمرے سے باہر نکل آئے۔

''یہ کرامت بابا تو واقعی کسی کام کا نہیں''۔ زار ایک نظر کرامت بابا کے دروازے پر ڈالتے ہوئے کہنے لگا۔

''کیا مطلب؟''

''اتنا دیر سے میں تمہارے کمرے میں تھا، اُس کو ہوش ہی نہیں''۔

''ضروری نہیں کہ اُسے اِس خیال سے بھیجا گیا ہو''۔

''I bet... دادا جان نے اُسے اِسی لئے بھیجا ہے''۔

اُسے یقین تھا اِس بارے میں۔ وہ جانتا تھا دادا جان کو۔ ایک جوان لڑکی لڑکے کا ساتھ خاص طور سے جب راتیں بھی گزارنی ہوں، وہ احتیاط لازمی سمجھتے تھے۔ اور نی شے کے لئے یہ احتیاط ذرا زیادہ ہی برتا جا رہا تھا یہ بھی اُسے معلوم تھا۔

لفٹ سے نیچے اُتر کر کوریڈور میں سے ہوتے وہ ڈائننگ ہال میں داخل ہونے لگے، نظریں پیچھے پڑیں۔ لفٹ میں سے نکلتے ہوئے کرامت بابا ـــ تیزی سے اُن کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔

زار کا زوردار قہقہہ بلند ہوا۔

"یہ اب ہمارے سامنے کسی ٹیبل پر بیٹھ کر ہم پر نظر رکھے گا۔"
نی شے کو بھی ہنسی آ گئی۔ شاید زار کی بات ٹھیک تھی۔ اُن دونوں کو اکٹھا دیکھ کر ہر بار کرامت بابا کا گڑبڑا سا جانا، بدحواس سا ہو جانا ـــ یہی وجہ تھی غالباً۔
زار اُسے دور ایک گوشے میں لگی میز پر لے گیا۔
بیرا آرڈر لے کر چلدیا۔
اور زار ـــ ایک بار پھر اپنے سامنے بیٹھی نی شے کو غور سے دیکھنے لگا۔ اب تو اُسے اچھا لگ رہا تھا اُسے گھورنا۔ وہ جو سٹپٹا، گھبرا جاتی تھی۔
"مجھے ایسا مت دیکھیں۔" نی شے نے احتجاج کیا۔
"میں تو دیکھے گا۔" وہ بھی آج ڈھیٹ بنا تھا۔
"دیکھتے رہیں پھر"۔ مگر ـــ
اِس کے باوجود وہ اُس کی نظروں کی تاب نہ لا سکی۔ پلکیں جھک گئیں۔ ہاتھ میں پکڑے کانٹے سے میز پوش پر لکیریں کھینچنے لگی۔
"اِس نے کیا قصور کیا ہے"۔
"کس نے؟" اُس کا ہاتھ رک گیا۔
"ٹیبل کلاتھ نے۔"
اور وہ پھر سے وہیں لکیریں کھینچنے لگی۔
"یہ ـــ یہ ـــ" وہ "چھٹنے" کے لئے لفظ تلاش کرنے لگا تھا۔
اور نی شے کو جیسے ایک گونہ تسکین ہوئی۔ کیوں وہ اُسے اتنی دیر سے تنگ کئے جا رہا تھا۔
"یہ... کیا؟" نی شے کی آنکھوں میں شوخی تھی۔
"یہ ـــ ٹیبل کلاتھ ـــ زخمی ہو جائے گا"۔
اور ـــ نہ چاہتے ہوئے بھی نی شے زور سے ہنس دی۔
کنپٹی کھجاتے ہوئے وہ بھی بیچارگی سے ہنس دیا۔
تبھی بیرا آیا۔ اُن کے سامنے کھانا لگایا اور واپس چلدیا۔

"شام کو باہر جائیں گے اچھا" پلیٹ میں کھانا نکالتے زار بولا۔
وہ ہولے سے مسکرا دی۔ بولی کچھ نہیں۔
پلیٹ میں سلاد لے کر اُس نے باقی ڈشز پر نظر ڈالی۔ پھر چپ سی رہ گئی۔ آج پھر سٹ کاٹنے کا مسئلہ درپیش تھا۔
"آج میں نہیں کاٹ کر دے گا"۔
"کیوں؟"
"تب کا بات اور تھا اب اور ہے"۔
تب تو شاید ایسی کوئی بات ہی نہ تھی۔
"تب کیا بات تھی؟"
"تب تم میرا مہمان تھی اور آج ـــ"
"آج کیا ہوں؟"
"آج میرا دشمن ہو۔" وہ ہنس دیا۔
وہ بھی ہنس دی۔
"کاٹ دیں نا پلیز۔" اُس نے خوشامد کی۔
"یہ مت کھاؤ۔" وہ اپنا پیس مزے سے کھاتے ہوئے بولا۔
"دل کرتا ہے نا"۔
"دل ـــ تمہارا پاس دل ہے؟"
"ہے۔"
"چھوڑو ـــ دل دیا بھی تو کس چیز کو۔" اُس نے پھر اُس کے منگنی سے منگیتر پر ہٹ کی۔
"ٹھیک ٹھاک تو ہے بیچارا۔" وہ اُسے چڑانے لگی۔
"بیچارا؟" اُس کا سائیڈ لینا اُسے اچھا نہ لگا۔ سلاد سے کٹا ہوا آدھا لیموں لے کر نٹے کی نوک میں پھنسایا ـــ "یہ ہے تمہارا منگیتر"۔
"آپ میرے منگیتر کی انسلٹ کر رہے ہیں۔" وہ بمشکل اپنی ہنسی روک پائی۔

"انسلٹ — میں تو اُس کو مار ڈالے اگر تم کہے تو۔"

"اُس کو مار ڈالنے کے بعد میں آپ کو کسی مصیبت میں پھنستے نہیں دیکھ سکتی"۔

"ہونہہ۔ کوئی نہیں پھنستا مصیبت میں — بڑے بڑے قتل ہوئے ہیں۔" اُس کی آنکھیں تاریک سی نظر آنے لگیں۔ "مگر یہ کہو کہ تم نہیں چاہتا ایسا — دو انگلی میں مسل دے گا اُس کو تو — اِس طرح کر کے"۔ اُس نے چٹکی بجائی۔

"یہ ... پانی پی لیں"۔ نی شے کے ہونٹوں پر شریر سی مسکراہٹ تھی۔

اور — زار — اُسے دیکھتے ہوئے مصالحت سے مسکرا دیا۔

"اِسی لئے تو — تم سے محبت ہوا تھا۔ کول، ملائم، نرم، نازک ... جیسے اِس دنیا کے لئے بنا ہی نہ ہو"

"روسٹ کاٹ دیں نا۔" ایک بار پھر نی شے نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں"۔ بچوں کی سی ضد پھر اُس کے لہجے میں لوٹ آئی۔

"ٹھیک ہے۔ میں آپ کا لے لوں گی"۔ ساتھ ہی اُس نے اُس کی پلیٹ میں سے پیس اُٹھا لیا۔

ہاتھ بڑھا کر زار نے اُس کی وہی کلائی پکڑ لی۔ چند لمحے پکڑے رہا۔ پھر جانے کیا خیال آیا — چھوڑ دی۔

"سوری۔ کبھی کبھی خیال نہیں رہتا"۔

"کس بات کا؟"

"کہ تم — میرا نہیں ہے"۔

اور — نی شے نے گہری سانس لی۔

کیا وہ اُسے کبھی بتا بھی سکے گی؟ اپنی منگنی ٹوٹنے کے متعلق اور یہ کہ اب اُس کا اُس آدمی سے کوئی رشتہ باقی نہیں رہا تھا؟ ایسا موقعہ آئے گا بھی اُس کی ہمت کیوں نہیں بندھتی تھی؟

"رات ڈنر کے بعد فلائٹ جا رہی ہے"۔ ہاتھ نیپکن سے صاف کرتے ہوئے

اُس نے بتایا۔

"تھینک گوڈ"۔

"کیوں — ہمارا ساتھ اچھا نہیں لگتا؟"

"یہ بات نہیں ہے"۔

"پھر کیا بات ہے؟"

کھانا ختم کر کے وہ اُس کی جھکی جھکی نظروں کو دیکھتا اُس کا انتظار کرتا رہا۔

"چلیں۔" نی شے اُٹھنے لگی۔

دونوں اوپر آگئے۔

"شام ٹھیک چار بجے اوکے"۔ اُس کے کمرے پر آ کر زار نے پھر یاد دلایا۔

"کرامت بابا ..." اُسے اچانک خیال آیا۔

"لاک کر دے گا اُس کو کمرے کے اندر۔ یاد کرے گا۔ پھر کسی کی چوکیداری کا ذمہ نہیں اُٹھائے گا — " وہ خوشگواری سے کہہ رہا تھا اور —

نی شے کی مسکراہٹ اچانک غائب ہو گئی۔ اُسے ہل سٹیشن پر واقع وہ کوٹھی اور کمرہ یاد آ گیا۔ جس میں زار نے اُسے لاک کروایا تھا۔

وہ آگے اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ اور نی شے دروازہ کھول کر بوجھل سے قدم اُٹھاتی اپنے کمرے میں آ گئی۔

اُسے زار نے کیوں بند کروایا تھا؟ اُلجھی اُلجھی سی وہ بستر پر پڑ گئی۔

شام کے سائے گہرے ہو چلے تھے، پارک میں سے اِکا دُکا لوگ بھی جانے لگے تھے اور — دور درختوں کے عقب میں اُبھرتی دودھیا چاندنی پورے چاند کے طلوع ہونے کا پتہ دے رہی تھی۔

وہ دونوں اب بھی پارک کے ایک گوشے میں بیٹھے تھے۔ نی شے نے واپس جانے کا تقاضا بھی کیا تھا، کیونکہ پیکنگ بھی کرنی تھی، ڈنر بھی باقی تھا اور روانگی بھی تھی — مگر —

جانے کیوں؟ زار یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ وہ کسی اور کی امانت تھی نادانستگی میں اُس کا زیادہ سے زیادہ ساتھ چاہتا تھا۔ غیر ارادی طور پر اُسے روکے جا رہا تھا۔

تبھی ___ یہ بڑا چاند نمودار ہو گیا، ہر سو مدھر روشنی پھیل گئی۔

"چاند کتنا خوبصورت ہے نا۔" بنچ سے ٹیک لگائے نیچے بیٹھی نی شے کے قریب ہی گھاس پر لیٹے لیٹے وہ چاند کے سحر سے مسحور سا بولا۔

"ہاں"۔

"مگر تم سے زیادہ نہیں"۔ اُس نے کروٹ اُس کی طرف لے لی۔

وہ مسکرا دی آہستہ سے۔

"ہائے داوے بس۔ تم نے بتایا نہیں تمہارا شادی کب ہو رہا ہے"۔

لاشعور میں بسا یہ سوال شاید اُسے ہر وقت پریشان کیے رہتا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم"۔ اُسے دیکھتے دیکھتے اُس نے تھکے انداز میں سر اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا۔

"تھک گئے ہو؟"

"ہاں"۔

وہ پھر سیدھا ہو لیٹا۔

"میں تم کو ___ آفر بھی نہیں کر سکتا"۔

"کیا؟"

"کہ تم ___ یہاں سر رکھ لو۔" اُس نے اپنے چوڑے سینے کی طرف اشارہ کیا۔

"ریسٹ لے لو تھوڑا دیر"۔

نی شے آہستہ سے مسکرا دی۔ کہتی بھی کیا۔

زار نے کروٹ پرلی طرف لے لی، پھر اوندھا لیٹ گیا۔ سر بازوؤں کے حلقے میں لے لیا۔ تھوڑی دیر اسی طرح رہا۔ پھر سیدھا ہو گیا، اور ایک بار پھر ___ لڑھکتے ہوئے نی شے کی طرف آ رہا۔

"بور ہو گیا ہوں"۔

"وہ تو ہونا تھا"۔

"تم جو دور دور رہتا ہے"۔ ساتھ ہی اُس کا پاؤں کھینچ کر سیدھا کرتے ہوئے اُس نے اُس پر سر رکھ لیا۔ "میں تھک گیا ہے اور نہیں ہو گا مجھ سے"۔ اُس نے بازو آنکھوں پر دھر لیا۔

"کیا؟"

"یہی کہ۔ تم کسی اور کا ہے۔ میں چھو نہیں سکتا۔ ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ بات بھی سوچ سوچ کر کرنا پڑتا ہے"۔ وہ جھنجلایا جھنجلایا سا کہہ رہا تھا۔

اور معاً ___ تیز ہوا کا جھونکا آیا۔ پاس سے کئی پتے اُڑ دور جا گرے۔

پھر تیز ہوا چلی، قد آور درخت جھومنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے آندھی شروع ہو گئی۔

"چلیں نا۔" وہ گھبرا سی گئی۔

"نہیں۔"

"دیکھیں آندھی تیز ہو رہی ہے"۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ درخت جھکے جھکے جا رہے تھے، پتے اِدھر اُدھر اُڑ رہے تھے اور ___ بڑا سا چاند غبار میں چھپ رہا تھا۔

"ہونے دو ___ میرا دل نہیں چاہتا ہے جانے کو"۔ وہ بدستور اُس کے گھٹنے پر سر رکھے تھا۔

آندھی تیز تر ہوتی گئی، اندھیرا بڑھتا گیا، قریب کے درخت سے شاخ ٹوٹی اور نی شے گھبرا کر زار پر جھک آئی۔

"ڈر لگتا ہے"۔ وہ خوفزدہ لہجے میں بولی۔

اور جانے کیسے؟ زار سب بھلا بیٹھا۔ اُسے مضبوط بازوؤں کے حصار میں لے لیا، سینے سے جکڑ لیا۔

"میں جو ہوں تمہارا ساتھ ہاں"۔

اور نی شے کو لگا ___ وہ ناقابل تسخیر قلعے میں آ گئی تھی۔ دنیا کی کوئی طاقت اب اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔

کچھ دیر یوں ہی گزر گئی۔ پھر جیسے زار کو احساس ہوا۔ اُسے آہستہ سے اپنے سے الگ کیا۔ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

''آئی ایم ریلی سوری نی شے''___ اُس کی آواز میں ندامت تھی۔ ''مجھ کو بالکل خیال نہیں رہا''۔

وہ اپنے کپڑوں پر سے گھاس جھاڑنے لگا۔ پھر جیسے جھنجھلا سا اُٹھا۔

''کہہ دو اپنا منگیتر سے یا جلدی شادی کر کے لے جائے یا چھوڑ دے میرا واسطے''۔ وہ جیسے اب یہ سب مزید برداشت نہ کر سکتا تھا۔

''اگر... اگر وہ مجھے۔ چھوڑ چکا ہو تو''۔ اُس نے ہمت کر ہی لی کہ اِس سے بہتر موقعہ اُسے اور نہیں ملنا تھا___ بعد میں___ پتہ نہیں وہ یہ بات کرتا یا نہیں؟ پھر اگلے دو دن وہ معروف بھی رہتا۔ اور واپس جا کر تو___ شاید وہ اُس کی طرف آتا ہی نہیں۔

''اگر وہ تمہیں چھوڑ چکا ہے''___ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''تو میں تم سے شادی کر لے گا سمپل''۔

آندھی کا زور کچھ کم ہو چلا تھا۔ پر پارک کے بڑے بڑے درخت اب بھی جھوم رہے تھے، پھولدار پودے اب بھی ہلکورے لے رہے تھے۔

''آؤ اُس طرف چلتے ہیں شیڈ میں___ روشنی بھی ہے وہاں''۔ ہاتھ سے تھام کر وہ اُسے شیڈ میں لے آیا۔ یہاں واقعی کچھ سکون تھا۔ روشنی بھی ہو رہی تھی۔

''تو___ تمہارا منگیتر تم کو چھوڑ چکا ہے''۔ وہ شاید اُس کی بات کو یوں ہی مذاق سمجھ رہا تھا، شیڈ کے کھمبے سے ٹیک کر کھڑے ہوتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔

''وہ واقعی مجھے چھوڑ چکا ہے''۔ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ''ہماری منگنی ٹوٹ چکی ہے۔ اُس نے دوسری جگہ شادی بھی کر لی ہے___'' وہ آہستہ آہستہ کہتی گئی۔

زار بے یقینی کے عالم میں اُسے دیکھ رہا تھا۔

''مذاق کر رہا ہے؟''

''نہیں''۔ وہ اچانک اُداس ہو گئی تھی۔ پچھلے تلخ دن یاد کر کے دکھی ہو گئی تھی۔

وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ سچائی جانچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''تم___ اتنا اُداس کیوں ہو گیا؟'' اب ایک اور اندیشے نے سر اُبھارا۔

''تم شاید اُس کو Like کرتا تھا؟'' زار کی آواز ڈوب سی رہی تھی۔

نم سی آنکھیں لئے وہ مسکرا دی۔

''میں نے تو اُسے دیکھا تک نہیں تھا۔ پھر Like کیسے کرتی''۔

''مگر وہ___ تصویر___'' اُسے اچانک خیال آیا۔

''پہلے کی پڑی تھی چیزوں میں... پھاڑ دی ہے اب۔'' اُس کا حسین چہرہ اب بھی باہوں میں گھرا تھا۔

''تو پھر اتنا خفا کیوں ہے؟'' وہ مزید تسلی چاہتا تھا شاید۔

''بس... پچھلے دن یاد آ گئے۔ منگنی ٹوٹ جائے انسلٹ کی بات تو ہوتی ہے''۔ اُس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔

اور___ زار کو جیسے دنیا جہان کے خزانے مل گئے۔

آہستہ سے اُس کا سر اپنے پہلو سے لگا لیا۔ باری باری دونوں آنکھوں پر پیار کر لیا۔

''تمہارا منگیتر گریٹ ہے۔ اُس نے تمہارا انسلٹ نہیں کیا۔ میرا زندگی بنا دیا ہے۔''

وہ روتے میں مسکرا دی۔

وہ اب بھی اُسے بازو کے گھیرے میں لئے تھا۔ چہرہ اُس کے چہرے سے لگائے تھا۔

''تم نے مجھ کو بتایا نہیں کہ تم بھی مجھ کو Like کرتا ہے؟''

اتنے براہ راست سوال کا جواب وہ کیا دیتی، پلکیں جھپکاتی رہ گئی۔

''بتاؤ نا''۔

وہ چپ رہی۔

''بولو نا ہاں''۔ وہ اُس کی بند بند آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

اور___ اُس کی بہت کچھ کہتی نظروں کی تاب نہ لا کر نی شے نے چہرہ اُس کے سینے میں چھپا لیا۔

اِس سے بڑھ کر اقرار اور کیا ہوتا؟ وہ بے خود سا ہو گیا۔
''اگر یہ سچ ہے تو آج کا رات میری زندگی کا یادگار رات ہے۔'' اُسے ارد گرد کا طوفان بہت اچھا لگنے لگا۔ جھومتے درخت اپنے پیار کے ہمنوا معلوم ہوئے۔ پورا چاند اپنی محبت کا گواہ دکھائی دیا۔

''سچ ہے''۔ اُس کے سینے میں چہرہ چھپائے وہ ہولے ہولے سے بولی۔

اُس کا چہرہ اُٹھا کر چند پل اُس کی نظریں اُس کے خوبصورت چہرے کا طواف کرتی رہیں۔

پھر آہستہ سے اپنے ہونٹ اُس کے ماتھے پر ٹکا دیئے۔

''آؤ اب چلیں''۔

وہ واپس آئے، نی شے کے دروازے پر آ کر قدرے آگے بڑھتے ہوئے زار نے آہستہ سے کرامت بابا کے دروازے پر دستک دی۔ جلدی ہی وہ دروازے پر آ گئے۔

''کیا حال ہے کرامت بابا؟ بی بی کا خیال تو رکھتا ہے نا؟''

''ک۔ کیوں نہیں صاحب۔ سب ٹھیک ٹھاک ہے۔۔۔ بس۔۔۔ ابھی شام کو ذرا آنکھ لگ گئی تھی ویسے پتہ نہیں کیا ہے یہاں کی آب و ہوا میں ...''

''جو۔۔۔ وہاں کا آب و ہوا میں ہے''۔ زار نے کہا۔ کہ وہ تو گھر پر بھی بسا اوقات کرسی پر بیٹھے بیٹھے اونگھتے رہتے تھے۔

کرامت بابا خجل سے مسکرا دیئے۔

''اچھا بابا جلدی جلدی تیاری کریں۔ کھانے کے بعد جانا ہے''۔

رخ نی شے کی طرف کرتے ہوئے زار نے اُسے خوبصورت ونک دی۔ جس کا مطلب تھا کرامت بابا کو اُن کے باہر جانے کا کوئی علم نہ ہوا تھا۔

نی شے دھیرے سے مسکرا دی۔۔۔ زار آگے بڑھ گیا اور۔۔۔ نی شے لاک کھول کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ڈائننگ ہال میں وہ دونوں جلدی جلدی کھانے میں مصروف تھے کہ جانے کا

وقت بہت کم رہ گیا تھا۔

معاً نی شے چونکی۔ زار کی نظروں کی تپش کی ہی وجہ تھی شاید۔۔۔ نظریں اُٹھا کر اُسے دیکھنے لگی۔

وہ بڑے غور سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہے''۔ وہ دھیرے سے بولی۔

''کچھ نہیں۔'' سفید ڈنر جیکٹ پر سیاہ بو لگائے وہ بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔

نی شے نے پھر پلیٹ پر نظریں جما دیں۔

لمحوں میں ہی اُسے پھر احساس ہوا وہ اب بھی اُسے دیکھ رہا تھا۔

پھر اُس کی نظریں اُٹھیں۔

واقعی اب وہ۔۔۔ وہ اُسی انداز میں اُسے دیکھے جا رہا تھا۔

وہ آج دن کو بھی اُس کے بیڈ روم میں اُس کے بیڈ پر لیٹا اُسے گھور رہا تھا مگر۔۔۔ تب کے اور اِس وقت کے دیکھنے میں بڑا فرق تھا۔۔۔ تب اُس کے انداز میں حسرت تھی، بے یقینی تھی اور اِس وقت۔۔۔ بہت دلیری تھی، بڑی بے باکی تھی۔

''کیوں دیکھتے ہیں ایسا۔''

وہ مسکرایا، خوبصورتی سے کندھے اُچکائے۔

''میرا مرضی''۔

وہ پھر خاموش ہو گئی۔ مگر زار نے نظریں نہیں ہٹائیں۔

''کھانا کھائیں''۔

''کھا رہا ہوں''۔ وہ واقعی کھا رہا تھا۔ مگر نظریں اُس پر ہی جمی تھیں۔

''دیر ہو رہی ہے''۔

''I know''۔ نظریں بدستور اُس پر تھیں۔

''میں اُٹھ جاؤں گی''۔

''میں بھی اُٹھ جائے گا''۔

''میں چلی جاؤں گی''۔

’’میں بھی چلا جائے گا‘‘۔

اور نی شے سچ مچ اُٹھ گئی کہ کھانا وہ بس کھا ہی چکی تھی۔

وہ بھی اُٹھ کھڑا ہوا ـــ نیپکن میز پر رکھا۔

’’چلو میڈم ـــ اتنا بھی اکٹر اچھا نہیں‘‘۔

اور وہ دونوں ڈائننگ ہال سے باہر نکل آئے۔

خوبصورت شام گھِر آئی تھی۔ بھاری پردے گرا لئے گئے، بتیوں کی دودھیا
ؤشی میں ہر چیز بہت بھلی لگ رہی تھی۔

نی شے اور زارا ابھی گھر پہنچے تھے۔ دادا جان کے کمرے میں چوڑی کھڑکی کے
ریب لگے صوفوں پر بیٹھے چائے اور چوکلیٹ کیک سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

گو ـــ زار خاصا محتاط تھا۔ پھر بھی دادا جان اُس کے اور ساتھ ہی نی شے کے
ہرے سے بہت کچھ پڑھ سکتے تھے۔ اور وہ خوش تھے کہ اُن کی سکیم کارگر ثابت ہوئی تھی،
ونوں کو اکٹھے بھیج کر چند روز قبل تک دونوں کے چہروں پر چھائے سائے دور کرنے
ں کامیاب رہے تھے۔

’’دادا جان میں آپ کے لئے ایک Terrific چیز لایا ہوں۔ چائے پیتے پیتے

وہ بول پڑا۔

''دادا جان کے لئے تم سے بھی بڑھ کر کوئی چیز ہے کیا؟'' وہ بے حد شفقت سے بولے۔

''ہوں ـــ پوائنٹ ہے۔'' اُس نے کپ میز پر رکھ دیا۔ ''سوچتا ہے ذرا ـــ'' سر انگلی پر ٹکاتے ہوئے وہ جیسے باقاعدہ سوچنے لگا۔

اور ـــ اُس کے انداز پر دادا جان مسکرا دیئے۔

''ہے کوئی ایسی چیز جو جانِ دادا سے بھی بڑھ کر ہے''۔

نی شے دلچسپی سے دادا پوتے کے لاڈ پیار کو دیکھ رہی تھی۔

''اوں''۔ اُس نے سر نفی میں ہلایا۔ ''نہیں''۔

کتنا اعتماد تھا اُس کے انداز میں۔ کتنا مان تھا، کتنا لاڈ تھا!

اور ـــ دادا جان نے اُس کا سر اپنے قریب کر کے اُس کا ماتھا چوم لیا۔

چند ثانیے وہ وہیں اپنا سر دادا جان کے شانے پر ٹکائے رہا۔

تبھی ـــ کرامت بابا پریشان سے اندر داخل ہوئے۔

''صاحب وہ عبدالرشید صاحب ـــ'' عبدالرشید زار کے والد کے ساتھ بزنس پارٹنر تھے۔

دادا جان کا رنگ کچھ بدل سا گیا۔ چپ سے ہو گئے۔

''ہاں وہ ... دراصل ... کل شام ...'' وہ رک گئے۔ جیسے بتاتے ہوئے ہچکچا رہے تھے، جھجک رہے تھے۔ ''عبدالرشید ... ختم ہو گیا ...''

''کیا؟'' زار چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔ ''مگر ـــ کیسے؟''

''کسی نے ـــ قتل ـــ کر دیا''۔ دادا جان سامنے دیکھ رہے تھے۔ اچانک بہت اُداس بہت دکھی لگنے لگے تھے۔

''قتل؟'' زار بے اختیار کھڑا ہو گیا۔

پرکشش چہرہ تاریک نظر آنے لگا ـــ دلنشیں آنکھیں درد و کرب میں ڈوب گئیں۔ دونوں مٹھیاں اضطراری حالت میں بھینچ گئیں۔

''Calm بیٹا''۔ ہاتھ بڑھا کر دادا جان اُس کی پیٹھ سہلانے لگے ـــ ''بیٹھو''۔ ہاتھ سے پکڑ کر انہوں نے اُسے پھر بٹھا لیا۔

پھر ـــ دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔

دادا جان کچھ سوچ رہے تھے اور ـــ زار بار بار ہاتھ مل رہا تھا۔ بیقرار لگ رہا تھا ـــ بے کل ہو رہا تھا۔

پھر دادا جان سوچوں سے اُبھرے۔ ایک نظر زار پر ڈالی۔

''Take it easy''۔ ایک بار پھر انہوں نے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔

پھر ـــ زار اُٹھا ـــ دادا جان کے ڈریسنگ روم میں گیا۔ خاصی دیر بعد واپس آیا۔ تو کچھ نارمل لگ رہا تھا۔ جیسے اپنے جذبات پر قابو پانے کے لئے ہی یہاں سے اُٹھ کر ڈریسنگ روم گیا تھا۔

''مجھ کو بھی جانا چاہئے وہاں دادا جان''۔ وہ اب جیسے اپنے حواسوں میں آ گیا تھا۔

''ہاں بیٹا''۔ دادا جان نے گہری سانس لی ـــ ''کرامت کو بھی ساتھ لیتے جاؤ۔ نمکخوار ہے اُن کا''۔ عبدالرشید کے یہاں ہی تو وہ بقول دادا جان اُن کے گھر سے بھگوڑا ہوئے تھے۔

''ٹھیک ہے''۔ اُس نے جانے کے لئے قدم بڑھائے۔ ''نہا کر میں جاتا ہے۔ ڈنر پر آؤں گا پھر ـــ ٹائم کیا ہوا''۔ اُس نے کلائی پر سے آستین کھسکا کر دیکھا ـــ مگر ـــ

گھڑی وہاں نہیں تھی ـــ بے اختیار اُس کی نظریں نی شے کی طرف اُٹھیں۔

آج واپسی کے وقت ایئرپورٹ جانے سے قبل وہ باتھ روم جانے لگا تو گھڑی اتار کر قریب کھڑی نی شے کے کوٹ کی جیب میں ڈال دی تھی۔

جہاز میں بیٹھ کر آنے لگے تھے تو اُسے اچانک خیال آیا تھا۔

''میری گھڑی دیدو''۔ اُس نے قریب بیٹھی نی شے سے کہا تھا۔

''اوں ہوں۔'' اُس نے سر انکار میں ہلایا تھا۔

''کیوں؟''

''بس''۔

''راستے میں ضرورت پڑتا ہے نا''۔ گھڑی کے بغیر اُسے اپنا آپ ادھورا سا لگ تھا۔

''نہیں۔'' وہ بچوں کی طرح اڑی رہی۔

''کوئی وجہ؟''

''پچھلے دو دن اِس گھڑی میں سے پانچ منٹ بھی نہیں دیئے آپ نے مجھے''۔

''اوہ۔'' واقعی پچھلے دو دن وہ سارا سارا دن اکیلی رہی تھی۔ رات کو آتا تھا تو بھی دیر خاصی ہو جانے کی وجہ سے وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا جاتا تھا۔

''گھر پر ٹائم دوں گا''۔ اُس کی آنکھوں میں خوبصورت چمک تھی۔

پتہ نہیں کیوں نی شے کی پلکیں لرز سی گئیں۔

''معلوم ہے جتنا ٹائم آپ مجھے دیتے ہیں''۔ وہ شاکی انداز میں بولی۔

''شام کو آیا کرے گا نا۔''

''اور ہر بار بہت ہوا تو دس منٹ، بارہ منٹ ... پھر ٹائم دیکھنا۔ کلب جانے وقت، کسی کو ایئرپورٹ پر ریسیو کرنے کا وقت ...''

وہ اُسے آہستہ آہستہ آرام آرام سے باتیں کرتے دیکھ رہا تھا۔

پھر ـــ مسحور سا اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرا دیا۔

''کافی under observation رکھا ہے مجھ کو''۔

اور نی شے پلکیں جھپکاتی سامنے دیکھنے لگی۔

''ٹھیک ہے''۔ اُس نے گہری سانس لی۔ ''نہیں دیتا تو نہ سہی''۔ اُس نے بھی مصالحت کر لی تھی۔

''میں ... میں بھی چلوں دادا جان اپنے کمرے میں''۔ نی شے دادا جان کی موجودگی میں اُس کی نگاہ اپنے اوپر پڑتے دیکھ کر ـــ سٹپٹا گئی تھی۔

اوپر سے دادا جان بھی دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ چپ چپ سے مگر غور سے، دھیمی اُداس سی مسکراہٹ بھی ہونٹوں پر اُبھر آئی تھی۔

''ہاں بیٹی جاؤ ـــ تھک بھی گئی ہوگی''۔ انہوں نے شفقت سے کہا۔

نی شے اُٹھ کر کوریڈور میں نکل آئی۔

''مروا دیا نا''۔ دو ہی قدم پر زار نے آ لیا۔ آواز میں اب بھی اُداسی کی چھاپ تھی۔

''یہ لیں''۔ وہ پہلے ہی بدحواس ہو رہی تھی۔ فوراً اُسے گھڑی تھما دی۔

''میں تو بس بتانے لگا تھا دادا جان کو کہ میرا ہر چیز تم نے لے لیا ہے''۔ اُس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

''اور کیا لیا ہے۔'' وہ سہمی سی اُسے دیکھتے ہوئے اپنے مخصوص آہستہ انداز میں بولی۔

''زار کو'' ـــ وہ اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ گرے بلو کرسٹلز اب بھی اُداس اُداس تھے۔ ''جو کبھی میرا تھا''۔

وہ آگے بڑھ گیا۔

اور نی شے اُس کی آخری بات کی گونج سماعت میں بسائے آہستہ آہستہ اپنے سویٹ میں آ گئی۔

دن یوں ہی سرکنے لگے ۔ زندگی جیسے اچانک بہت خوبصورت ہوگئی تھی ۔ اتنی ساری خوشی، اتنا سارا اطمینان اُسے نصیب ہوگا وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی ۔ کچھ عرصہ قبل پے در پے صدمے سہتے ہوئے تو وہ سوچتی تھی دکھ اُس کا مقدر بن گئے تھے ۔ خدا اچانک اتنا مہربان ہوجائے گا یہ تو اُس کے وہم وگماں میں بھی نہ تھا ۔

وہ یہاں بالکل گھر کے ایک فرد کی طرح رہ رہی تھی ۔ اب تو کھانے پر بھی اکثر وہیں سے بلاوا آجاتا تھا ۔ داداجان کو اُسے دیکھے بغیر جیسے چین نہ آتا تھا ۔

اور ــــ زار کی تو جیسے زندگی کو مرکز مل گیا تھا ۔ مقصد پالیا تھا منزل مل گئی تھی ۔

کسی دن کسی وجہ سے اُسے مل نہ پاتا تو بے چین ہو اُٹھتا، بے قرار ہوجاتا ۔ بے کل ہوجاتا ۔

نی شے بھی اُسے اپنے من مندر کا دیوتا سمجھ بیٹھی تھی ۔ سب کچھ بھلا کر سب کچھ راموش کرکے ــــ کچھ عرصہ قبل اُس نے اُس پر کتنی زیادتیاں کی تھیں، کتنی تکلیفیں دی ہیں ۔ اُس کے پیار میں ڈوب کر تو وہ جیسے اپنے آپ کو ہی ہار بیٹھی تھی ۔

وہ کھوج، وہ راز، وہ اِسرار گو اب بھی کبھی کبھی سر اُٹھاتا ذہن میں ۔ مگر ــــ کہیں بھی تو کوئی سرا نہ آتا تھا ہاتھ ۔ زار کی کسی بات کسی بھی حرکت سے تو ظاہر نہ ہوتا تھا کچھ ــــ

براہ راست وہ پوچھ نہ سکتی تھی ۔ کہ خود کلہاڑی اپنے پاؤں پر مارنے والی بات تھی ۔ کیا نتیجہ نکلتا جانے؟ خود زار ہی اُس سے چھن جاتا تو؟

اِس سے آگے وہ سوچ بھی نہ پاتی تھی ۔ وہ تو اُس کی عارضی جدائی سے پریشان تھی کہاں کہ ــــ

زار تین ہفتے کے لئے جرمنی گیا ہوا تھا، کسی بزنس کورس کے سلسلے میں ۔ اور نی شے کو یہ عرصہ تین ہفتے نہیں تین صدیاں لگ رہا تھا ۔

آج وہ پہنچنے والا تھا ۔ اور اپنی بیقراری اپنی بیتابی دیکھ کر وہ خود حیران تھی ۔ کیا محبت میں انسان ہر دوسرا جذبہ بھول جاتا ہے ۔ کچھ عرصہ قبل وہ کبھی کبھی زار کے لئے بن دیکھے نفرت کی شدید لہر محسوس کرتی اپنے دل میں ۔ جانی دشمن سمجھتی اُسے کبھی کبھار ــــ اور اب اس تبدیلی پر متحیر تھی ۔

سفید شلوار قمیض پر سفید شفون کا دوپٹہ لئے کھیتوں کے آخری سرے پر قدرے اونچے گھاس کے ٹکڑے پر گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھی وہ کوئی اپسرا معلوم ہورہی تھی ۔

سرسوں کی جگہ اب کوئی نئی فصل سر اُبھار رہی تھی، سامنے کے سفیدوں میں نئے کونپل پتے ہواؤں میں جیسے تالیاں بجا رہے تھے اور ــــ آلوچے اور خوبانی کی ننگی شاخوں پر لگے ان گنت شگوفے فطرت کا حسن لٹا رہے تھے ۔

''میڈم''۔

چونک کر اُس نے رخ پھیرا ــــ زار تھا، سفید پینٹ پیل کوٹ اور سفید شوز پہنے جانے کب سے آیا کھڑا تھا ۔

نی شے کی آنکھوں میں دیپ سے جل اُٹھے مگر ساتھ ہی اُس کی لامتناہی پیار لٹاتی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے اُس کی پلکیں جھک گئیں۔

"کب آئے آپ؟" اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنیں سنبھالتی وہ بمشکل بولی۔ دنوں بعد وہ اُس کا سامنا کر پا رہی تھی وہ سمجھ رہا تھا۔ مسکرا دیا دلآویزی سے۔

"تھوڑا دیر پہلے میری جان"۔ وہ وہیں اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ "کیسا رہا آج کا دن؟" وہ بغور اُس کے جھکے سر کو دیکھ رہا تھا۔

"ٹھیک"۔

"مجھ کو یاد کیا تھا"۔

اُس کی جھکی نظریں اُٹھیں لیکن ___ دوسرے ہی لمحے سامنے دیکھنے لگی۔ کہ آج بہت دنوں کے بعد اُس کی آنکھیں بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔

"بولو نا ہوں"۔ اُس کے چہرے پر انگلی سے خوبصورت سے لکیر کھینچتے ہوئے وہ اصرار کرنے لگا۔

"نہیں"۔ ایک بار پھر سر گھٹنوں پر رکھتے ہوئے اُس نے سر نفی میں ہلا دیا۔

مگر ___ اُس کے چہرے کا رنگ کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو رہا تھا۔ نظریں اُوپر اُٹھنے کا نام نہ لے رہی تھیں۔

اُس کا یہ انوکھا اقرار اُسے بہت حسین لگا۔

آہستہ سے اُس کا چہرہ اپنی طرف کیا، دھیرے سے اپنے ہونٹ اُس کے ماتھے رکھے۔

"کبھی کبھی تمہارا 'نا' میں 'ہاں' ہوتی ہے"۔ ہاتھ سے اُس کے بال سنوار سنوارتے اُس کی نظریں اُس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

وہ چپ چاپ تھی، دم بخود تھی۔

وہ مسکرا دیا۔ اُس کا شرمیلا انداز مسحور کن تھا۔

"اوہ یس"۔ اُسے جیسے اچانک یاد آیا۔ کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ "اپنا لو"۔

اُس نے ایک خوبصورت ڈبیہ نکالی۔ کھولی۔ پلیٹنم میں جڑے جگمگاتے ہیروں کا بریسلٹ نکالا۔ اُس کی نازک کلائی میں پہنایا۔

"مجھ کو یقین تھا تمہارا کلائی پر لگے گا تو یہ خوبصورت ہو جائے گا"۔

نی شے نے دھیرے سے اپنے ہونٹ بریسلٹ پر رکھ دیئے کہ اتنی محبت سے دیئے گئے تھے پر وہ اُس کا اور کیسے شکریہ ادا کرتی؟

"اِدھر کرو میم یہ Kiss"۔ زار نے اچانک اپنا چہرہ قریب کیا۔ "یہ گفٹ میں ایا ہے یہ نہیں"۔

اور وہ نادم سی پلکیں جھپکانے لگی۔

پھر اُس نے موضوع بدل دیا۔ دوسری باتیں کرنے لگا۔ اپنے سفر سے متعلق، اُسے ہر گھڑی یاد کرنے کے بارے میں، گھر جلدی پہنچنے کی بے تابی سے متعلق۔

"اور ہاں ___ میں کل اپنے فارمز پر جا رہا ہے"۔ گھر پہنچنے کی بے تابی پر اُسے خیال آیا۔ دادا جان اُسے ایک بار پھر گھر سے چلتا کر دینے والے تھے۔

"کیا؟" نی شے بے اختیار بول اُٹھی۔ ابھی تو آیا تھا پھر سے جانے کی بات کر رہا تھا!

"کیوں؟"

"آپ اتنی جلدی نہیں جائیں گے"۔ اُس نے کہہ ہی دیا پچھلے تین ہفتے وہ کیا کم بیقرار رہی تھی اُس کے لئے۔

"دادا جان کا آرڈر ہے"۔ اُس کی بیقراری اُسے اچھی لگ رہی تھی۔

"نہیں"۔ وہ جھنجھلا اُٹھی۔

"ہاں"۔

"نہیں"۔

"منت کرو تھوڑا خوشامد کرو پھر سوچے گا"۔

"پلیز زار میں مذاق نہیں کر رہی"۔

"تو میں کب مذاق کرتا ہے"۔

''اچھا... مت جائیں پلیز''۔

''تھوڑا اور''۔

''پلیز۔'' اُس نے ایک بار اور التجا کی۔

''ایسے نہیں''۔ اُس نے اپنا گال اُس کے نزدیک کیا۔ ''kiss here''

''نہیں''۔ اُس نے جلدی سے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

''ہاں۔'' ایک جھٹکے سے اُس نے اُس کا ہاتھ ہٹایا۔ ساتھ ہی اُس کے نازک ہونٹ اُس کے گال سے جا لگے۔ ''کیا نہیں نہیں لگا یار رہتا ہے۔ اتنا دور سے آیا ہوں میں ___'' وہ جھنجلایا جھنجلایا سا لگنے لگا۔

نی شے گھبرا سی گئی۔ اُس کا پارہ فوراً اوپر چڑھتا تھا۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا اُس کا۔

''اب تو نہیں جائیں گے نا''۔ وہ مصالحت کے انداز میں بولی۔

''جانا تو ہے۔ آرڈر از آرڈر مگر میں کوشش کروں گا تم بھی وہاں آ جائے''۔ وہ مسکرایا۔ ''اب میں بھی زیادہ دن تمہارا بغیر نہیں رہ سکتا''۔

''میں... میں کیسے آؤں گی۔'' واقعی وہ کیسے خواہ مخواہ جا سکتی تھی۔

''میں کچھ کر لوں گا''۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''مگر ___ ایک بات کا خیال رکھنا ہے'' وہ مسکرایا ''وہاں پر دہ کرنا ہو گا ___ یہاں کا طرح نہیں کہ جس طرح مرضی ہوا چا پڑا''۔

''اچھا۔'' وہ بھی مسکرا دی۔ وہ خود بھی جیسا دیس ویسا بھیس کی قائل تھی۔ ''کون رہا ہے؟'' اُس نے یوں ہی پوچھ لیا۔

''میں اور میرا اتا نیگر''۔

وہ پھر مسکرا دی۔ لمحہ بھر پہلے وہ بڑا سا ذمہ دار سا لگ رہا تھا اور اِس وقت ___ چھوٹا سا معصوم سا۔

''آؤ چلیں۔'' اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے زار نے اُسے اُٹھایا۔ ''دادا جان چائے پر انتظار کر رہے ہوں گے''۔

دونوں پگڈنڈی پر چلتے دادا جان کی طرف چل دیئے۔

گاؤں میں کچھ ضروری کام تھا۔ زمین کے کسی حصے پر بڑے دنوں سے کچھ تنازعہ چلا آ رہا تھا۔ دادا جان آدمی بھجوا کر اپنی سی کوشش کر چکے تھے مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہ ہو سکا تھا۔ یوں لگتا تھا زار کے گئے بغیر کام نہ ہو سکتا تھا۔ سو چند دن کے لئے اُسے جانا ہی پڑا ___ مگر ___

اگلے ہی دن اُس کا فون آ گیا۔

''دادا جان آپ کو یاد ہے کل آپ کا برتھ ڈے ہے''۔ خدا نے جیسے دونوں کی سن لی تھی۔ ''اور میں اِس کو ہمیشہ کی طرح سیلبر یٹ کرنا چاہتا ہے۔ کل شام چار بجے آپ کو یہاں پہنچ جانا ہے''۔

''اور جانِ دادا نی شے کو نہیں بلاؤ گے؟''

''وہ آپ کا بزنس ہے''۔ وہ جانتا تھا ایسے موقعہ پر وہ نی شے کے بغیر نہیں آئیں گے۔ اور پھر اُسے دادا جان کا پتہ تھا وہ مرد نوکروں پر اُسے گھر میں اکیلا کبھی پیچھے نہ چھوڑتے۔

''Are you sure?'' دادا جان نے کہا تھا۔

اور وہ ___ بے بس سا مسکرا دیا تھا۔

اور یوں ___ اگلے ہی دن داداجان اور نی شے بمعہ کرامت بابا کے مسلح گارڈز کی نگرانی میں گاؤں کی طرف رواں دواں تھے۔

دن ڈھل رہا تھا، سورج کا رخ مغرب کی اور ہو گیا تھا اور تاحدِ نظر پھیلے کھیت فصلیں، درخت نظروں کو بھلے لگ رہے تھے۔

''بیٹی یہ ہمارا گاؤں ہے''۔

داداجان کی بات پر وہ چونکی۔

''وہ دور بائیں جانب ہماری حویلی نظر آ رہی ہے''۔ انہوں نے پاس بیٹھی نی شے سے مزید کہا۔

نی شے نے اُس طرف دیکھا۔ دور قدآور درختوں میں گھری پتھروں کی بنی اد

نت حویلی نظر آ رہی تھی۔

نی شے نے قریب رکھی اپنی چادر اُٹھالی، اچھی طرح اوڑھ لی۔ زار نے کہا تھا اں پردہ کرنا ہوگا۔

دادا جان نے چونک کر اُسے دیکھا۔ پھر سامنے دیکھتے ہوئے آہستہ سے کرا دیئے۔ اُن لوگوں کا اور اپنی عزت کا نی شے کو خیال تھا انہیں اچھا لگا۔

فاصلے گھٹنے لگے اور ___ بائیں ہی جانب رضا فارمز کے لگے بورڈ کے ساتھ گاڑی ی سڑک چھوڑ کر شنگل روڈ پر مڑ گئی۔

اب دائیں جانب دور تک پھیلی ہریالی تھی، اُس پار شاید کوئی فصل تھی۔ بائیں ب دور تک پھیلا مالٹوں کا باغ تھا، ہر درخت ان گنت سفید پھولوں سے لدا تھا۔ نے دورویہ چناروں کے بیچوں بیچ گاڑی گزرنے لگی تو ___ مالٹوں کے پھولوں کے شبو کے جھونکے روح تک اترنے لگے۔

گاڑی آگے بڑھتی گئی۔ کھیتوں اور باغ میں کام کرنے والے کسان کام روک روک کر اپنے مالک کو سلام کرتے، ساتھ ہی نی شے نے محسوس کیا اپنے مالک کے ساتھ کسی اتون کی موجودگی کو دیکھتے ہی وہ رخ دوسری طرف کر لیتے۔ اُسے اچھا لگا ___ اِس ہران کے سکھائے آداب اُس کے من کو بھانے لگے۔

گاڑی کچھ اور آگے گئی۔

''وہ ہماری مسجد ہے۔'' اب کے کرامت بابا دائیں طرف قدرے فاصلے پر بنی کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے گویا نی شے کو معلومات فراہم کرنے لگے۔ ''اور اُس ریب ہی وہ سرخ اینٹوں کی بنی ڈسپنسری ہے۔ وہ پرے پھر مزارعوں کی آبادی ہے انہوں نے دور تک پھیلے کچے پکے مکانوں کی طرف اشارہ کیا۔

اب پھر ___ کھیت تھے، چناروں کے دورویہ درخت تھے اور حویلی کی طرف بڑھتا گلابوں سے آراستہ راستہ۔

دور سے اُس نے دیکھا ___ اونچی پُرشکوہ حویلی کسی مضبوط قلعے سے مشابہ تھی۔ کی اونچی چار دیواری دندانے دار تھی۔ اور چاروں کونوں پر حفاظتی مورچے

بنے تھے۔ حویلی کے گرد بنی پتھر کی اونچی فصیل تھی اور فصیل میں بنے آہنی گیٹ کے دونوں طرف پہرے داروں کی کوٹھڑیوں کے پاس مسلح پہرے دار مستعد کھڑے تھے۔

اپنے مالک کی گاڑی دور سے دیکھتے ہی انہیں جیسے مشینی انداز میں حرکت ہوئی اور لمحوں میں ہی گیٹ کے مضبوط پٹ کھل گئے۔

ایک بار پھر— تمام مرد ملازم اُسے دیکھتے ہی وہاں سے چھٹ گئے اور گاڑی دو رویہ سرو کے درمیان چلتی مردانہ حصہ چھوڑ کر پرلی طرف بڑھتی ایک اور گیٹ میں داخل ہوئی اور آگے چل کر پورچ میں رک گئی۔

حویلی کی مامائیں اُسے دیکھنے اُسے لینے — چہروں پر تجسس اور شوق لئے باہر کی طرف لپکیں۔

انہیں جیسے پہلے سے معلوم تھا کہ وہ بھی آ رہی تھی، شاید زار نے بتایا تھا

زار—

پہلی بار اُسے خیال آیا اور اُس کا دل دھڑک سا اُٹھا۔

وہ اُس کے گاؤں آئی تھی، اُس کی حویلی میں— کیسے ریسیو کرے گا اُسے؟

دادا جان گاڑی سے اُترے تو تمام ملازماؤں نے بڑی عقیدت سے بڑی م
سے انہیں باری باری آداب کیا۔ دو ادھیڑ عمر عورتیں تھیں، تین جوان لڑکیاں تھیں، ا
معمر عورت تھی۔

دادا جان نے سب کے سروں پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔

"کیسی ہو حوا بی بی؟" دادا جان نے معمر عورت کی خوش خلقی سے خیریت دریا
کی۔

"اچھی ہوں۔ اچھا کیا بچی کو لے آئے آپ۔ زار بیٹے نے بتایا تھا آپ
ساتھ آ رہی ہے۔ دیکھتے نہیں آپ کتنی رونق ہو گئی ہے۔" حوا بی بی کا اشارہ نی
ہی عمر کی لڑکیوں کی طرف تھا جو خاص طور سے اُسے دیکھنے کے اشتیاق میں سا
تھیں۔ شوق اور تجسس سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔

نی شے بھی اُن سے بہت پیار سے ملی۔ پھر سبھی اندر آ گئے۔

قدیم طرز کی حویلی کا اپنا حسن تھا۔ بڑے بڑے کمرے تھے، سفید منقش چھتیں تھیں لمبی لمبی راہداریاں تھیں، خوبصورت محرابیں اور مرمریں ستون تھے۔

مستعد مامائیں چلتی پھرتی نظر آ رہی تھی۔ عرصہ بعد حویلی میں رونق تھی چہل پہل تھی۔

"نی شے بیٹی تم ہاتھ منہ دھو لو پھر ہمارے ہی کمرے میں آ جانا"۔ چوڑے سے کوریڈور میں دادا جان کرامت بابا کی ہمراہی میں آگے بڑھنے لگے— "اور یہ زار ہمیں بلا کر خود غائب ہو گیا ہے"۔ اب کے وہ کرامت بابا سے کہنے لگے۔

"تھوڑی دیر میں آ جائیں گے۔ دینو بتا رہا تھا ضروری کام سے گئے ہیں"۔ کرامت بابا نے کہا۔

"اچھا اچھا" وہ اپنے کمرے میں مڑے۔

اور— نی شے کو ایک وہی ادھیڑ عمر عورت اور دو لڑکیاں پرلے بیڈروم میں لے گئیں۔

"یہ کمرہ آپ کا ہے بی بی۔ ہمیں صبح ہی چھوٹے صاحب نے بتایا تھا کہ آپ بھی بڑے صاحب کے ساتھ آ رہی ہیں ہم آپ کے لئے بھی کمرہ ٹھیک کر دیں۔" ادھیڑ عمر خدیجہ بولی۔

"شکریہ"۔ نی شے نے ممنونیت سے کہا۔

"یہ میری بیٹیاں ہیں۔ سعیدہ اور حمیدہ۔ میں چھوٹے صاحب کی والدہ کے وقت کی یہاں ہوں۔ ہمیشہ اُن کے ساتھ رہی ہوں۔ وہ جہاں جہاں گئیں ساتھ لے گئیں۔ خدا جنت نصیب کرے بہت نیک تھیں۔ بہنوں کی طرح سمجھتی تھیں مجھے۔ نام کو غرور نہیں تھا..." ٹوٹی پھوٹی اُردو میں کہتے کہتے اُس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ "آج عرصہ بعد حویلی میں رونق لگی ہے۔ بڑے صاحب نے اچھا کیا آپ کو ساتھ لے آئے"۔ آنکھیں رگڑتے ہوئے وہ باتھ روم کا جائزہ لینے آگے بڑھی۔

نی شے متاثر سی نظر آنے لگی۔ سعیدہ اور حمیدہ اب بھی کھڑیں ایک ٹک اُسے دیکھے جا رہی تھیں۔

''سومرہ خائستہ دہ''۔ حمیدہ اپنی بڑی بہن سعیدہ سے بولی۔

''کیا؟'' نی شے پشتو کے ایک حرف سے بھی واقف نہ تھی۔ اتنا ضرور سمجھ گئی کہ بات اُسی کے متعلق تھی۔

حمیدہ اور سعیدہ بھی لاچارگی سے ہنس دیں، کیسے سمجھاتیں اُسے کہ وہ بھی اردو سے ناواقف تھیں۔ ماں تو کچھ کچھ اِس لئے جانتی تھی کہ زار کی والدہ کے ساتھ شہر میں رہی ہے۔

''بی بی کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو یہ گھنٹی کر دینا''۔ خدیجہ نے واپس کمرے میں آتے ہوئے سوئچ بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں باورچی خانے میں ہوتی ہوں، کھانا میں ہی پکاتی ہوں''۔

''اچھا۔ شکریہ۔'' نی شے بولی۔

اور خدیجہ بیٹیوں سمیت کمرے سے چلی گئی۔

نی شے جلدی جلدی نیم گرم پانی سے نہائی۔ ہلکا سلیٹی سِلک کا سوٹ پہنا۔ ہم رنگ جوتی پہنی، بال سنوارے، اپنی مخصوص پرفیوم لگائی اور سلیٹی شفون کا دوپٹہ لیتی کوریڈور میں نکل آئی۔

عین اُسی وقت زار اندر کوریڈور میں داخل ہوا۔

نی شے کی آنکھوں میں قندیلیں سی جل اُٹھیں۔ یکدم ہی سب اور بھی اپنا اپنا لگنے لگا۔

زار اپنی آنکھوں سے میچ کرتا گرے بلو شلوار قمیض پہنے تھا، پاؤں میں اپنے علاقے کی چپلی تھی، کندھے سے پستول لٹک رہا تھا، دھوپ کا چشمہ اُتارتے ہوئے وہ اُس کی طرف بڑھنے لگا تو ـــــ

اُسے لگا وہ اپنے روایتی لباس میں بہت ہینڈسم بہت سمارٹ لگ رہا تھا۔

''How are you?''۔ ہاتھ میں پکڑے اپنے چشمے سے اُس کا گال چھوتے ہوئے وہ اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں بولا۔

''فائن''۔ وہ اب بھی اُسے دیکھ رہی تھی۔

''کیا دیکھ رہا ہے؟'' وہ کندھے پر سے پستول اُتارنے لگا۔

"You look different."

"I am different."

''بہت خوش ہوتے ہیں اپنی بڑائی پر''۔

چونکتے ہوئے اُس نے اُس کی طرف دیکھا ـــ چند لمحے یوں ہی دیکھتا رہا۔ پھر مسکرا دیا۔

''ہاں۔'' وہ اب بھی بغور اُس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

وہ لاجواب سی ہوگئی۔ اُس کی نظروں میں جانے کیا تھا، اُس کی پلکیں گرنے اُٹھنے لگیں۔ from others

"The person you love is always different

from others سمجھا''۔ وہ پستول سے گولیاں نکالنے لگا۔

وہ اب بھی کچھ نہیں بولی۔ کہتی بھی کیا؟

''آؤ چلیں۔ دادا جان انتظار کر رہے ہوں گے''۔ زار نے ہی کہا۔

اور وہ خاموشی سے ساتھ ہولی۔

خوبصورت شام گھِر آئی تھی۔ حویلی کے پچھواڑے لان کی گھاس نفاست سے تراشی گئی تھی، روشوں میں موسم کے تازہ پھول بہار دکھا رہے تھے، خوبانی کے درختوں میں کھلے شگوفے بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔

یہیں چند کرسیوں پر سب سمٹ آئے تھے۔ درمیان میں میز رکھی تھی، اور یہیں سالگرہ کا کیک کٹنا مقصود تھا۔

برتھ ڈے پر اور کوئی مدعو نہیں تھا۔ بس دادا جان، زار، نی شے اور کرامت بابا تھے۔ گاؤں کے لوگوں کو زار نے دن کا کھانا کھلا دیا تھا، کپڑے تقسیم کروائے تھے، یوں اُن سب کو بھی اپنی خوشی میں شریک کرلیا تھا۔

خوشگوار باتوں میں مصروف وہ لوگ میز لگنے کا انتظار کر رہے تھے۔

تبھی۔۔۔ حمیدہ پاس آ گئی۔

"بڑے صاحب آپ کے مہمان آئے ہیں"۔ وہ مؤدب طریق سے بولی۔

"کرامت دیکھو کون ہیں۔ بٹھاؤ، ہم آتے ہیں"۔ دادا جان نے کرامت بابا کو بھیجدیا۔

اور۔۔۔ تھوڑی ہی دیر میں کرامت بابا کی ہمراہی میں۔۔۔ سعید احمد بمعہ اپنی بیٹی شازیہ کے وہیں آ گئے۔

"رضا صاحب اکیلے اکیلے سالگرہ وہ بھی اپنے فارمز پر۔۔۔ ہم نے سوچا ہم کیوں پیچھے رہیں سو آ گئے"۔

پینسٹھ چھیاسٹھ سالہ سعید احمد کی دادا جان سے کاروباری جان پہچان تھی۔

اور شازیہ کو نی شے کچھ عرصہ قبل شہر میں دادا جان کے یہاں ڈنر پر زار سے باتیں کرتے دیکھ چکی تھی۔

"اوہ۔۔۔ تو آپ بھی یہاں موجود ہیں"۔ شازیہ کو جیسے نی شے کی موجودگی کچھ اچھی نہ لگی۔

"ہیلو" نی شے نے آہستہ سے کہا۔

سب وہیں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"بھئی یہ آپ نے بڑا اچھا کیا آ گئے"۔ دادا جان بولے۔ "اور شازیہ بیٹی کو بھی لے آئے یہ اُس سے بھی زیادہ اچھا کیا ہے اِسی بہانے گاؤں بھی دیکھ لے گی"۔

"اِسی کے تو اصرار پر آیا ہوں۔ دراصل صبح گئے آپ کی طرف وہاں معلوم ہوا آپ تو گاؤں چل پڑے ہیں سالگرہ ہے آپ کی۔ بس شازیہ کی ایک ہی ضد تھی ہم بھی چلیں گے"۔

"بہت خوب، بہت اچھا کیا"۔

اور یوں۔۔۔ دادا جان کی سالگرہ میں دو لوگوں کا اور اضافہ ہو گیا۔

کیک کٹا، تالیاں بجیں، رات پر تکلف ڈنر کھایا گیا۔

سعید احمد کو بمعہ شازیہ کے پرلی طرف مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا۔ اور۔۔۔ نی شے

حویلی کے اندر۔۔۔ تھکی تھکائی اپنے کمرے میں گئی، کپڑے تبدیل کر کے بستر میں لیٹی تو آنکھیں چھت پر جمائے اُسے احساس ہوا۔

شازیہ کے ساتھ ساتھ سعید احمد کو بھی اُس کی یہاں موجودگی بار گزر رہی تھی۔

شازیہ بات بات میں زار کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش میں لگی تھی اور سعید احمد جیسے کاروبار کے ساتھ ساتھ اپنی بیٹی کا بھی لائف پارٹنر دیکھنے کے خواہشمند تھے۔

خواہش ہر بات ہر حرکت سے اتنی صاف عیاں ہو رہی تھی کہ۔۔۔ وہاں موجود سبھی بخوبی سمجھ سکتے تھے۔

زار البتہ۔۔۔ سب سے بات سب سے برتاؤ اُس کی عمر اُس کے رتبے کے لحاظ سے کر رہا تھا۔ بلکہ نی شے سے زیادہ بات ہی نہ کی تھی۔ شاید اُسے اپنا سمجھتا تھا اور اپنوں سے تکلف نہیں کیا جاتا!

بہر حال۔۔۔ اُس نے بات ذہن سے جھٹکی۔ تھکی ہوئی تھی۔ آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

داداجان واپس جارہے تھے۔ زار کی غیر موجودگی میں اُن کا وہاں رہنا ضروری تھا۔ نی شے بھی تیار ہورہی تھی ـــ زار Upset سا تھا، برتھ ڈے ختم ہو چکی تھی اور اب نی شے کا مزید رک جانے کے لئے کوئی جواز نہیں تھا۔

''بڑے صاحب''۔ دفعتاً خدیجہ اندر آ گئی۔ ''چھوٹی بی بی کو چھوڑ جائیں۔ پرسوں ہی تو سعیدہ کی شادی ہے۔ خوش ہو جائے گی ہمارے دستور بھی دیکھ لے گی''۔

''ہوں۔'' خدیجہ کی بات پر داداجان جیسے سوچ میں پڑ گئے۔

''آپ بھی تو آئیں گے۔ پھر ساتھ میں بی بی کو بھی لے جائیں گے۔''

اُس نے سارا پروگرام ہی طے کر دیا۔

تبھی سعید احمد اور شازیہ تیار ہو کر آ گئے۔

''چلئے رضا صاحب اکٹھے ہی نکلتے ہیں پھر'' سعید احمد بولے۔

''ہاں ـــ چلتے ہیں بس۔ یہ ذرا ـــ خدیجہ نے ایک اور مسئلہ کھڑا کر دیا ہے''۔ وہ اب بھی جیسے الجھے ہوئے تھے۔

''کیا مطلب؟''

خدیجہ کی بیٹی کی پرسوں شادی ہے۔ اِس کا خیال ہے کہ نی شے یہیں رہ جائے۔''

''بہت خوب۔ اگر نی شے یہاں رہ رہی ہے تو شازیہ بھی رہ جائے کیوں شازیہ؟'' سعید احمد فوراً بولے۔ ''زار بھی اِدھر ہیں تمہیں فارمز پر بھی گھما لائیں گے''۔

“I would love it papa”.

''کیوں نہیں ـــ اگر شازیہ بیٹی کا دل چاہتا ہے تو ضرور رہ لے''۔

داداجان نے فراخدلی سے کہا۔

اُن لوگوں نے اُن کے یہاں ٹھہرنے کی بات کی تھی اور مہمان نوازی اُن کا ایمان تھا۔

گو وہ سمجھتے تھے سعید احمد کے ارادے۔

سعید احمد اچھے تھے اُن کی بیٹی قابل عزت ـــ مگر ـــ

یہ بات تو عمر بھر کی تھی، چندروز کی نہیں ـــ انہیں اپنے پوتے کے لئے اونچے گھرانے کی نہیں اونچے اخلاق کی لڑکی چاہئے تھی۔ اونچی سوسائٹی کی نہیں اونچے صفات کی لڑکی کی ضرورت تھی۔ وہ لڑکیوں کی بے جا آزادی کے روادار نہیں تھے، اُنہیں لڑکی گھر کی چاردیواری سے باہر نہیں بلکہ گھر کے اندر اچھی لگتی تھی۔ سوشل میٹنگز اٹینڈ کرنے کی بجائے اپنے شوہر اور بچوں کی خدمت کو اُس کی جنت سمجھتے تھے۔

اُن کی نظر میں شادی ایک پاکیزہ بندھن تھی ـــ حیا، پاکدامنی اور دو دلوں کے سمبندھ پر مبنی بندھن۔ جو ـــ دیرپا ہوتی ہے، اٹوٹ ہوتی ہے۔

اور پھر فیصلہ ہو گیا ـــ شازیہ اور نی شے دونوں پیچھے رہ رہی تھیں۔

''کرامت تم بھی یہیں رہ جاؤ'' داداجان دھیرے سے اپنے پاس کھڑے کرامت بابا سے بولے۔

''جی بہتر'' وہ جیسے فوراً اشارہ سمجھ گئے۔

اور ـــــ زار کی نظریں خواہ مخواہ نی شے کی طرف اُٹھ گئیں۔ کہ ایک بار پھر اُن دونوں پر پہرے دار مقرر کیا جانے والا تھا۔

''اور ـــــ خدیجہ کو اچھی طرح سمجھاؤ رات کو ایک دو عورتیں یاد سے نی شے کے پاس سو جایا کریں۔'' وہ مزید بولے۔

اور یوں ـــــ دادا جان اور سعید احمد چلے گئے۔ نی شے اور شازیہ وہیں رہ گئیں۔

شازیہ کو زار کے یہاں ڈنر پر تھوڑا بہت شبہ ہوا تھا۔ اتنی بے پناہ خوبصورت لڑکی اور ـــــ اُس پر زار کا اُسے کسی نوجوان کے قریب سیٹ پر بیٹھنے پر یوں ڈانٹ دینا۔ اُس کے بے انتہا غصے کے باوجود اُس کے ساتھ کسی لگاؤ کا اشارہ دیتا تھا۔

پھر کل اُسے یہاں دیکھ کر تو اُس کے شبے کو اور بھی تقویت ملی۔ رات پاپا بتا رہے تھے۔ رضا صاحب نی شے کو گھر کے ایک فرد کی طرح اپنی بیٹی کی طرح سمجھتے تھے۔ اور یہ کہ اُس کا اور کوئی نہیں تھا سوائے اُن کے ـــــ شازیہ کے خیال میں اُن لوگوں نے اُسے پناہ دی تھی مگر ـــــ

یہ حقیقت تو اپنی جگہ تھی کہ وہ بے حد حسین بے اندازہ نازک تھی اور ـــــ اُس کی باتوں کا آہستہ آہستہ، نرم و ملائم انداز ـــــ

چونکا دینے والی حد تک دلکش اور بے پناہ کشش کا حامل تھا۔

وہ بلاشبہ کسی پتھر دل کو بھی محض اپنی گفتگو سے ہی موم کر سکتی تھی۔

دل میں نفرت و حقارت کا ریلا لئے وہ نی شے کو باہر برآمدے میں ہی چھوڑ سیدھی اندر ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔

زار فارمز پر جانے کے لئے تیار تھا۔ آج کچھ ضروری پیمائش کرنی تھیں۔ پٹواری باہر حجرے میں انتظار کر رہا تھا۔

کوریڈور میں سے گزرتے گزرتے اُس کی نظریں غیر ارادی طور پر نی شے کے کمرے کی طرف اُٹھیں۔ سامنے کوئی نظر نہیں آیا۔

وہ آگے بڑھنے لگا۔

بائیں طرف ڈرائنگ روم پر نظر پڑی۔ دور پرلے حصے میں ـــــ کھڑکیوں کے

پاس لگے پیانو کے پاس شازیہ کھڑی اِدھر ہی دیکھ رہی تھی۔

''میں کام سے جا رہا ہے۔ آپ پلیز۔ اپنا گھر سمجھیں ـــــ نی شے بھی اِدھر ہے آپ اکیلا محسوس نہیں کرے گا''۔ وہ وہیں رک کر بولا۔

شازیہ کو چھوٹتے ہی نی شے کا ذکر اور زار کا اُس کا نام بے تکلفی سے لیتے اور بھی زہر لگا۔

''آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ آپ نے اپنی تنہائی دور کرنے کا سامان کر لیا ہے''۔ پاس آتے ہوئے وہ گہرے طنز سے بولی۔

زار حیران سا ہوا۔ شازیہ کا رجحان کچھ عرصہ سے اُس کی طرف تھا وہ سمجھتا تھا مگر خود اُس نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جس سے وہ اپنا اتنا حق سمجھ لیتی کہ یوں طنز و تشنیع پر اتر آتی ـــــ بہر حال ـــــ

''میں تو کبھی تنہا نہیں رہا''۔ خوبصورتی سے کندھے اُچکاتے ہوئے مسکرا کر اُس نے بات ٹالنا چاہی۔

''ایک بیچلر تنہا ہی ہوتا ہے''۔ قریب آ کر وہ رک گئی۔ طنز اب بھی اپنی جگہ تھا۔

''اوہ ـــــ پھر تو تنہا ہی ہے۔'' وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔

''وہی تو کہہ رہی ہوں تنہائی دور کر دی ہے آپ نے''۔

زار کو بار بار یہ ذکر اچھا نہیں لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ ایک لڑکی کی بھی عزت کا سوال تھا ـــــ مگر ـــــ

''میں آپ کا بات پہلے بھی کبھی نہیں سمجھ سکا ہے''۔ اُس نے اب بھی خوشگوار لہجے میں کہا۔

''اور اب بھی سمجھیں گے بھی نہیں ـــــ نی شے جو آ گئی ہے''۔ اُس نے نی شے پر زور دے کر کہا۔

''دیکھیں میڈم ـــــ کسی کا نام اس طرح نہیں لینا چاہئے برا بات ہے''۔

اُس نے اب بھی بہت ضبط کیا۔ ''میں چلتا ہے۔ دیر ہو رہا ہے ـــــ See you later.'' وہ باہر نکل آیا۔

برآمدے کے سفید مرمریں ستون سے لگی نی شے کھڑی تھی۔

اُس نے ایک نظرنی شے پر ڈالی مگر — کچھ کہے بنا آگے بڑھ گیا۔ کچھ اُس کا موڈ بھی ٹھیک نہیں رہا تھا اور پھر — وہ نہیں چاہتا تھا کہ ڈرائنگ روم میں ہنوز موجود شازیہ اُسے اُس سے بات کرتے دیکھے اور خواہ مخواہ نی شے پر کیچڑ اُچھلے۔

نی شے چپ چاپ سی اندر آ گئی۔ زار کا انداز کیوں بجھا بجھا تھا وہ کچھ نہ سمجھ سکی — کچھ شازیہ کی طرف سے بھی پریشان سی تھی۔ رات ہی اُسے خاصا باپ بیٹی نظروں ہی نظروں میں جیسے بوجھ گردان رہے تھے۔ کچھ حقارت سی بھی تھی نظروں میں جیسے کمتر سمجھتے ہوں اُسے کہ وہ واقعی کسی مِل اونر کی بیٹی نہیں تھی — کچھ طنز سا بھی تھا انداز میں جیسے کہ وہ کون تھی جو اُن کی بیٹی کے مقابلے میں جم پائے گی۔

نی شے کو اپنا آپ اچانک تنہا محسوس ہوا۔ دنوں بعد جیسے احساس ہوا وہ کہاں آ گئی تھی؟ اور زار بھلے اُس سے پیار کا دعویٰ کرتا تھا دادا جان بہت عزیز جانتے تھے مگر —

کیا ضروری تھا وہ اُن دونوں کی شادی بھی کر دیتے؟ کیا زار بھی سیریس تھا اِس معاملے میں؟ وہ پہلی بار چونکی۔

وہ کیوں بلا سوچے سمجھے اتنا آگے نکل آئی تھی؟

دوپہر کا کھانا اُس نے اور شازیہ نے اکٹھے کھایا۔ زار کھانے پر نہیں پہنچ سکا تھا شاید مصروف تھا، شازیہ کا طرزِ عمل وہی تھا۔ تیز تیز چبھتی باتیں۔ تلخ طنزیہ مسکراہٹیں۔

"کارڈز کھیلیں گی آپ؟" کھانے کمرے سے نکل کر دونوں اپنے اپنے کمرے میں جانے لگیں تو نی شے نے اُسے دعوت دی۔

"نو — میں اِن ڈور گیمز نہیں کھیلتی۔" وہ طنز سے مسکرائی۔ "گاؤں کی لڑکیاں بہت ہیں آپ اُن کے ساتھ کھیل سکتی ہیں"۔ وہ پرلی طرف مہمان خانے کی جانب بڑھی۔

اور نی شے کے لبوں پر اُداس سی مسکراہٹ آ گئی۔ کیا گاؤں کی لڑکیاں اُس کی نظروں میں کچھ نہیں تھیں۔

اور پھر واقعی — وہ ساری دوپہر حمیدہ کے ساتھ اشاروں کنایوں میں گپ شپ

کرتی رہی۔ کبھی کچھ کچھ سمجھ جاتی اور کبھی تو بالکل ہی نہ سمجھ پاتی۔

"آپ پریوں کی طرح نازک اور خوبصورت ہیں"۔ حمیدہ اُسے متاثر سی نظروں سے دیکھتے ہوئے محبت سے کہہ رہی تھی۔

اُس نے اپنی عادات و اطوار سے چند گھنٹوں میں ہی اُن کے دلوں میں گھر بنا لیا تھا۔

"اتنا آسمان پر مت چڑھاؤ پھر نیچے کون اُتارے گا"۔ زار تھا کوریڈور میں سے گزرتے گزرتے رک گیا تھا۔

حمیدہ جھینپ کر وہاں سے چلدی۔

"کیا ہو رہا ہے؟" شازیہ کو شاید معلوم ہو گیا تھا کہ زار آ گیا ہے۔ چل کر اُس کے پیچھے پیچھے ہی نی شے کے دروازے میں آ کھڑی ہوئی تھی۔

"کچھ نہیں۔" زار نے جلدی سے کہا — "تم لوگ بیٹھو میں نہا کر آتا ہے"۔

"ہونہہ — میں بیٹھنے کے لئے یہاں نہیں رکی۔ آپ مجھے فارمز پر لے چلیئے۔"

اور زار — مسکرا دیا۔

وہ بالکل یوں بول رہی تھی جیسے زار کے جملہ حقوق اُس کے نام محفوظ ہو چکے ہوں۔

"کل محترمہ — میں بہت سخت تھکا ہوا ہوں آج دوبارہ جانا ممکن نہیں ہے"۔ نرمی سے بولا۔

"لیکن میں آج ہی جاؤں گی"۔ وہ آج پر زور دیتے ہوئے بولی۔ پتہ نہیں کیوں اس کی آواز میں دھونس سی بھی تھی جیسے۔ وہ نادانستگی میں شاید نی شے کو دکھانا چاہتی تھی کہ وہ زار کی زیادہ حقدار تھی۔

"اچھا میں کرامت بابا کو کہتا ہے وہ آپ کو لے جا کر گھما دیگا..."

"مائے فٹ۔" اُس نے تلملا کر کہا۔ "میرا خیال ہے کہ میں اور زیادہ یہاں نہیں رکتی۔" کرامت بابا کا خیال ہی اُسے اپنی تضحیک لگا۔ کھٹ پٹ کرتی وہاں سے مڑی۔

زار چند لمحے اُسے جاتے دیکھتا رہا — پھر جیسے الجھتے ہوئے کندھے اچکائے۔

"یہ کیوں اس طرح کر رہا ہے۔ کیا ہو گیا ہے اِس کو"۔ وہ جیسے خود سے کہہ رہا تھا۔

"میں سچ مچ بہت تھک گیا ہے—"

وہ واقعی نڈھال لگ رہا تھا۔ پرکشش نقوش ماند سے اور دلنشیں آنکھیں تھکی تھکی سی تھیں۔

"کھانا کھایا ہے آپ نے"۔ تین بج چکے تھے۔ ابھی کچھ ہی دیر قبل خدیجہ اُس سے اجازت لے کر سعیدہ کی شادی کے سلسلے میں ضروری کاموں سے نمٹنے گھر جا چکی تھی، باہر اور بھی کوئی نظر نہ آتا تھا۔ شاید دوپہر ہونے کی وجہ سے آرام کی غرض سے چلے گئے تھے سب — پتہ نہیں کیوں وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"نہیں۔" وہ اپنائیت سے اُسے دیکھنے لگا۔ اُس کا یوں پوچھ لینا اُسے اچھا لگا۔ جیسے اُسے اُس کی فکر ہو جیسے وہ اُس کی ذمہ داری ہو۔ "تم کھلا دو نا"۔

اور اُس نے آہستہ سے قدم آگے بڑھائے۔

"کچن میں آجائیے گا"۔ وہ اُس کے پاس سے دروازے سے نکلنے لگی۔

"کچن میں؟"

"ہاں۔" وہ مسکرا دی۔ "آج وہیں تکلیف فرمائیے گا"۔ اُس کی بات میں اُ
کے ہمیشہ پرتکلف طور پر کھانے پینے پر لطیف سی چوٹ تھی۔

پتہ نہیں کیوں؟ زندگی میں پہلی بار اُسے اچھا سا لگا۔ کچن میں کھانا کھانا — و
نہ کسی بیرے کے ہاتھوں نہ کسی کک کے۔

"تم کھلاؤ گی نا؟"

"ظاہر ہے۔ نوکر آرام کر رہے ہیں میں انہیں تو نہیں بلاؤں گی"۔

کتنی اچھی تھی۔ کتنی منکسر المزاج تھی، نہ کوئی تکبر نہ غرور — وہ اُسے اور بھ
لگی۔

"میں بس جلدی نہا کر آتا ہے۔ ہاں"۔ وہ اپنائیت سے بولا۔

اور نی شے کچن میں آ گئی۔

وہ کچن سے کچھ کچھ واقف تھی۔ دن کو خدیجہ کھانا پکانے کی تیاری کر رہی تھ

یہیں آ کر اُس کے پاس کھڑی رہی تھی۔

اُس نے جلدی جلدی دیگچوں میں کھانے دیکھے۔ پھر باری باری سب کو گرم کیا۔
نزیب ہی پینٹری میں برتن رکھے تھے، لا کر ڈونگوں میں سالن نکالے۔

اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہیں کچن میں ایک طرف تخت رکھا تھا باہر تار پر دھلا دسترخوان
پڑا تھا وہ لا کر اُس نے تخت پر بچھایا۔ اور کھانا وہیں لگا دیا۔ سلاد کاٹ کر رکھی، پلیٹیں،
انی کا جگ گلاس — سب ٹھیک ٹھاک کر دیا۔

تبھی زار آ گیا۔ گرے شلوار قمیض، دھلے دھلے بال، نکھرا نکھرا چہرہ، شفاف
نکھیں۔ نہا کر وہ فریش لگ رہا تھا۔

"آج یہیں بیٹھ کر کھانا کھانا پڑے گا"۔

زار نے تخت پر نظر ڈالی۔ دھیرے سے مسکرایا اور آگے بڑھتے ہوئے آرام سے
لتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

"تم بھی بیٹھو نا"۔

وہ بھی سامنے کے کونے پر بیٹھ گئی۔

"تمہارا کیا خیال ہے میں اِس طرح کھانا نہیں کھا سکتا"۔ وہ پلیٹ میں سالن نکال
سکراتے ہوئے بغیر کسی چمچ چھری یا کانٹے کی مدد کے کھانا کھانا شروع ہوا۔

"میں نے کب کہا"۔ اِس کے باوجود وہ اُس کے اناڑی سے انداز پر مسکرا رہی
ی۔

"ویسے مجھ کو اچھا لگ رہا ہے۔ تم بھی کھاؤ نا"۔

"میں نے کھایا ہے"۔

"تو — منہ کھولو —" وہ نوالہ بنا کر اُس کے منہ کے پاس لے گیا۔

اُسے منہ کھولنا ہی پڑا۔

اور تبھی — شازیہ اندر آ گئی۔

چند لمحے تو جیسے سکتے میں رہی۔ پھر چہرے پر سینکڑوں تلخیاں اُبھر آئیں۔ آنکھوں
نحیک اتر آئی۔

"اتنے نیچے آ جائیں گے آپ۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔" وہ طنز سے بولی۔

گو زار اُس کے عین نی شے کے منہ میں نوالہ دیتے وقت آ جانے پر کچھ گڑبڑا سا ضرور گیا تھا۔ مگر پھر جلدی ہی سنبھل بھی گیا تھا۔ کہ یہ خالصتاً اُس کا اپنا ذاتی معاملہ تھا۔

"کیا مطلب؟"

"مجھے آپ پر ترس آ رہا ہے۔ میز کرسی سے تخت پر اُتر آئیں گے یہ نہیں سوچا تھا۔

"تخت تو کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے"۔ اُس نے ایک نظر نی شے پر ڈالتے ہوئے خوشگواری سے کہا۔

"ظاہر ہے"۔ اُس کی نظریں نی شے پر تھیں۔ "ویسے یہی حال رہا تو ایک دن چولہے پر کھاتے نظر آئیں گے"۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ جب میرا بیوی میرا بچے کو سنبھالے گا تو میں چولہے پر ہی کھانا کھائے گا۔" وہ خوبصورتی سے ہنس دیا۔

"کیوں۔ دیوالیہ ہونے والے ہیں کیا؟"

"وہ تو میں کبھی کا ہو گیا ہوں"۔ جانے کیا مطلب تھا اُس کا مگر۔۔۔

وہ اب بھی ہنس رہا تھا۔

اور شازیہ غصے میں واپس پلٹ گئی۔

"اے۔۔۔ بات سنو"۔ وہ جلدی سے بول پڑا۔

مگر وہ کچن سے باہر نکل چکی تھی۔

رخ واپس موڑ کر وہ نی شے کی طرف دیکھنے لگا۔ سارے طنز اپنے وجود پر سہتی وہ جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔

وہ سمجھ رہا تھا اُس کے محسوسات۔ شازیہ کھلم کھلا اُس کی بے عزتی کر رہی تھی۔

مگر۔۔۔ وہ بھی کیا کرتا؟ وہ اُس کی مہمان بھی تو تھی۔۔۔ ورنہ۔۔۔

کہیں اور اِس نے اِس قسم کی اور اِس لہجے میں باتیں کی ہوتیں تو وہ اتنا پولائیٹ کبھی نہیں رہتا۔

"نی شے"۔

"جی"۔ اُس نے جھکا سر اُٹھایا۔

اوہ۔۔۔ اُس کی نیلی آنکھیں نم تھیں۔ شربتی رنگوں میں اُداسی، دکھ گڈمڈ ہو رہے تھے۔

"پلیز نی شے۔ مجھے معاف کر دو۔۔۔ میں۔۔۔"

اور پتہ نہیں کیوں؟ نی شے اپنے آنسو آنکھوں ہی میں چھپاتی وہاں سے اُٹھ آئی۔

اپنے کمرے میں گئی اور بستر پر پڑ کر بے اختیار رو دی۔

وہ الجھ سی گئی تھی۔ یہ لڑکی بار بار اُس کی انسلٹ کر رہی تھی۔ زار اُسے۔۔۔ چپ بھی کرا سکتا تھا۔ پہلے کے مراسم تھے شاید پھر اُس کی مہمان بھی تھی۔

بہر حال۔۔۔ شام چائے اُس نے کمرے میں ہی منگوا لی۔۔۔ اور۔۔۔

تھوڑی دیر بعد وہ چونکی۔ زار شاید کہیں باہر جا رہا تھا۔ خاصا تھکا ہوا تھا پہلے ہی۔ نہ جانے کیا کام پڑ گیا تھا؟

رات ڈنر پر کرامت بابا اُسے بلانے آئے تو اُس نے بھوک نہ لگنے کا بہانہ کر دیا۔

شازیہ کا زار کی موجودگی میں سامنا ہی نہ کرنا چاہتی تھی۔

زار کا اِس میں دوش نہیں تھا مگر اُسے زار پر بھی غصہ تھا۔

یوں ہی بستر میں گھس کر سو رہی۔

صبح اٹھی۔ حمیدہ قریب قالین پر بستر لگا کر سو رہی تھی اُسے بھی جگایا۔ منہ ہاتھ د
اُس نے لیمن رنگ کے کاٹن کی قمیض شلوار پہنی، سفید ڈوری کی نازک سینڈل پ
کپڑوں کے ہمرنگ شفون کا بڑا سا دوپٹہ لیا۔ اور رسالہ لے کر کھڑکی کے قریب ر
صوفے پر بیٹھ کر خالی خالی نظروں سے اوراق پلٹنے لگی۔

تبھی ـــ خدیجہ ٹرے میں ناشتہ لئے آ گئی۔

کل تو سب نے مل کر ڈائننگ روم میں ناشتہ کیا تھا آج ـــ بہر حال ـــ

''چھوٹے صاحب کہتے تھے آپ کا ناشتہ آپ کے کمرے میں دے دیا جا۔

اُس کے سامنے میز پر ٹرے رکھتے ہوئے خدیجہ نے اُس کی الجھن دور کر دی۔

اُس نے بھی نہیں پوچھا کہ زار خود کہاں ناشتہ کر رہا تھا یا پھر شازیہ کہاں تھی؟

رسالہ ایک طرف رکھ کر وہ آہستہ آہستہ چھری سے ٹوسٹ پر مکھن لگانے لگی۔

''بی بی رات میں کمرے میں آئی تو آپ سو رہی تھیں''۔ خدیجہ وہیں نیچے قالین پر
ھ گئی۔

''ہاں۔ میں جلدی سو گئی تھی''۔

''رات دراصل شازیہ بی بی کا چھوٹے صاحب سے جھگڑا ہو گیا''۔ وہ آہستہ
ہستہ بتانے لگی۔

''کہاں؟''۔

''شازیہ بی بی کے کمرے میں''۔

''اوہ۔'' وہ پھر اُلجھنے لگی۔

''میں اصل میں اُس طرف نل کے پاس دیگچے دھو رہی تھی۔ سب صاف سنائی
ے رہا تھا۔ پہلے چھوٹے صاحب اور شازیہ بی بی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ چھوٹے
احب کہہ رہے تھے، اتنا تھکا تھا پھر بھی تم کو فارمز پر لے گیا اب کیوں خفا ہو مگر۔
ازیہ بی بی بہت غصہ میں تھیں۔ چھوٹے صاحب نے بڑا منایا مگر ـــ وہ کسی طرح مان
ی نہیں رہی تھیں۔ یہی کہتی تھیں کل صبح سویرے مجھے بھیجیں۔ پھر آج صبح صبح نکل گئیں
رائیور کے ساتھ ـــ''

تو ـــ کل وہ دوبارہ فارمز پر گیا تھا۔

اور ـــ اِس وقت اُس کا ناشتہ اِس لئے کمرے میں بھجوایا گیا تھا کہ شازیہ جا چکی تھی
ور زار شاید اُس کی روانگی سے پریشان تھا ناشتہ ہی نہیں کر رہا تھا۔

پتہ نہیں کیوں؟ اُسے اپنے اور زار کے درمیان فاصلہ سا نظر آنے لگا۔

خاموشی سے ناشتہ کیا اور ـــ کوریڈور میں نکل آئی۔

''رات دراصل شازیہ بی بی کا چھوٹے صاحب سے جھگڑا ہو گیا۔''

''کہاں؟''

''شازیہ بی بی کے کمرے میں۔ چھوٹے صاحب کہہ رہے تھے اتنا تھکا تھا پھر بھی تم
کو فارمز پر لے گیا اب کیوں خفا ہو ـــ چھوٹے صاحب نے بڑا منایا ـــ''

ذہن میں خدیجہ کی باتوں کی گونج لئے وہ اوپر کی منزل پر دادا جان کی لائبریری میں آ گئی۔

رات وہ ڈنر پر نہیں گئی تھی مگر زار نے وجہ معلوم کرنے کے لئے کسی ملازم تک کو نہ بھیجا۔ آج تک اُس نے اُس کے کمرے کی دہلیز تک پار نہ کی تھی۔ شازیہ کے وہ پرلی طرف اتنی دور اُس کے کمرے میں گیا۔ وہ غصہ ہوئی تو اُسے منانے لگا۔

ایک بار پھر اُسے زار اپنے آپ سے دور فاصلے پر نظر آنے لگا۔

دادا جان کی لائبریری خاصی وسیع تھی۔ کارپٹڈ اور ہوادار تھی۔ بے شمار شیلف یہاں سے وہاں تک تقریباً ہر موضوع کی کتابوں سے سجے تھے۔ بڑی بڑی ضخیم کتابیں تھیں، درمیانے سائز کی، چھوٹی، پتلی ہر قسم کے کتب و رسائل موجود تھے۔ کتابوں کی نوعیت کے لحاظ سے سیکشن بنائے گئے تھے۔ ہر سیکشن پر کتابوں کی قسم درج تھی، یوں کہ دیکھنے والے کو باآسانی مطلوبہ چیز مل جاتی تھی۔

پوری لائبریری میں عمدگی، نفاست اور صفائی کا بے حد خیال رکھا گیا تھا۔ چوڑی کھڑکی کے پاس آرام دہ لاؤنجر اور ساتھ ہی میز تھی۔ پڑھنے والا کتاب کے ساتھ ساتھ اطراف کی ہریالیوں، دور بہتے نہر کے سیمیں پانیوں اور اُس پر سرمئی پہاڑ کے پیچھے ڈوبتے سورج کے نظارے سے بھی لطف اندوز ہو سکتا تھا۔

آگے بڑھ کر وہ مختلف کتابوں پر نظریں دوڑانے لگی۔

کچھ کتابیں زار کے پردادا کے وقتوں کی تھیں، اُن پر اُن کا نام اور تاریخیں درج تھیں۔ کچھ پر داداجان کے نام تھے۔ لگتا تھا پشت در پشت مطالعے کا شوق رہا تھا۔ سائنس، ہسٹری، لٹریچر، نفسیات، سیاست، شکاریات، کوئی بھی تو موضوع ایسا نہیں تھا جس پر یہاں کتابیں موجود نہ تھیں۔

وہ لٹریچر کے سیکشن پر آ کر رُک گئی مگر ــــ یہاں بھی خاصا غور طلب لٹریچر تھا۔ بھاری اور سوچنے والی کتابیں تھیں۔ وہ کوئی ہلکی پھلکی چیز ڈھونڈنے لگی۔

شیکسپیئر کا سیٹ تھا، ڈکنز، ڈی ایچ لارنس، ٹی ایس ایلیٹ، بائرن، ورڈز ورتھ ــــ اور ــــ

اُس نے وہی نکال لی۔ ورڈز ورتھ اُسے اچھا لگتا تھا۔ عام لوگوں کے عام واقعات عام زبان میں۔ نیچر کا تمام تر حسن جیسے اُسی کے قلم کا مرہونِ منت ہو۔

کتاب لے کر وہ کھلی کھڑکی کے پاس لاؤنجر پر آ بیٹھی۔

پہلی ہی نظم پڑھ رہی تھی کہ۔ سیڑھیوں پر بھاری قدموں کی چھاپ سنائی دی۔ زار کے سوا یہ کوئی اور نہ تھا۔

پتہ نہیں کیوں؟ اُس کے خوبصورت چہرے پر سایہ سا لرز گیا۔ ماتھے پر شکن نمودار ہوئے۔

''تم یہاں ہے اور میں نے پورا حویلی چھان مارا۔'' نائیٹ سوٹ پر ہاف لینتھ قیمتی گاؤن لئے وہ لائبریری میں داخل ہوا۔

''کیا ضرورت تھی''۔ کتاب اب بھی اُس کے آگے تھی ــــ لہجہ بدلا بدلا سا۔

زار حیران سا ہوا۔

''کیا بات ہے؟'' آگے بڑھ کر اُس نے اُس کی کتاب بند کر دی۔

''کچھ نہیں''۔ اُس نے کتاب دوبارہ کھول لی۔

''کیا ہوا ہے؟''

نی شے نے نظریں کتاب پر جما دیں۔ بولی کچھ نہیں۔

''واہ ــــ میں تو برباد ہو جائے گا''۔ اُس کا انداز بہت معصومانہ تھا۔ ''اُدھر وہ ناراض اِدھر یہ خفا''۔ وہ خوشدلی سے بولا۔

''میں خفا نہیں ہوں''۔ زار کا اُس کا شازیہ سے مقابلہ کرنا اُسے اور بھی برا لگا۔

''پھر؟ غصہ ہے''۔ وہ گھٹنہ ٹیکتے ہوئے اُس کی کرسی پر جھک گیا۔

''آپ ــــ پڑھنے دیں مجھے''۔

زار نے ایک نظر اُس کو دیکھا۔ خفا خفا، برہم برہم وہ اور بھی اچھی لگ رہی تھی۔ وہ مسکرا دیا۔ پھر نظریں اُس کے سامنے کھلی کتاب پر گئیں۔

''ورڈز ورتھ پڑھ رہا ہے''۔

وہ چپ رہی۔

"ہونہہ۔ یہ بھی کوئی پوئیٹ ہے"۔ اُس نے اُسے چڑایا۔

"مجھے اچھا لگتا ہے"۔ اُس کی نظریں بدستور کتاب پر جمی تھیں۔ وہ بھی سرسری نظر دوڑانے لگا۔

"ہہہ۔ سُست پڑ جاؤ گی اُس کی طرح"۔ اب اُس کی آنکھیں نئی شے کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ نظریں شوخ اور مسکراہٹ شریر تھی۔

"وہ سست نہیں تھا بہترین پوئیٹ تھا"۔ اُسے اپنے پسندیدہ شاعر کی برائی اچھی نہ لگی۔

"لیک ڈسٹرکٹ میں تو کوئی بھی رہتا تو پوئیٹ بن جاتا"۔ اُس کی نظریں برابر اُس کے چہرے پر جمی تھیں۔

"پھر تو سارے لیک ڈسٹرکٹ والے پوئٹس ہوں گے"۔

"ہیں نا"۔

"بس پڑھنے دیں مجھے۔ اچھا لگتا ہے مجھے۔ نیچر کو اُس سے بڑھ کر کس نے خوبصورتی دی ہوگی"۔

"ہاں ــــ یہ کہو نا"۔ وہ سیدھا ہو کھڑا ہوا۔ "وہ جنت میں پیدا ہوا تھا، جنت میں زندہ رہا تھا اور جنت ہی میں دفن ہوا تھا۔ اس کا پوئٹری میں تم کو Peace ستاروں بھرے آسمان میں ملے گا۔ اور نیند کسی پہاڑ کے Calm چوٹی پر آئے گا۔ اُس کا نیچر بہت پرسکون بہت پرامن ہے۔ نیچر کا دوسرا رخ کتنا خوفناک کتنا خونخوار ہے۔ اِس پر اُس نے کبھی قلم نہیں اٹھایا ــــ"

"نیچر کے خوفناک اور خونخوار رخ پر اُسے لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی"۔ اُس نے پھر اپنے من پسند شاعر کا سائیڈ لیا۔

"ہوں"۔ وہ کتابوں کی شیلفوں کی طرف چلا گیا۔ "تم کہہ سکتا ہے ایسا"۔ وہ مختلف کتابوں پر نظریں دوڑاتے ہوئے پھر کہنے لگا۔ "اُس کو کسی پہاڑ کا سائیڈ پر سِلپ ہوتے ایولانچ کا گرج نے کبھی اپنا طرف متوجہ نہیں کیا۔ کسی جنگل میں خونخوار ڈلف جان بھی لے سکتے ہیں یہ اُس نے کبھی نہیں سوچا۔ اُس نے تو انسانی زندگی میں

بھی کسی طوفان، کسی شعر کا ذکر نہیں کیا اور تو چھوڑو"۔ وہ ہنس دیا۔ "اپنا کلاسیکل پوئیم میں وہ تو ایک بیوی کو بھی نصیحت کرتا ہے کہ وہ اپنا جذبات پر کنٹرول کرے اور ــــ اب چھوڑو ــــ" جانے کیا کہنے والا تھا وہ؟ بات ادھوری چھوڑ کر شیلف سے ایک کتاب نکال کر الٹ پلٹ کرنے لگا۔

وہ اُس سے شاکی تھی مگر ــــ اُس کی لٹریچر سے دلچسپی اور معلومات کا اُسے آج علم ہوا۔ گو وہ ورڈز ورتھ سے خاصا ناراض لگ رہا تھا۔ اُس کی آخری بات اور اُس کے لب و لہجے پر تو اس نے اپنی ہنسی بمشکل ضبط کی۔

"نصیحت کرنا کوئی بری بات تو نہیں"۔ وہ اب بھی کتاب پر نظریں جمائے تھی۔

"ہاں"۔ وہ پھر اُس کی طرف متوجہ ہوا۔ "آتش فشاں پھٹنے سے جزیرہ Krakatoa کو اڑتے دیکھتا نا۔ جس کا گرد سال بھر تک پورا گلوب پر لٹکا رہا، جس کا وجہ سے لنڈن تک میں ڈوبتا سورج نیلا، سبز اور سرخ نظر آتا اور رات کو چاند اور ستارے سبز نظر آتے تو ــــ اُس کے شعر بھی نیلے سرخ ہو جاتے ــــ شعلوں کے بارے میں لکھنا شروع کر دیتا ــــ پتہ چل جاتا کہ نیچر منہ زور ہے، Destructive ہے۔ ہر پہاڑ لیک ڈسٹرکٹ کے کلفز کی طرح سرسبز اور پیس فل نہیں ــــ"

وہ چونکی... مذاق میں شروع کی ہوئی بحث کو وہ کہاں سے کہاں لے گیا تھا۔

یوں بول رہا تھا جیسے امن و آسودگی سے کوئی بیر ہو۔ تلخ ہو رہا تھا، جیسے امن و امان کی جگہ ڈسٹرکشن زیادہ اچھی لگتی ہو ــــ اُس کا یہ روپ نیا تھا!

"ہمارا ہی ملک میں سیلاب کا تباہیاں دیکھتا تو بھول جاتا اپنے دریا پر قصیدے لکھنا۔ میں حیران ہے اُس کو کبھی خیال نہیں آیا کہ ہر دریا ٹیمز کی طرح ٹیمڈ نہیں ہوتا، چپ چاپ سکون سے نہیں بہتا سر بھی اٹھا سکتا ہے، تباہی مچا سکتا ہے، لوگوں کو بے گھر کر سکتا ہے، عزیزوں کو ایک دوسرے سے جدا کر سکتا ہے، ہمیشہ کے لئے ختم کر سکتا ہے"۔

اُس کے پرکشش نقوش تناؤ کی زد میں تھے، ہونٹ بھینچے ہوئے۔

خفگی بھول بھال وہ ایک ٹک اُسے دیکھے جا رہی تھی۔

"اِس کلاشنکوف ایج میں ہوتا نا"۔ وہ پھر سے کہنے لگا۔ "تو چھوڑ بھاگتا سارا

شاعری جس طرح فرنچ ریولیوشن چھوڑ دیا تھا۔ انسان کو مضبوط ہونا چاہئے مضبوط۔ کسی بھی برا وقت کے لئے تیار۔ آگ ہونا چاہئے آگ''۔ اُس کی مٹھیاں بھنچ گئیں، جبڑے جڑ گئے۔۔۔ ''مقابلہ کرنے کا ہمت ہونا چاہئے۔ انتقام کا جذبہ ہونا چاہئے۔ بدلہ لینا چاہئے بدلہ۔۔۔ مگر۔۔۔ وہ کیا بدلے کا بات کرے گا اُس کے تو ملک میں اس قدر امن ہے کہ پولیس کا پاس بھی بندوق تو کیا چاقو تک نہیں ہوتا جس سے پبلک کا نہ سہی اپنا تو حفاظت کر سکے، چاقو۔۔۔'' جیسے وہ خود اپنی بات سے چونکا۔ ''کیا تمہارا شاعر نے چاقو سے کسی کو مرتے دیکھا ہے۔؟ کبھی اُس نے لکھا کہ سات آٹھ سال کے بچے پر کیا گزرا ہوگا جب اُس کا آنکھوں کے سامنے اس کا باپ کو چھرا مار دیا ہوگا؟'' کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا وہ۔ رُخ پھیر کر اُس نے سر بازو پر رکھتے ہوئے شیلف سے ٹکا لیا۔ کچھ دیر یوں ہی کھڑا رہا۔ جیسے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہو۔ ''انسان بہت دکھی ہے بہت درد کا مارا ہے۔۔۔'' بہت دور سے جیسے اُس کی ڈوبتی سی آواز آئی۔ دکھ تھا جس میں، درد تھا جس میں۔

''آپ۔۔۔ آپ کیوں دکھی ہو رہے ہیں؟'' وہ بھی بے چین سی ہوگئی، کچھ بتا نہ پا سکی۔

''ہوں''۔ چونک کر وہ اُسے دیکھنے لگا۔ ''نہیں تو''۔ پھر بھی۔۔۔ اُس کی آواز دُکھ گہرا ہوگیا، درد سوا ہوگیا۔ ''بس ویسے ہی کبھی کبھی''۔ وہ ہتھیلی سے اپنی کنپٹی، گردن سہلاتے ہوئے دوسرے ہاتھ میں پکڑی کتاب کو تکنے لگا۔ ''کیا کبھی کبھی ایسا نہیں ہو کہ انسان صرف اِس لئے خوش رہتا ہے کہ کوئی اور اُس کا دکھ نہ جان لے اِس لئے ہے کہ دوسرا اُس کا آنسو نہ دیکھ لے۔۔۔''

اُس کے لہجے میں بے پناہ اداسیاں تھیں، انداز میں بے اندازہ مایوسیاں تھیں۔۔۔ کیا وہ بھی دکھی تھا؟ مگر۔۔۔

اُسے کیا دُکھ ہو سکتا تھا؟ ایک پرنس کی سی شان وشوکت سے رہنے والے اِس آدمی کو کیا دُکھ ہو سکتا تھا؟

''پتہ نہیں کیا کیا کہہ گیا ہے میں''۔ وہ دُکھ سے مسکرایا۔ کتاب واپس اپنی جگہ

بھی۔ ''تمہارا شاعر بہت اچھا ہے۔ کبھی کبھی تو میں خود چاہتا ہوں کہ اُس کا دنیا میں کھو جاؤں، گم ہو جاؤں اپنا آپ کو بھی نہ ملوں۔۔۔'' رُخ اُس کی طرف کرتے ہوئے اُس نے اداس سی گہری سانس لی۔

وہ چپ چاپ اُسے دیکھے جا رہی تھی۔ اپنی ہر ناراضگی ہر خفگی بھول کر۔

پتہ نہیں کیوں وہ بھی دکھی ہوگئی تھی، افسردہ لگنے لگی تھی۔

''کیوں۔۔۔ تم کو کیا ہوگیا؟'' وہ اُس کی طرف آنے لگا۔

''کچھ نہیں''۔ وہ گود میں رکھی کتاب کو دیکھنے لگی۔

''اے''۔ اُس نے اس کا جھکا سر اُٹھایا۔ ''خوش رہا کرو۔ دیکھو ہمارا طرف۔ ہم کتنا خوش رہتا ہے؟''

وہ مسکرا رہا تھا، بشاش بننے کی کوشش کر رہا تھا مگر۔۔۔ اُس مسکراہٹ کے پیچھے اُس بشاشت کے پیچھے اب بھی۔۔۔ دکھ تھا، کرب تھا، اذیت تھی۔

نی شے نے کتاب بند کردی۔ اپنے پہلو میں میز پر رکھ دی۔

''بھئی بات سے بات نکل پڑا تھا۔۔۔ تم نے کیوں کتاب بند کرلیا''۔

''نہیں پڑھتی''۔ افسردگی کے ساتھ ساتھ وہ خفا سی بھی لگ رہی تھی۔ اِس پوئیٹری نے زار کو جو اُداس کر دیا تھا۔

''او کے۔۔۔ اس کو پڑھو''۔ وہ نی شے کی پشت کی طرف والے شیلف کی طرف بڑھا جہاں علامہ اقبال کا پورا سیٹ سجا تھا۔ ''یہ بھی ہو ہاتھ کا سرہانا سبزے کا ہو بچھونا، کا خواب دیکھتا ہے مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ، شمشیر وسناں اول طاؤس و رباب آخر۔ پورا قوم کا تقدیر بدلنے کا طاقت ہے اِس کے قلم میں''۔ وہ علامہ اقبال سے متاثر نظر آ رہا تھا۔

وہ خاموش رہی، جانے کیا سوچ رہی تھی۔

''یہ بھی نہیں''۔ وہیں کھڑے کھڑے وہ مسکرایا، اپنی اُداسی پس پشت ڈالتے ہوئے۔ اُس کا موڈ آف ہونے کو اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے وہ اُسے خوش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''اچھا۔۔۔ شیکسپیئر، پڑھو''۔ وہ پاس کے شیلف کی طرف دیکھنے

لگا۔ ''بھئی تم تو خواہ مخواہ سیریس ہو گیا''۔

''موڈ نہیں رہا''۔ وہ بھی۔۔۔ اس کی خاطر مسکرا دی۔

اُس نے رُخ اُس کی طرف کر لیا، دونوں پہلوؤں پر ہاتھ دھرتے ہوئے گہری سانس لی۔

پھر۔۔۔ بالکل سامنے کی شیلف میں ایک کتاب پر نظریں ٹھہر گئیں۔

''ہمارا بارے میں جاننا چاہے گا کچھ؟'' آگے چل کر اُس نے وہ ضخیم کتاب نکال لی۔

اُن کے بارے میں؟ وہ سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔

''The Pathans سر آلف کیرو نے لکھی ہے''۔

غیر اختیاری طور پر اُس کے ہاتھ آگے بڑھے۔

مسکراتے ہوئے زار نے اُسے کتاب پکڑا دی۔ اس کا موڈ بنا تو! یہی بہت تھا۔

"Once—he was Governor Frontier." مگر اب۔ وہ اس دنیا میں نہیں ہے''۔

نی شے اُسے دلچسپی سے بات کرتے دیکھ رہی تھی۔ کہ اب وہ بھی نارمل لگ رہا تھا چہرے پر چھائے دکھ اور اداسی کے سائے معدوم ہو گئے تھے۔

''کتاب میں اُس نے پٹھان قوم کا تاریخ بہت افیکٹیو انداز میں لکھا ہے۔'' مسکرایا، دلنشیں آنکھوں میں شوخی لہرائی۔ ''دیکھنا کتنا امپریس لگتا ہے ہم پٹھان سے''

وہ بھی مسکرا دی۔ کتاب اپنے سامنے کھول لی۔

''لیکن۔۔۔ تم اِس کو اِس وقت نہیں پڑھے گا''۔ اس نے کتاب اُس کی گود سے اُٹھا لی، بند کر دی۔

''کیوں؟''

''باتیں کرو گے مجھ سے''۔ اُس نے بند کتاب نی شے کے قریبی میز پر رکھ دی۔

''میں۔۔۔ باتیں نہیں کروں گی''۔ اُس کی ناراضگی واپس لوٹ آئی۔

''کیوں؟''

''رات آپ نے پوچھا تک نہیں میں نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟'' شکوہ اس کی زبان پر آ ہی گیا۔

''تم نے کھانا نہیں کھایا تھا''۔ وہ حیران سا بولا۔

''نہیں''۔

''مگر کیوں''۔

''بس میرا دل نہیں چاہتا تھا میز پر آنے کو''۔

''اوہ''۔ اس نے ایک لحہ توقف کیا۔ ''شازیہ کا باتوں کی وجہ سے؟''

اُسے شبہ گزرا۔

''ہاں''۔

''میں رات کھانے پر نہیں تھا۔ گاؤں سے باہر ایک دوست نے ڈنر پر بلایا تھا وہیں گیا تھا۔ اور پھر میں۔۔۔ رات کا وقت اور۔۔۔ گاؤں میں رہ کر کیسا تمہارا کمرے میں آ سکتا تھا''۔ نرمی کے ساتھ اس کا لہجہ کچھ معذرت بھی لئے تھا۔

نی شے نادم سی لگنے لگی۔ واقعی اُس نے اِس سے قبل بھی رات کے وقت بھی اُس کے کمرے میں قدم نہیں رکھا تھا۔ اُسے اس کے خیالات کی قدر ہوئی۔

''آؤ۔۔۔ باہر چل کر بیٹھتا ہے''۔

اُسے ہاتھ سے تھامتے ہوئے وہ وہیں دروازے سے باہر نکل کر چھت پر ایک طرف سائے میں رکھی کین کی کرسیوں پر لے آیا۔

شفاف نیلگوں آسمان بھلا لگ رہا تھا۔ سفید بادل کا ایک آوارہ ٹکڑا دھوپ سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا اور۔۔۔ بہت اوپر آکاش کی وسعتوں میں ایک تنہا عقاب شاہانہ انداز میں تیر رہا تھا۔

''بیٹھو''۔ اُس نے اپنے مقابل کی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

دونوں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر دونوں طرف خاموشی چھائی رہی۔

''رات۔۔۔ آپ شازیہ کے کمرے میں تھے۔'' نی شے اپنا دوسرا شکوہ بھی چھپا نہ سکی۔

زار چونک سا گیا۔ جیسے بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ مسکرا دیا۔

''جان میری ــــ میں خود اُس کے کمرے میں نہیں گیا تھا۔ ڈنر سے واپس آ رہا تھا تو وہ اپنے کمرے سے نکل کر آ گیا۔ ضروری بات کا کہہ کر کمرے میں آنے کو کہا۔ معلوم ہوا وہ صبح ہر حال میں جانا چاہتا ہے۔ میں نے کوشش کیا سمجھانے کا ــــ''

''منانے کی''۔

ایک لمحہ کو وہ چپ ہو گیا۔ پھر آہستہ سے ہنس دیا۔

''مناتے صرف ایک کو ہیں''۔ وہ خوشگواری سے کہنے لگا۔ ''باقی کو سمجھاتے ہیں سمجھا''۔

اور وہ دھیرے سے مسکرا دی۔ شکوک وشکوے معدوم ہو رہے تھے۔

''پہلے بھی کسی کو منایا ہے؟''

''ہوں ــــ نہیں۔ منانے کا نوبت نہیں آیا بس ــــ تھوڑا بہت گپ شپ ہو جاتا تھا۔ مگر وہ پہلے کا بات تھا اب ایسا نہیں ہے''۔

''فلرٹ ہیں''۔ وہ شاکی انداز میں بولی۔

''نہیں ــــ فلرٹ نہیں ہوں۔ اگر کوئی بات کرنے کا خواہشمند ہے اور میں بار کرلے یا پھر''۔ اُس کی آنکھیں اچانک شوخ ہو گئیں، مسکراہٹ شریر۔ ''کوئی ایک ٹیلیفون کال آ جائے تھوڑا دیر گپ شپ کر لے ــــ میں شریف بھی ہوں مگر تھوڑا تھوڑا بے ایمان بھی ہوں''۔

''بڑے بے ایمان ہیں تھوڑے نہیں ہیں''۔

اُس نے جاندار قہقہہ لگا لیا۔

''میڈم تم کو ایک بات بتائے اگر کوئی تم کو یہ کہے کہ وہ اس عمر میں بزرگ ـ کبھی یقین مت کرنا سمجھا ــــ''

''سمجھا''۔ اُسی کے لہجے میں کہتی وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اب اور نہیں سن سکتی تھی۔

جھٹ سے اُس نے اُسے ہاتھ سے پکڑ لیا۔ اپنے قریب لے آیا۔

''مذاق کر رہا تھا یار ــــ تم بھی کیا چیز ہے''۔

''یہ مذاق نہیں ہے''۔

''کچھ مذاق ہے کچھ مذاق نہیں ہے''۔ وہ اب بھی اُسے تنگ کر رہا تھا۔

ہاتھ چھڑا کر وہ دونوں ہاتھوں سے اُس کا سینہ پیٹنے لگی۔

''کون سا مذاق ہے کون سا نہیں ہے؟''

محظوظ ہو ہو کر وہ اُس کے نازک وار سہتا رہا، ہنستا رہا۔

''ڈیمارکیشن مشکل ہے مگر ــــ جو کچھ تھا پہلے تھا اب نہیں ہے''۔

اُس کے ہاتھ قابو میں کر کے اُس نے اُسے اپنے قریب کی کرسی پر بٹھا دیا۔

''اب تم مل گیا ہے۔ مرکز مل جاتا ہے آدمی کو تو اِدھر اُدھر تکلیف کرنے کا کیا ضرورت ہے پھر ــــ''

''اب آپ یہی کہیں گے''۔

''ایسا بات نہیں ہے''۔ وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ''میں نے پہلا بھی کبھی کوئی غیر ذمہ دار حرکت نہیں کیا ہے۔ ہمیشہ اپنے اوپر نظر رکھا ہے کہ مجھ سے کوئی ایسا کام نہ ہو جس سے میرا، میرا بزرگوں کا، خاندان کا بدنامی ہو۔ پھر کچھ حقوق ہم پر سوسائٹی کا بھی ہوتا ہے۔ اُس کا بھی احترام کرنا پڑتا ہے ــــ''

اِس وقت وہ بہت مدبر اور ذمہ دار سا لگ رہا تھا بلکہ عموماً وہ بردبار اور سنجیدہ رہتا تھا، دادا جان کے سامنے البتہ معصوم بچہ سا لگنے لگتا تھا۔

''کبھی آپ کو دادا جان سے ڈانٹ پڑی؟'' جانے کیوں اُسے اتنا بردبار سا دیکھ کر اچانک اس کے ذہن میں آیا۔

اور وہ زور سے ہنس دیا۔

''یہ خیال کیسا آیا؟''

''بس آ گیا''۔ اُس کے لہجے میں شوخی عود کر آئی۔ ''اچھا لگتا ہوگا ڈانٹتے ہوں گے تو''۔

''ہاں ــــ کبھی کبھی ہوتا ہے ایسا مگر ــــ اُن کے ڈانٹ میں بھی پیار ہوتا ہے''۔

اُس کے لہجے میں دادا جان کے لئے ڈھیر ساری محبت تھی عقیدت تھی۔

تبھی ___ ملازمہ زار کا ناشتہ وہاں لے آئی۔

نی شے ایک بار پھر نادم سی ہوئی۔ اُس کا یہ اندازہ بھی غلط نکلا۔ زار نے ناشتہ کرنا تھا ابھی اور اُس نے سوچا تھا شازیہ کے جانے کی پریشانی میں ناشتہ کر ہی نہیں رہا تھا۔

ملازمہ ناشتہ میز پر لگا کر واپس چل دی۔

''ناشتہ کرلیا تھا''۔ نیپکن اپنے آگے بچھاتے ہوئے زار نے اُس سے پوچھا۔

''جی۔''

''چلو ایک کپ چائے پی لو کمپنی دو مجھ کو''۔

اُس نے آدھا کپ چائے بنالی۔

''بتائیں نا ___ کیوں ڈانٹتے ہیں؟''

''کیوں''۔ اور اُس کا فلک شگاف قہقہہ گونجا۔ ''ابھی کچھ دن پہلے جرمنی جانے سے پہلا بھی ڈانٹا تھا''۔ وہ جوس پیتے پیتے بولا۔

''کس بات پر؟'' وہ دلچسپی سے پوچھنے لگی۔

''رات کو میں اپنے کمرے میں مووی دیکھ رہا تھا۔ وہاں سب کمروں میں کنکشن ہے۔ کوئی اور بھی دیکھنا چاہے تو اپنا کمرے میں چینل آن کر کے دیکھ سکتا ہے۔ میں مووی دیکھتا ہے تو عام حالات میں دادا جان کا طرف سے کنکشن بند کر دیتا ہے''۔

''کیوں؟''

''کیوں؟'' وہ ہنسا ___ اس لئے کہ ___ میں پرائیویسی چاہتا ہوں''۔

''مووی میں کیا پرائیویسی؟''

''ہوں ___ بہت دور تک پوچھتا ہے ہاں''۔ وہ خوبصورتی سے ہنسا۔ اب میں کچھ کہے گا تو تم ___ ''اُس کی نظریں نی شے پر جم گئیں۔

جانے کیا تھا اُس کی نظروں میں؟ نی شے کی پلکیں گرنے اٹھنے لگیں۔

''اچھا کیا تھا ڈانٹا تھا دادا جان نے''۔ وہ دھیرے سے بولی۔

''اِس پر نہیں ڈانٹا تھا اُن کو معلوم ہے کہ میں بچہ نہیں ہے۔ میں خود فضول چیزیں نہیں دیکھتا زیادہ سے زیادہ Kissing ہوتا ہے اور وہ کوئی ایسا بات نہیں

وہ خفا ہو جائیں''۔

کیا آرام سے ہر بات کہہ رہا تھا! سٹپٹا کر وہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔

''ہاں تو اُس رات میں نے مووی لگالیا اُن کا طرف کا کنکشن بند کرنا یاد نہیں رہا۔ شروع ہوا مگر ___ اب ہر مووی کا تو پتہ نہیں ہوتا نا کہ اندر سے کیسا ہے۔ سٹوری ذرا It's theme was too-bold ___ اور فون کا گھنٹی بج گیا۔

''یہ خرافات بند کرو''۔ دادا جان چلائے۔

اور میں نے بند کر دیا۔

تھوڑا دیر کے بعد پھر لگالیا۔ سستی کا مارے اٹھا نہیں کہ کنکشن اُس طرف کا آف کر پڑا رہا بستر میں۔ ایک بار پھر گھنٹی بجا۔

''خر کا بچہ بند کرو''۔ پھر دادا جان نے کہا۔

میں نے بند کر دیا مگر ___ کیا یہ زیادتی نہیں تھی؟ اور اگلے دن کرامت بابا نے بتایا جان کہتا تھا اِس کا اب شادی کرا دینا چاہئے ___''

اُس کی نظریں نی شے پر جمی تھیں۔ کچھ کہتی ہوئی نظریں، کچھ بولتی ہوئی نظریں۔

نی شے نظریں چرانے لگی۔

''میں نے کہا تھا نا کچھ کہے گا تو ___ گھبرا جائے گا تم''۔

''خر کا بچہ کا کیا مطلب ہے؟'' اُس نے بدلنا چاہی۔

''گدھے کا بچہ''۔ وہ آرام سے بولا۔

''اور 'سومرہ خانستہ دہ' کے کیا معنی ہیں''۔ اُسے اُس دن والی حمیدہ کی بات یاد

۔

وہ چونکا ___ پھر مسکرایا۔

''تم کو کہا تھا کسی نے؟''

''ہاں''۔

''ہمہ ___ نظر کمزور ہے اس کا''۔

''کیوں؟''

"اس کا مطلب ہے ___ کتنا خوبصورت ہے۔ اور تم ___ پتہ نہیں، پہلے بھی کسی نے کہا ایسا؟" اُلٹا اُس نے سوال کر دیا۔ نظریں شوخ اور ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ تھی ___ غور سے دیکھ رہا تھا اُسے ___

نی شے کی پلکیں جھک گئیں۔ اُس نے جب بھی اُسے غور سے دیکھا وہ تاب نہ لا سکی۔

"اچھا سنو۔ میں نے مووی پھر لگا لیا ___"

"تیسری بار"۔

"ہاں ___ دادا جان کی طرف کنکشن بند کر کے میں نے فلم دیکھ لیا"۔

"آپ نے دادا جان کا کہنا کیوں نہیں مانا"۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"میرا دل چاہتا تھا دیکھنے کو۔ اب میں بچہ تو نہیں کہ برا اثر لے۔" وہ چھری سے ٹوسٹ پر شہد لگاتے ہوئے بولا۔

اور نی شے نے دیکھا بہت سوبر ہونے کے باوجود اِس وقت اپنے مخصوص اٹکتے سنبھلتے پختون زدہ لب و لہجے میں اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے وہ بہت معصوم لگ رہا تھا۔ کچھ دیر قبل کے اُس کے پرکشش نقوش پر تاریک سایوں، آنکھوں میں کرب اور لہجے میں دکھوں کا اب کوئی شائبہ نہ تھا۔ جانے کیوں نی شے نے چاہا وہ اسی طرح خوش رہے۔ ہشاش بشاش۔ اداسیوں اور دکھوں سے دور ___ پر امن اور پرسکون۔

"اور کس بات پر ڈانٹا تھا؟" اُسے اچھا لگ رہا تھا۔

چند لمحے وہ سوچتا رہا۔ پھر ہنس دیا۔

"میں ایک سٹیچو لایا تھا اٹلی سے، عورت کا ہے ___"

اور نی شے کو یاد آیا وہ پہلی پہلی بار اُس کے بیڈروم میں گئی تھی تو نیم عریاں عورت کا مجسمہ دیکھ کر اُس میں بھی جلدی سے نگاہ دوسری طرف کر لی تھی۔

"کیوں رکھتے ہیں ایسی چیزیں"۔

"واٹ اُکویچن" وہ دلآویزی سے ہنسا۔ "کمرہ اچھا لگتا ہے"۔

اُس نے پہلو بچایا۔

"آپ اچھے آدمی نہیں ہیں"۔

اور ___ زار کا زوردار قہقہہ گونجا۔

"ایسا بات نہیں ہے"۔

"عورتوں کے مجسمے رکھتے ہیں کمروں میں"۔ وہ دھیرے سے بڑبڑائی۔

"Correction عورت کا مجسمہ رکھتا ہوں کمرے میں ___ ایک عورت صرف اپنے بیڈروم میں"۔

"بدمعاش۔"

"نہیں"۔ وہ مسکرایا۔ "کیوریاسٹی میڈم کیوریاسٹی"۔ اس کی نظریں شریر تھیں۔

"تم یہ کیوں نہیں سوچتا کہ بنانے والے نے اُس پر کتنا محنت کیا ہے، کیا Imagination ہے اس کا، کیا باریکیاں سمجھتا ہے ___"

"بس کریں اب"۔

"اچھا سنو۔ اٹلی سے آیا تھا تو غیر متوقع دادا جان آ گئے کمرے میں۔ میرے ہاتھ میں کوٹ تھا جلدی سے مجسمہ پر پھینک کر اُسکو کور کر لیا"۔

"اچھا ہوتا دیکھ لیتے"۔

"دیکھا تو تھا۔"

"پھر؟"

"منہ سے تو کچھ نہیں کہا۔ ہاں دل میں ضرور بولا تھا۔"

"کیا؟" اُسے ہنسی آ گئی۔

"یہی کہ ___ کبھی وہ خود بھی جوان تھے، اِس معاملے میں مجھ سے دس قدم آگے تھے"۔

وہ پھر ہنس دی۔

"اچھا پھر ڈانٹا؟"۔ اس کا تجسس برقرار تھا۔

"اُس وقت تو نہیں البتہ بعد میں ایک دن کہا تھا دن کا آغاز خدا کے پاک نام سے کیا کرو یہ نہیں کہ آنکھیں کھولو تو سامنے بے حجاب بت رکھا ہو"۔

"ٹھیک تو کہتے تھے۔ آپ ہٹا کیوں نہیں دیتے اُسے"۔

"ابھی وقت نہیں آیا مائی ڈیئر۔" بڑی سنجیدگی سے کہتے ہوئے اُس نے سیب اٹھا کر چھیلنا شروع کیا۔

چند لمحے وہ خاموش رہی۔

"کچھ اور سنائیں؟" اُسے بہت اچھا لگ رہا تھا سب۔

"تم کو میرا اور پردادا جان کا غصہ ہونے میں مزا آتا ہے"۔

"ہاں"۔

"اوکے let me think for a while" وہ سوچنے لگا۔

"ہاں — کچھ وقت پہلے کی بات ہے ایک فرینڈ بنکاک جا رہا تھا کام سے۔ مجھ کو بولا تم بھی چلو۔ میں نے دادا جان سے اجازت لینا چاہا۔ پتہ نہیں کیوں مجھ کو لگتا تھا وہ مجھ کو اجازت نہیں دے گا۔ خیر —

"وہ — دادا جان ایاز بنکاک جا رہا ہے"۔ میں نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔

"تو؟" انہوں نے اخبار کا پیچھے سے کہا۔

"کہتا ہے میں بھی ساتھ جاؤں"۔

"NO۔" وہ برہم لگنے لگے۔

"کیوں؟ بنکاک میں ایسی کیا بات تھی؟، نی شے نے پوچھا۔

"کچھ نہیں"۔

"پھر وہ برہم کیوں ہوئے؟"

زار نے ایک نظر اُسے دیکھا، پھر ایک دو پل دیکھتا رہا، پھر — آنکھوں میں شوخی کی چمک لہرائی، شرارت اُتر آئی۔

"یو نو بنکاک ذرا —" معنی خیز سے انداز میں کہتے ہوئے اُس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ سیب کا پیس کھانا شروع کر دیا۔

پتہ نہیں کیوں نی شے کے خوبصورت چہرے پر سایہ سا لہرایا۔

"بنکاک ذرا کیا؟"

"ذرا — آزادی زیادہ ہے نا وہاں"۔ وہ بے نیازی سے سیب کھا رہا تھا۔

"پھر کیا ہوا؟" نی شے کی ڈوبتی سی آواز اُبھری۔

زار کی نظریں ایک بار پھر اُٹھیں، اس کے چہرے کو بغور دیکھا۔

"دادا جان پلیز"۔ میں نے اصرار کیا۔

"تمہاری عمر ہے بنکاک جانے کی"۔ اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے وہ باقاعدہ غصہ ہونے لگا۔

اب اُن کو کون سمجھاتا کہ یہی تو عمر ہوتا ہے"۔ نی شے کے چہرے کے بدلتے رنگوں پر نظریں جمائے وہ سنجیدگی سے کہتا گیا۔

"بیچلرز کا وہاں کیا کام"۔ وہ مزید بولے۔

اب میں اُن کو کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ بیوی بچوں کا وہاں کیا کام؟

"دادا جان ایاز کو دیکھ کر خیال آیا تھا میں بھی چلا جائے"۔

"ایک ایاز کو دیکھ کر تمہیں خیال آ گیا کہ بنکاک جاؤ اور ہر سال لاکھوں حاجیوں کو دیکھ کر تمہیں ایک بار بھی خیال نہیں آیا کہ حج پر جاؤ"۔ دادا جان برسنے لگا۔

میں پھر نہیں کہہ سکا کہ دادا جان آپ کو بھی کب میرا عمر میں خیال آیا تھا۔ خاموش ہو گیا کہ دادا جان کے سامنے میں اس سے زیادہ نہیں بول سکتا تھا۔

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر یہ ہوا کہ میں نہیں گیا مگر۔ پچھلے سال دو ہفتے کے لئے بزنس کانفرنس پر جاپان جانا پڑا۔ جاتے ہوئے میں نے راستے میں دو راتیں بنکاک میں گزار لئے دادا جان کو پتہ بھی نہیں چلا۔" وہ ایک بار پھر نی شے کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ "میں نے سوچا دادا جان خود تو پتہ نہیں میرا عمر میں کہاں کہاں پھرتا ہوگا اور پھر — سوچا ابھی گیا تو گیا ورنہ اِس کا بھی کیا گارنٹی ہے کہ کل کو بیوی بھی منع کر دے کہ مت جاؤ بنکاک سو موقعہ سے فائدہ اٹھا لیا..."

اڑی اڑی سی رنگت لئے نی شے اپنے سامنے رکھے کپ کو دیکھ رہی تھی۔

"بنکاک میں ایسی کیا بات ہے کہ آپ گئے بغیر نہ رہ سکے۔" دور کہیں اس کے لہجے

میں طنز سا تھا، نشیلی آنکھوں میں شکوک سے تھے۔

''ایسے ہی بس''۔ اُس نے چوڑے کندھے اچکائے، اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

'One Night in Bangkok, makes a hard man tremble.' وہ خوبصورتی سے گنگنانے لگا۔

''کوئی اچھا کام مت کریں آپ''۔ وہ غصے غصے تھی۔

''اچھا کام کروں گا تو ڈانٹ کیوں پڑے گا''۔ وہ اب بھی اُسے دیکھ رہا تھا۔

نی شے چپ سی ہوگئی۔ میز پر انگلی سے تیز تیز سی لکیریں کھینچنے لگی۔

''تم کو ہی شوق تھا کہ دادا جان مجھ کو ڈانٹے، خوش ہو رہا تھا اُن کا مجھ پر غصہ ہونے پر۔۔۔ اب بتادیا تو۔۔۔ تم بھی ڈانٹتا ہے''۔

کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اس کی بات پر بے اختیار ہنس پڑتی مگر۔۔۔

جانے کیوں اس وقت وہ بالکل چپ تھی۔

''ہو گیا نا سیریس''۔ زار نیپکن سے ہاتھ پونچھنے لگا۔ ''میں تو مذاق کر رہا تھا، تنگ کر رہا تھا تم کو۔ اگر آدمی خود مضبوط ہے نا تو اس کو کسی ملک کا ماحول خراب نہیں کر سکتا سمجھا۔ یہ تو تم curious ہوا تو مجھ کو یکدم خیال آیا تم کو تنگ کرے۔ ورنہ بنکاک بہت اچھا جگہ ہے دیکھنے کا قابل ہے۔''

''تو پھر دادا جان کیوں آپ کو... '' اُس کے چہرے کے رنگ واپس لوٹنے لگے تھے۔

اور زار نے گہری سانس لی۔

''تم کو اور دادا جان کو بس ایک ہی جگہ میں بند کر دینا چاہئے''۔

نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مسکرا دی۔

''دراصل دادا جان کو میرا ساتھ بہت محبت ہے، بہت چاہتے ہیں ہم کو۔ کسی جگہ کا متعلق معمولی سا شک بھی پڑ جائے تو بالکل اس طرح روکتا ہے ہم کو وہاں جانے سے جیسے میں تین چار سال کا بچہ ہے اور کوئی غلط طریقہ اپنالے گا۔۔۔''

''بنکاک کے متعلق بھی۔۔۔''

''وہاں کا کلچر ہم سے مختلف ہے And that's all اور اب تم ہنس دو۔ کہ دادا جان نے مجھ کو ڈانٹا تھا رائیٹ''۔

اور وہ سچ مچ ہنس دی۔

''چلو شاباش اب میرا لئے چائے بنادو''۔ وہ خوشگواری سے بولا۔

اور نی شے خاموشی سے اُس کے لئے چائے بنانے لگی۔

چینی پیالی میں ڈال کر وہ دھیرے دھیرے چمچ چلا رہی تھی، نظریں پرچ پر بنی تصویر کے خوبصورت پھولوں پر جمی تھیں۔

''کیوں۔۔۔ پھر اپنا شاعر یاد آ گیا''۔ اس کی محویت دیکھ کر ایک بار پھر اُس نے اُسے ورڈز ورتھ کے نام سے چھیڑا۔ ''ویسے میں شرط لگاتا ہوں اگر تم اس کا وادی کمبر لینڈ میں رہتی نا تو وہ تم پر بھی ضرور نظم لکھ ڈالتا''۔ چائے کی پیالی اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے وہ پھر کہنے لگا۔ ''تمہارا بالوں پر وہ صفحے لکھ ڈالتا۔ تمہارا آنکھوں پر بے شمار لکھتا اور تمہارا باتوں کا انداز پر تو۔۔۔ مر جاتا۔۔۔''

ابھی کچھ دیر قبل حمیدہ کی پشتو میں کی ہوئی اس کی خوبصورتی کی تعریف کو وہ اُس کی نظر کی کمزوری قرار دے رہا تھا، دل میں معترف ہوتے ہوئے بھی انجان بن رہا تھا۔

مگر اس وقت نادانستگی میں وہ اس کی ڈھیر ساری تعریف کر گیا تھا۔

گھنی خمیدہ پلکیں اٹھا کر وہ اُسے دیکھنے لگی۔

چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگائے وہ اب بھی اُسے دیکھ رہا تھا۔ نظروں میں پنائیت بھی تھی، شوخی کی دمک بھی تھی۔

''اوں ہوں''۔ نی شے نے سر انکار میں ہلایا۔ ''نظر کمزور ہوتی اس کی بھی''۔

اور۔۔۔ بات کی تہہ تک پہنچ کر اُس کا فلک شگاف قہقہہ گونجا۔

اُس کی بات پر اتنے حسین انداز میں کی گئی نی شے کی لطیف چوٹ اُسے محظوظ کر گئی۔

اور پھر۔۔۔ پیالی میز پر رکھتے ہوئے وہ قہقہے لگاتا رہا۔

نی شے اُس کے قریب بیٹھی یوں ہی بے خیالی میں اپنے خوبصورت ہاتھ کی نازک مخروطی انگلیوں سے میز پوش سہلا رہی تھی۔

"میں کچھ کہوں"۔ زار نے آہستہ سے اُس کے ہاتھ پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھا، ہولے سے دبایا۔ "میرا انظر ٹھیک ہے"۔

نی شے کی چلتی انگلیاں رک گئیں۔۔۔ چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔

'This tough impracticable heart is governed by a dainty fingerd girl.'

زار کی آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں، ڈھیر سارا بول رہی تھیں۔

اگلے ہی پل اُس کی پلکیں جھک گئیں۔ چہرے پر لالی سی دوڑ گئی۔

دھیرے سے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ کے نیچے سے نکال لیا۔

وہ مسکرا دیا۔ اُس کا شرمیلا شرمیلا انداز دل میں اترنے والا تھا۔

"کچھ اور کہوں؟"

نی شے کی جھکی پلکیں اٹھیں۔

' I mistooke the place '

'I missd thy eare and hit thy lip.'

وہی کہتی بولتی نظریں اُس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔ شوخی لئے شرارت لئے۔

اُس کا چہرہ کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو گیا۔ نظریں تیورا کر گر پڑیں۔

"اور بھی کچھ سننا چاہے گا"۔ دلنشیں انداز میں ہونٹ سکوڑتے ہوئے اُس نے اپنی ہنسی بمشکل روکی۔

"نہیں"۔ اُس نے سر نفی میں ہلایا۔ نظریں اب بھی جھکی جھکی تھیں چہرہ اب بھی گلابی گلابی۔

"اچھا ذرا گرم چائے تو ڈال دونا"۔ اُس کی چائے بدستور پیالی میں تھی، وہ بہت گرم چائے پیتا تھا، باتوں میں ہی شاید۔۔۔ اُس کی چائے اُس کی مرضی کے مطابق نہ

رہی تھی۔

"عادتیں خراب ہو رہی ہیں آپ کی دن بدن"۔ وہ پھر سے اُس کے لئے چائے بنانے لگی۔

"اے۔۔۔ آج کھانا پھر خود بنا دونا"۔ اُس کی بات سے ہی جیسے اُسے خیال آیا۔۔۔ دور کہیں اُس کی آواز میں خواہش سی تھی، تمنا سی تھی۔۔۔ جیسے ادھوری رہ گئی تھی کہیں، تشنہ رہ گئی تھی کسی جگہ۔۔۔ کل اُس نے خود اپنے ہاتھوں سے سب کچھ کر کے دیا تھا تو اُسے بہت اچھا لگا تھا۔ جیسے خواہش تکمیل پانے لگی تھی۔ جیسے تمنا بار آور ہونے لگی تھی۔

"میں۔۔۔ میں کیسے اتنا زیادہ زیادہ..." کل تو اُس نے صرف کھانے گرم کر کے دیئے تھے۔ اُن کا بھاری بھرکم بندوبست، وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

اُن کا کھانا وغیرہ بہت بڑے پیمانے پر بنتا تھا۔ گھر کے لئے پکتا تھا۔ کئی کئی مہمان ہوتے تھے۔ بے شمار ملازمین تھے، کئی چوکیدار تھے۔

اور اُسے؟ وہ تو بس معمولی سا چھوٹا موٹا کھانا پکانا بھی مشکل سے جانتی تھی کیونکہ ممی نے اُسے اس جھنجھٹ میں ڈالا ہی نہیں تھا۔

"تم کو کس نے کہہ دیا زیادہ زیادہ۔۔۔ تم صرف میرا لیے پکانا۔ میں آج تقریباً فارغ ہے، صرف تھوڑا دیر کو باہر جانا ہے، ایک بجے تک آئے گا، تب تک تم تیار کر لے گا ٹھیک"۔

اُسے بس اچھا لگ رہا تھا یہ سب۔ کوئی اُس کا تھا صرف اور جو اپنا ہوتا ہے اُس پر ہی تو انسان اپنی خواہش ظاہر کر سکتا ہے۔

"ٹھیک ہے"۔ وہ دھیرے سے بولی۔ پھر سامنے دیکھنے لگی۔

"آپ چائے پئیں میں ذرا دیوار سے سامنے کھیت دیکھوں گی"۔ ہنوز وہیں بیٹھے اُس نے چھت کی دندانے دار دیوار کی طرف اشارہ کیا۔

"دیوار سے نہیں اُس۔۔۔ مورچے میں سے دیکھو"۔ زار نے کونے کے مورچے کی طرف اشارہ کیا۔ "دیوار سے نظر آتا ہے، لوگ دیکھتے ہیں پھر"۔

"اچھا"۔ وہ مسکرا دی۔ گاؤں آ کر زار کے طور طریقے ہی بدل گئے تھے جیسے۔

"ویسے ۔۔۔ یہ مورچے کس لئے ہیں؟" وہ تجسس سے بولی، اُس کے لئے یہ بالکل نئی چیز تھی۔

"یہ۔" وہ چائے کا گھونٹ لیتے لیتے رُک گیا۔ "یہاں سے ہم دشمن پر فائر کرتا ہے۔"

"دشمن پر؟"

"ہاں ۔۔۔ کبھی ۔۔۔ اگر ضرورت پڑے تو۔ اپنا حفاظت کے لئے کرنا پڑتا ہے"۔

وہ بے حد حیران سی اُسے دیکھ رہی تھی۔

"کبھی ۔۔۔ ایسا ہوا ہے؟"

"ہاں۔" وہ مسکرا دیا، پھر سے چائے پینے میں مصروف ہو گیا۔ "لینڈ لارڈز کا کبھی کبھی واسطہ پڑتا ہے ایسا خطروں سے ۔تم کو فکر مند ہونے کا ضرورت نہیں"۔ وہ لاپرواہی سے بولا۔

پتہ نہیں کیوں؟ وہ واقعی پریشان سی ہو گئی تھی، فکر مندی ہو گئی تھی جیسے ۔۔۔

وہ ہنس دیا۔ خوبصورتی سے۔

"تم تو پریشان ہو گیا۔ بھئی جہاں زمینیں ہوگا وہاں جھگڑا تو ہوگا"۔

وہ مسکرا دی ۔۔۔ کیا آسان سی منطق تھی۔

"مگر ۔۔۔ آپ جھگڑتے ہی کیوں ہیں؟" اُسے اُس کی پچھلی کئی باتیں یاد آ گئیں ۔۔۔ اُس کے منگیتر کی تصویر دیکھتے ہی آتش پا ہو جانا ڈنر پر اُس نوجوان پر برس پڑنا، اعجاز کو مار پیٹ کر نوکری سے علیحدہ کرنا، ابھی کچھ دیر پہلے لائبریری میں تلخ ہو جانا اور ۔۔۔ خود نی شے کو اغوا کروانا مقید رکھنا ۔۔۔ وہ اُسے قہر و غضب والا، جلد جھپٹ پڑنے والا لگا۔

"میں نہیں جھگڑتا۔" وہ پھر ہنس دیا۔

"تو پھر کون جھگڑتا ہے۔"

"بھئی کوئی غصہ دلائے گا تو ہم جھگڑے گا نہیں تو اور کیا کرے گا" اُس کے چہرے پر معصومیت تھی۔

"پھر فائر کریں گے؟"

"نہیں ۔۔۔ پٹاخہ چھوڑے گا"۔

اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اُس کی بات پر ہنس دی۔

اُس نے چائے کا آخری گھونٹ لیا۔ خالی پیالی میز پر رکھی۔ وہ خاموشی سے اُسے دیکھے جا رہی تھی۔

"ڈر گیا ہم سے؟ وہ مسکراتے ہوئے اُسے دیکھنے لگا۔ "تمہارا بھی قصور نہیں ۔۔۔ اتنا نازک اتنا فریجائیل ہو تم اور تمہارا آدمی اتنا رف ٹف ہے۔"

وہ سرخ سی ہو گئی، پلکیں یکبارگی جھک گئیں۔

وہ ذرا محظوظ سا ہوا۔ سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔

"دیکھو ۔۔۔ ہم خود سے خواہ مخواہ کسی سے جھگڑا نہیں کرتا۔ لیکن اگر کوئی کمینگی کرتا ہے۔ تنگ کرتا ہے تو اُس کو ہم ضرور سیدھا کرتا ہے۔ اُس کے لئے چاہے فائر کرنا پڑے۔"

نی شے کے چہرے کی سرخی ماند پڑ گئی۔ ایک بار پھر دبے ہوئے اندیشے جاگ اُٹھے۔ اگر کسی دن وہ اُسے پہچان گیا تو؟

کیا ردِ عمل ہوگا اُس کا؟ کیا فائیر؟ ...

"تم کس سوچ میں پڑ گیا ۔۔۔ جاؤ نا اوپر سے دیکھو کھیت کتنے خوبصورت لگتے ہیں"۔

"ہاں"۔ فکروں میں غلطاں وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

لیکن اگر وہ پہچان بھی گیا تو ۔۔۔ اُس نے اُس کا بگاڑا کیا تھا؟ کیا کیا تھا اُس نے؟ آخر کیوں کیا تھا اُسے؟

اور اس وقت ۔۔۔ دنوں بعد پھر اُسے خیال آیا۔

کیوں کیا تھا اُس نے ایسا؟

وہ اُس کا خوف بھول بھال گئی۔ تجسس نے پھر سر اُبھارا - راز جاننے کی خواہش ایک بار پھر بیدار ہوئی۔ مگر ۔۔۔

کب اُسے پتہ چلے گا؟ کیا اور بھی وقت درکار تھا ابھی؟

سوچوں میں کھوئی وہ پتھریلی دندانے دار دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی مورچے کے اندر آ گئی۔ سوراخوں میں سے دیکھا۔۔۔

تاحدِ نظر سرسبز کھیت، بل کھاتا نہر کا سیمیں پانی، پانی کے کنارے اُگے جھومتے جھولتے بے شمار بید مجنوں کے درخت۔ مسحور کن لگ رہا تھا سب۔

اُس نے سوچیں ذہن سے جھٹک دیں۔

''آپ۔۔۔ مجھے فارمز پر لے چلئے نا کسی وقت''۔ اُس نے وہیں سے کہا۔

''ضرور لے جاؤں گا مگر دن کو نہیں کہنا شام کو۔۔۔ سورج گرنے کے بعد''۔

وہ مسکرا دی۔۔۔ اُس کی کبھی ٹھیک روانگی سے اور کبھی ٹوٹی پھوٹی اٹکتی سنبھلتی اُردو کی اب اُسے عادت سی پڑ گئی تھی۔

''سورج ڈھلنے کے بعد کیوں؟'' گرنے سے اُس کا مطلب ڈھلنا ہی تو تھا۔۔۔ واپس چلتی وہ پھر اُس کے پاس آ گئی۔

''لوگ دیکھتے ہیں نا پھر۔۔۔''

''تو ... وہ ... شازیہ کو جو کل ...'' مگر اُس نے بات وہیں روک دی۔ یہ ذکر چھیڑ کر وہ تلخی پیدا کرنا نہیں چاہتی تھی۔

''اُس کا بات اور ہے۔ اُس طرح تو اور بھی کئی خاتون آ کر فارمز پر گھوم پھر کر گیا ہے''۔

وہ کچھ سمجھ نہ سکی۔ سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھتی رہی۔

''تمہارا بات الگ ہے۔ میں نہیں چاہتا ہے کہ کھیتوں میں کام کرتے ہوئے مرد تمہیں دیکھیں۔۔۔''

اور وہ دھیرے سے مسکرا دی۔ وہ اُسے اور لڑکیوں سے الگ سمجھتے ہوئے اُس کے تحفظ کا خاص خیال رکھ رہا تھا اُسے اچھا لگا۔

''ٹھیک ہے نا''۔ وہ اپنائیت سے بولا۔

''ٹھیک ہے''۔ اُسے زار کا عورت کا تحفظ اچھا لگ رہا تھا مگر۔۔۔

وہ مسکرائی۔۔۔ پھر اُس کی آنکھوں میں شوخ سی چمک لہرائی۔ مسکراہٹ میں زارت عود کر آئی۔

''دم گھٹ جائے گا آپ کی بیوی کا آپ کی پابندیوں میں۔'' پھر بھی اُس نے ے چھیڑا۔

وہ مسکرایا۔۔۔ سیدھا بیٹھتے ہوئے نظریں وہیں پاس کھڑی نی شے پر جما دیں۔

''میرے سینے پر سر رکھ کر سوئے گا میرے دل کا دھڑکنوں میں رہے گا۔ میرا انسوں میں سانسیں لے گا''۔ دونوں ہاتھوں سے اپنا پہلے سے کھلا گلا مزید وا کرتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔۔۔ ''اور دم گھٹ جائے گا''۔

اُس کا چوڑا سینہ بھرپور مردانہ وجاہت لئے تھا۔ جانے کیوں نی شے کا رنگ سرخ ہو گیا۔۔۔ اپنی چھیڑ بھول بھال گئی۔

وہ محظوظ ہوا۔۔۔ دھیرے سے مسکرایا۔

''اِس گاؤں میں پابندی ضرور ہو گا۔۔۔ پر وہ میرا باپ دادا کا روایت ہے۔ اِس کے علاوہ ہنی مون سوئٹزر لینڈ میں ہو گا۔ چھٹیاں یورپ میں گزارے گا۔۔۔ شہر میں بے لک رائیڈنگ دونوں اکٹھا کرے گا اس پر مجھ کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ لیکن جسم کا ائش سوئٹزر لینڈ میں بھی نہیں ہو گا۔ مردوں سے آزاد گفتگو اور بے باک قہقہہ کسی بین آدمی کے ساتھ بھی نہیں ہو گا''۔

وہ ہولے سے مسکرا دی۔ اپنے جدی روایتوں کا پاس رکھنے والا یہ آدمی اُسے اور ا اچھا لگنے لگا۔

کرسی پیچھے کھسکا کر وہ اُٹھنے لگا۔

''آؤ نیچے چلتے ہے۔۔۔ میں تیار ہوتا ہوں پھر میں تم کو اپنا سٹیڈ فارم لے جاتا ہوں ا کو گھوڑے دکھاؤں گا اپنے بھی دادا جان کے بھی تم کو ضرور پسند آئے گا''۔

دونوں نیچے آ گئے۔ زار تیار ہونے اپنے کمرے میں گیا اور نی شے اپنے کمرے ما چلی آئی۔

یوں ہی بے مقصد کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے کے بعد وہ دوبارہ کوریڈور میں نکل

آئی۔ چلتے چلتے وہ آخری سرے تک آ گئی۔

یہاں دروازہ تصویروں کی ایک بڑی گیلری میں کھلتا تھا۔ یہاں سے لیکر وہاں تک دیواروں پر بڑی بڑی قیمتی فریموں میں تصویریں لگی تھیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک بارعب شخصیت تھی۔ لباس اور وضع قطع سے جیسے کوئی جاگیردار ہوں، سردار ہوں، کہیں کے ___ وہ متاثر سی کھڑی اُنہیں دیکھ رہی تھی۔

"یہ دادا جان کا فادر ہیں، میرا گریٹ گرینڈ فادر۔" جانے کس وقت زار آ کر پاس کھڑا ہوا تھا۔

چونک کر اُس نے دیکھا ___ گرے شلوار قمیض پہنے اس وقت پھر اس کے کندھے سے پستول لٹک رہا تھا۔ ہاتھ میں پکڑی جیپ کی جابی کی، کی چین تک کی ساخت ایک بلٹ کی شکل کی تھی۔

خطروں سے کھیلنے والے، ہر دم لوہے فولاد سے لیس یہ جوشیلے لوگ۔ دل کے کتنے نرم، فراخدل، وسیع القلب تھے۔

سحر کار شخصیت والے اپنے یونانی دیوتا کو وہ پوجا کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا کریں"۔ وہ مسکرایا، سمجھ گیا وہ کیا سوچ رہی تھی ___ اُس کا بغیر بھی گزارا مشکل ہے"۔

"مگر وہاں آپ ایسے نہ تھے"۔ اُس کا اشارہ اُس کے شہر میں رہن سہن کی طرف تھا۔

"ہاں ___ وہاں ہم قدرے آرام سے رہتا ہے مگر ___ لوڈڈ پستول وہاں بھی بریف کیس میں ہر دم موجود رہتا ہے"۔

وہ کچھ الجھی سی اُسے دیکھے جا رہی تھی۔

"نہیں سمجھا"۔ وہ اپنائیت سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"نہیں۔" اُس نے معصومیت سے سر نفی میں ہلایا۔

چند لمحے وہ بغور اُسے دیکھتا رہا ___ پھر ___

آہستہ سے اُسے بازوؤں میں بھر لیا، ہولے سے اپنے ہونٹ اُس کے ماتھے پر رکھ

ہے۔

"تم کس امن کے شہر سے آیا ہے ہاں"۔ حسب عادت اُس کی نظریں اُس کے رے کا طواف کر رہی تھیں، ہاتھ اُس کے بال سہلا رہا تھا ___ "میں تو اِس کا بغیر ان پلیٹ محسوس کرتا ہوں"۔

"مجھے پستول کی شکل سے ڈر لگتا ہے"۔ وہ واقعی اِن چیزوں سے خوف کھاتی تھی۔

اور ___ زار کا فلک شگاف قہقہہ گونجا۔

"اور بنے گا ایک پٹھان کا بیوی جس کا اوڑھنا بچھونا ہی اسلحہ ہے۔ جیسا تم عورت ازیور کا شوق ہوتا ہے زیور اکٹھا کرتا ہے اسی طرح ہم اسلحہ جمع کرتا ہے۔ آؤ میں تم کو اسلحہ دکھاؤں۔ تمہارا ڈر ختم ہو جائے گا"۔

اُس کے بھی کیا عجیب وغریب شوق تھے!

"پہلے یہ تصویریں دکھائیں"۔

"Sure"۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے اُسے ایک ایک کے متعلق بتانے لگا۔ "یہ پردادا جان کا چچا کا ہے ___ یہ میرا نانا کی ہے ___ یہ دادا جان ہیں اِن کو تو تم جانتا اور یہ ___ یہ میرے بابا جان ہیں۔" اُس کی آواز اُس کا لب ولہجہ پرکشش نقوش اچانک اُداسی کی زد میں آ گئے۔

نی شے نے دیکھا اُن کی شکل وصورت زار سے بہت ملتی تھی، بہت باوقار تھے وہ۔

"آؤ چلیں۔" زار نے اُسی کمرے میں آگے بڑھتے ہوئے جلدی سے ا۔ جیسے اُسے ڈر تھا کہ وہ مزید یہاں ٹھہرے گا تو مزید اُداس ہوگا۔ "تم کو اپنا ن دکھائے"۔

وہ بھی ساتھ ہولی کہ وہ اُسے اُداس دیکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ کچھ دیر قبل لائبریری میں وہ افسردہ ہوا تھا تو اُسے لگا تھا اُس کی ساری افسردگی خود اُس کے من میں منتقل ہو گیا۔

"اوہ ___ ایک منٹ"۔ دروازے کو لگا مضبوط تالا دیکھ کر وہ کہنے لگا ___ "میں ت بابا سے چابی لے آئے۔" وہ واپس مڑا، پھر مسکرایا۔

"اب کرامت بابا پھر بہانہ نہ بنا دے۔ پتہ نہیں کیوں دادا جان اور کرامت بابا کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔"

وہ بڑے بڑے قدم اُٹھاتا کوریڈور میں نکل گیا اور نی شے اُس کی بات کی معصومیت پر مسکراتی ایک نظر وزنی تالا لگے دروازے کو دیکھتی۔ ایک بار پھر دیواروں پر لگی تصویروں کی طرف متوجہ ہوگئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آ گیا۔

"مل گیا چابی۔ کرامت بابا کا تکیہ کے نیچے سے"۔

آگے بڑھ کر اُس نے چابی گھمائی اور بھاری وزنی تالا کھل گیا۔

"آؤ" اور وہ اُس کے ساتھ اندر داخل ہوگئی۔

یہ کمرہ نسبتاً چھوٹا تھا۔ دیواروں پر جگہ جگہ قدیم ساخت کی تلواریں اپنے خول میں بند لٹک رہی تھیں۔ کچھ بندوقیں تھیں، خنجر تھے، ایک طرف ایک بہت بڑا بکس تھا۔ زار نے کھولا۔۔۔

ان گنت اور انواع واقسام کے بندوق، رائفل، ریوالور، پستول اور کچھ خنجر تھے۔۔۔

اسلحہ کی چمک دمک اور صفائی وحفاظت مکینوں کی اسلحہ سے محبت کی نشاندہی کر رہا تھا۔ زار کی دلنشیں آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی اُسے اسلحے سے کتنی رغبت تھی۔

پتہ نہیں کیوں؟ وہ سہم سی گئی۔ اکٹھا اتنا اسلحہ کسی گھر کے اندر رکھا اُس نے پہلی دیکھا تھا۔

"یہ بارہ بور ہے"۔۔۔ زار نے ایک گن اُٹھائی پھر دوسری۔ "اور یہ سکس بور ہے"۔ انہیں ایک طرف رکھتے ہوئے اُس نے ایک رائفل اُٹھائی۔ "یہ سیون ایم۔۔۔ پھر یہ بائیس بور رائفل ہے۔ یہ پرانا تھری ناٹ تھری ہے۔۔۔" وہ تینوں رکھ کر اُس نے دو اور چیزیں اُٹھالیں۔

"یہ ہے میڈم کلاشنکوف اور یہ دوسرا ایم سکسٹین۔ دونوں فلی آٹومیٹک گن ز!" وہ ایم سکسٹین کو اشتیاق سے الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ "زبردست گونج ہوتا ہے!

ازکا۔ تم تو گھبرا ہی جائے گا سن کر۔۔۔" وہ ایم سکسٹین سے سامنے نشانہ لیتے ہوئے رہا تھا۔

ایک پل کو۔۔۔ جانے کہاں سے اُسے خیال آیا۔۔۔ اُسے پتہ چل گیا کہ وہ وہی لڑکی جسے اُس نے قید کر رکھا تھا تو؟ کیا ری ایکشن ہوگا اُس کا؟ کیا یہی ایم سکسٹین؟ ے جھرجھری سے آ گئی۔

کتنا کریز تھا اُسے اسلحے کا! انتقام کا جذبہ ہونا چاہئے، بدلہ لینا چاہئے۔۔۔" اُسے اُس کی تھوڑی دیر قبل اوپر لائبریری کی باتیں یاد آ گئیں۔ اتنا انتقام ت کیوں تھا؟ عفو ودرگزر کی بات کیوں نہیں کرتا تھا؟

"پھر یہ پسٹلز ہیں ریوالورز ہیں"۔ وہ کہہ رہا تھا۔

اور وہ اپنے خیالوں سے چونک کر اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

"یہ چار سو پچپن بور ہے۔" اُس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ "دادا جان کے فادر کا یہ۔" اُس نے وہ بھی واپس رکھا اور ساتھ ہی ایک رائفل اُٹھالی۔

تھوڑی دیر اُسے اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ جانے کہاں سے چمکتی دمکتی آنکھوں میں ر ساری اُداسی آ سمٹی۔ ہنستا مسکراتا چہرہ تاریک سایوں میں گھر گیا۔

"یہ۔۔۔ میرا بابا جان کا ہے"۔۔۔ اُس کی آواز جیسے دور کہیں سے آ رہی تھی۔ چند لمحے اور وہ اُسے بغور دیکھتا رہا۔

"مگر"۔۔۔ اُس نے گہری دکھی سانس لی۔ "کس کام کا؟"۔ اُس نے اُسے بکس ا اُچھال دیا۔ "یہ سارا اسلحہ کس کام کا؟" وہ اچانک سب یوں ہی چھوڑ چھاڑ ازے کی طرف بڑھنے لگا۔

وہ بھی حیرت سے اُسے تکتی اُس کی تقلید کرنے لگی۔

"Do you believe in friend ship?" آنکھوں میں کرب لئے نے رکھتے ہوئے اُس سے سوال کیا۔

کیا ہو گیا تھا آج اُس کو؟ کوئی جواب دیئے بنا وہ اُلجھی سی پریشان سی اُسے دیکھ لا۔

''دوستی پر یقین رکھتا ہے تم؟ جگری دوستی پر؟'' وہ اب بھی اُس پر نظریں جمائے
تھا۔گھائل زخمی نظریں۔

''آپ ــــ آپ کو کیا ہو جاتا ہے۔''

''پتہ نہیں ــــ مجھ کو بھی پتہ نہیں''۔ دیوار سے ٹکتے ہوئے وہ شکست خوردہ لہجے میں
کہنے لگا۔''میں خود Vague سا رہتا ہوں۔
ہر طرف دھواں سا نظر آتا ہے ــــ سب کچھ بے معنی لگتا ہے۔ اپنا زندگی بے مقصد
لگتا ہے ــــ''

کیا تھا یہ سب؟ کچھ دیر پہلے وہ لائبریری میں بھی تلخ ہو رہا تھا۔ اِس
وقت ــــ اِس وقت ــــ چند لمحے قبل کی وہ اپنی ہر سوچ بھلا بیٹھی ترس آنے لگا اُس
پر ــــ

کیوں تھا ایسا؟ کیا ہو گیا تھا اُس کو؟

''آپ پلیز ــــ ریسٹ لیں تھوڑا سا''۔ اُسے بازو سے تھامے وہ دھیرے
دھیرے اُس کے کمرے کی طرف لے چلی۔

وہ بھی ــــ ایک فرمانبردار بچے کی طرح چپ چاپ ساتھ ہو لیا۔

وہ نڈھال سا تھا۔ قدم جیسے ساتھ نہ دے رہے تھے۔ کمرے میں لا کر وہ اُسے
صوفے پر لے آئی۔ کشن صوفے کے بازو سے ٹکائے تو اُن پر سر رکھتے ہوئے
خاموشی سے دراز ہو گیا، آنکھیں موند لیں۔

نی شے اُس کے لئے گلاس میں پانی لے آئی۔

''یہ پانی پی لیں''۔

اُس نے آنکھیں کھولیں ــــ وہ گلاس میں پانی لئے کھڑی تھی۔

''Do you really love me?'' گلاس لیتے ہوئے اُس نے اُ
کا وہی ہاتھ تھام کر اُسے اپنے پہلو میں صوفے پر بٹھاتے ہوئے اپنائیت سے پوچھا۔

''یقین نہیں آتا؟'' وہ تو پوجا کرتی تھی اُس کی ــــ کیسا سوال کیا تھا اُ
نے؟

کچھ ثانیے پہلے زار کی اضطراری حالت پر اُس کی پریشانی، اب اُس کی اِس وقت
پر بے یقینی سی ــــ اتنا حوصلہ اُس کا بھی کہاں تھا۔

خوبصورت آنکھیں بھیگ ہی گئیں۔

''آتا ہے'' ــــ پانی پی کر اُس نے گلاس صوفے کے بازو کے پاس رکھی میز پر
اُس کے آنسو دیکھ کر وہ گڑبڑا سا گیا۔

''تو پھر کیوں کہتے ہیں ایسا؟''

''سوری پھر نہیں کہوں گا''۔ اُس نے اُس کا ہاتھ ہونٹوں سے لگا لیا۔''پتہ
کیا ہو جاتا ہے مجھ کو ــــ جلدی Irritate ہو جاتا ہوں، غصہ آ جاتا ہے بڑا
ں ــــ پھر بے بسی سا چھا جاتا ہے ــــ'' وہ کچھ سوچ سوچ کر کہہ رہا تھا۔''دنیا
یمان اُٹھنے لگتا ہے۔ تم ملے ہو جب سے مجھ کو لگتا تھا مجھ میں کافی چینج آ گیا ہے
ج پتہ نہیں کیوں بہت روز بعد ٹمپر لوز کر گیا۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ تم پریشان
ہونا ــــ ہوں ــــ''

نم آنکھیں لئے وہ مسکرا دی۔

''تم میرے ساتھ ہو گی تو میں ــــ ٹھیک ہو جائے گا آہستہ آہستہ میرا ساتھ دے گی

نی شے نے دھیرے سے اپنے ہونٹ اُس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

دو آنسو لڑھک کر اُس کے ہاتھ پر جا گرے۔

اُس کا اقرار بہت انوکھا تھا، نرالا تھا۔

زار نے اُسے سینے سے لگا لیا۔

''میں تم کو اپنا سانسوں سے بھی زیادہ چاہتا ہوں'' وہ دھیرے دھیرے اُس کے
ہلاتا رہا۔

اور ــــ اُس کے سینے سے لگ کر نی شے کو جیسے دونوں جہانوں کا سکون مل رہا تھا۔

''آپ پھر اُداس نہیں ہوں گے''۔

''نہیں ہوں گا''۔

"وعدہ"۔

"وعدہ"۔

"تو پھر چلیں ___ مجھے اپنے گھوڑے دکھائیں"۔ وہ اُس کا دھیان ہٹانے
خاطر بولی۔

"ہاں چلو"۔ وہ اُٹھنے لگا۔ وہ بھی یہی چاہتا تھا کہ نی شے کی توجہ ہٹے۔

تبھی کوریڈور میں کرامت بابا کی بوکھلائی بوکھلائی سی باتوں کی آواز سنائی دی۔

"میری ذرا نظر اِدھر اُدھر ہوئی اور چھوٹا صاحب لے اڑا چابی ___ اب اِس کے د
سے کون جان چھڑائے گا"۔ اُن کی آواز میں پوتے کے لئے شفقت بھری تنبیہ تھی ا
دادا کے لئے مالک کے ساتھ ساتھ ایک دوست کی بے تکلفی بھی تھی۔ نی شے کو اچھ
لگا۔

"باپ رے۔" زار مسکراتے ہوئے صوفے سے اُٹھ آیا ___ "آؤ چلیں
نی شے کا ہاتھ تھام کر وہ پچھلے دروازے سے باہر نکل آیا۔ ایک تو اِس لئے کہ وہ نہ
چاہتا تھا کرامت بابا اُسے اُس کے کمرے میں میں دیکھیں دوسرے یہ کہ وہ کرامت
سے چابی اُن کی آنکھ بچا کر لایا تھا اب اُن کی بزرگی کا لحاظ بھی لازم تھا۔

"اب پتہ نہیں کہاں نکل گیا ہے"۔ اُس کا کمرہ کھلا اور خالی دیکھ کر وہ قدر
جھانکے ___ "بندوق پستول بھی ویسے ہی چھوڑ گیا ہوگا، سنبھال کر تھوڑی رکھا
واپس - پتہ نہیں کب بڑا ہوگا کب عقل آئے گی ___"

اور ___ زار نے نی شے کی طرف دیکھا۔ جیسے اپنی سرزنش پر اُس کا ردِعمل د
چاہتا ہو۔

"بہت اچھا ہوا"۔ اُس کی معصوم سی مسکین سی شکل دیکھ کر نی شے نے کہا۔

وہ ہنس دیا۔ خوشگواری سے۔

اس وقت پھر ___ اُس کی اُداسی، افسردگی، کرب اذیت چھٹ گئے تھے۔

"تم بھی دشمنوں میں سے ہے"۔

"ہاں۔" وہ بے اختیار ہنس دی۔

گھوم کر وہ دونوں سامنے کی طرف آ گئے۔ اُسی پورچ میں جس میں وہ شہر سے
آ کر حویلی میں اُتری تھی۔

"بی بی کے لئے اندر سے چادر لاؤ"۔ زار نے حویلی میں سے آتی خدیجہ کی رشتے
کی بھانجی سے کہا۔

اور پھر ___ وہ نی شے کو جیپ میں لیکر اپنے سٹیڈ فارم لے آیا۔

بہت بڑے احاطے کے گیٹ سے وہ لوگ اندر داخل ہوئے۔ جیپ روک کر وہ
دونوں اتر آئے۔

دور تک پھیلے فارم کے اُس پار ان گنت گھنے درخت تھے، بنگلہ سے سفید بادل
اِدھر اُدھر منڈلا رہے تھے، نرم خرام ہوا۔ ہریالیوں میں اٹھکیلیاں کھیل رہی تھی۔

کچھ فاصلے پر گھوڑے سدھانے کے لئے لکڑی کا گول دائرے کی شکل کا جنگلہ بنا
تھا۔ اِس طرف دائیں جانب دور تک اصطبل تھا، الگ الگ پاٹیشنز میں کئی گھوڑے
بندھے تھے، خوبصورت، اعلیٰ نسل کے قیمتی گھوڑے۔

"اے ___ دیکھو کون آیا ہے"۔ زار پہلے پورشن میں سیاہ رنگ کی ایک
خوبصورت گھوڑی کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگا۔ "میرا محبوب ہے"۔
نی شے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ گھوڑی کے کان کے پاس سرگوشی کرتے ہوئے
بولا۔ "بولو کیسا لگا تم کو ___" گھوڑی ہنہنائی۔

"اچھا لگا نا"۔ اُسے تھپتھپاتے ہوئے اُس نے ایک نظر اُس کے خوراک پر ڈالی
اور ارد گرد اُس کی جگہ پر ___ سب ٹھیک ٹھاک تھا۔

"یہ لیلیٰ ہے"۔ اب وہ نی شے سے مخاطب ہوا۔ "داداجان کی فیورٹ"۔

دونوں آگے بڑھے۔ دوسرے حصے میں آئے۔

"یہ مجنوں ہے۔"

نی شے اُس کے نام پر مسکرا دی۔

"دراصل ___ یہ لیلیٰ کا بہت آگے پیچھے ہوتا تھا۔ داداجان نے اِس کا نام
مجنوں رکھ دیا۔"

وہ اور آگے بڑھے۔

"یہ ___ مِڈنائیٹ ہے"۔ وہ ایک اور سیاہ چمکتی گھوڑی کی کمر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ اپنا نام کی طرح رومینٹک اور مست ہے"۔

گھوڑی اپنے مالک کی قربت پا کر خوش نظر آ رہی تھی۔ زار نے اُس کے چہرے سے اپنا گال ٹِکا لیا۔ "ہمارا لڑکا کب آئے گا میری جان"۔

اور نی شے ___ گھوڑی اور مالک کی اِس بے تکلف گفتگو سے ٹپٹا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

"تم بھی فوراً گھبرا جاتا ہے۔ آؤ"۔ ہنستے ہوئے اُسے اگلے پورشن میں لے آیا۔

"یہ شوگر ہے ___ بہت سویٹ بہت خاموش"۔ یہ ایک سیاہی مسائل براؤن رنگ کی خوبصورت گھوڑی تھی۔ زار نے اُس کا چہرہ تھپتھپایا۔ "مائنڈ مت کرنا لو آج زیادہ بات نہیں ہوگا ہمارا محبوب گھبرا جاتا ہے ۔گھبرا جاتا ہے یا شرما جاتا ہے ہاں؟" رخ نی شے کی طرف کرتے ہوئے اُس نے اُس سے پوچھا۔

وہ منہ سے کچھ نہیں بولی ___ نازک مکے اُس کے سینے پر مارنے لگی۔

"دیکھ رہے ہو شوگر ___ تمہارا عاشق پٹ رہا ہے ایک لڑکی سے"۔

اُس نے اُس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا۔

شوگر سے عشق کے اظہار پر نی شے نے اُسے خشمگیں نظروں سے دیکھا۔

"جل گیا شوگر لڑکی جل گیا"۔

نی شے نے زور سے اپنا پاؤں اُس کے پاؤں پر رکھا ___ اور آگے بڑھ گئی۔

"آؤ وچ ___" وہ چوٹ کھائے انداز میں ٹانگ دونوں ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے گول گول گھوما۔ "اچھا شوگر چلتا ہے، ہم اُس کو چاہتا بھی بہت ہے نا ___ دل دے رکھا ہے اُس کو ___ رہ نہیں سکتا اُس کے بغیر ۔سی یو"۔ اُس کی آواز میں مصنوعی تکلیف تھی۔ لنگڑاتا ہوا نی شے کی طرف بڑھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

یہاں اعلیٰ نسل کا سفید گھوڑا بندھا تھا۔

"یہ تھنڈر ہے۔ آج تک اس نے کوئی ریس نہیں ہارا۔ کیوں تھنڈر تم کو ہمارا محبوب اچھا لگا؟ ___ ہوں"۔ وہ کان اُس کے منہ کے پاس لے گیا۔ "نہیں"۔ سر سیدھا کرتے ہوئے اُس نے خوبصورتی سے کندھے اُچکائے۔ "اچھا لگنا بھی نہیں چاہئے۔ ہم جو اُس کو پیار کرتا ہے۔ پھر تم کیسے کرے گا؟"

وہ مسکرا دی ___ اُس کی بھی کیا دنیا تھی! مگر تھی بہت انوکھی، بہت حسین!

زار نے گھوم پھر کر اُس کی بھی خوراک، جگہ وغیرہ چیک کی۔

"This is the Great Sultan"۔ وہ اگلے پورشن میں چمکتے براؤن صحتمند گھوڑے کے پاس آ گیا۔

"کتنا خوبصورت ہے"۔ نی شے بولی۔

"سنا سلطان تم نے ___ مگر ___ زیادہ اکڑنا مت۔ یہ پیار صرف ہم سے کرتا ہے۔" اُس نے نی شے کو شریری ونک دی۔

نی شے سرخ سی ہو گئی۔

"یہ اِس پورا ایریا کا سلطان ہے۔ بڑا رعب ہے اِس کا۔ ریس اِس نے بھی کبھی نہیں ہارا ___ اور ___"

وہ آگے آ گیا۔

"This is the legendary Rukhsh." مگر رستم کا نہیں زار کا گھوڑا۔" اُس نے صحتمند خوبصورت گھوڑے کی پیٹھ پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔ "رخش اتنا بہادر ہے کہ آج رستم بھی ہوتا تو اُسے ماننا پڑ جاتا کہ یہ اُس کے رخش سے زیادہ دلیر ہے"۔

وہ اور آگے بڑھے۔

"یہ سردار ہے"۔ اُس نے سفید شفاف گھوڑے کا چہرہ تھپتھپایا۔

سرداروں جیسا شان ہے اِس کا۔ بہت بڑا دل والا ہے، بہت حوصلے والا ہے، بہت مہمان نواز ہے ___" وہ مسکرا مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ "مگر میرا سوا کسی اور کو اپنے اوپر سواری کرنے نہیں دیتا ___"

اپنے گھوڑے کی تنگدلی کا ذکر اُس نے بہت دلچسپ انداز میں کیا تھا۔

وہ بھی مسکرا دی۔ پھر آگے بڑھ گئی، اگلے حصے میں۔

"سردار فریاد ہے ___ میرا دل ہے اِس کا پاس اور رسید تک دیئے بغیر چلا گیا۔ کیا پتہ منکر ہی ہو جائے۔ کچھ کرو سردار اپنا لوگ اکٹھا کرو ورنہ ..."

"بس آجائیں اب زیادہ واویلا کرنے کی ضرورت نہیں"۔ نی شے نے واپس مڑتے ہوئے اُسے ہاتھ سے کھینچ لیا۔

"او کے سردار سی یو" ___ ایک بار پھر وہ لنگڑا کر چلنے لگا، وہی پاؤں ٹیڑھا کر کر کے۔

اور ___ نی شے نے گہری سانس لی۔

کافی دیر تک وہ اُسے اپنے گھوڑوں سے ملواتا رہا۔ اُن سے متعلق معلومات فراہم کرتا رہا۔

اُس کی باتوں کا انداز بہت دلکش تھا اور باتیں بہت بامعنی، دلچسپ اور پرمزاح تھیں ___

پھر ___ وہ دونوں واپس حویلی آگئے۔

زار اپنے کمرے میں چلا گیا اور ___ نی شے کچن کی طرف چلدی۔ کہ آج زار کی فرمائش پر کھانا اُسی نے پکانا تھا۔

خدیجہ کو تو آج صبح ہی اُس نے آنے سے منع کر دیا تھا۔ آج شام سعیدہ کی مہندی تھی بہتیرے کام کرنے تھے اُس نے۔ حمیدہ بھی ماں کا ہاتھ بٹانے گھر گئی تھی، دوپہر کا کھانا اُسی نے آ کر بنانا تھا۔

نی شے نے کپڑے دھونے والی ملازمہ کو بھیج کر اُسے بھی آنے سے منع کر دیا۔ کہلا دیا کہ وہ خود ہی تیار کرے گی کھانا۔ باقی کی مدد وہ اِسی ملازمہ سے لے سکتی تھی۔

کچن میں آ کر وہ سوچ میں پڑ گئی۔ خانہ داری کے کاموں کا اُسے کوئی خاص تجربہ نہیں تھا، بس کبھی کبھی شوقیہ تھوڑا بہت کر لیتی تھی گھر میں اور ___ زار بڑے بڑے پرتکلف

اور سٹائلش کھانوں کا عادی تھا۔ کھانا خاص تھا یا نہیں میز ضرور یہاں سے وہاں تک کئی قسم کے کھانوں سے سجی ہوتی تھی۔ پھر اُن کا خانساماں خاصا ماہر تھا جبکہ یہاں خدیجہ بھی لگتا تھا بہت تجربہ رکھتی تھی کھانا پکانے میں ___ بہرحال ___

اُس نے سوچا وہ اپنے طور طریقے پر کرے گی جیسا سمجھ میں آئے گا کہ آج زار نے خود ہی کہا تھا وہ اُس کے لئے پکائے۔

ملازمہ سے اُس نے چاول صاف کروائے، سبزی کٹوائی، مٹر صاف کروائے اور خود ___

کھانا پکانے میں لگ گئی۔ گھی میں پیاز سرخ کیا، ٹماٹر کاٹ کر ڈالے، ہاتھ دھو کر تولیے سے خشک کرتے کرتے اُس کی نظر کھڑکی سے اُس پار پڑی۔

زار حسب پروگرام تیز تیز قدم اُٹھاتا گلابوں کی باڑ کے ساتھ ساتھ چلتا باہر کام سے جا رہا تھا۔

پھر ___ وہ چونکی ___ دور پرلی طرف تندور میں روٹیاں لگاتی خدیجہ کی بھانجی کے پاس سے ایک جوان لڑکی زار کو دیکھتے ہی اِس طرف باڑ کی سمت آنے لگی تھی۔

"یہ بہت بے باک لڑکی ہے۔ گاؤں کے لڑکوں کو دانہ ڈالتی ہے"۔ کل ہی خدیجہ اِسی لڑکی کے متعلق کہہ رہی تھی۔ "یہ لوگ نئے نئے آئے ہیں اِس گاؤں میں ___ اِس کو خبر نہیں ہمارے بڑے صاحب اور طبیعت کے ہیں، بزرگ ہیں اِس زمانے کے۔ ذرا بھی شک پڑا تو چلتا کر دیں گے۔ اپنے گاؤں میں وہ اِس قسم کی باتیں برداشت نہیں کر سکتے"۔

باڑ کی اوٹ میں آ کر وہ پاس سے گزرتے زار کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی ___ بے باک سی نظریں، بے باک سا انداز۔

زار سامنے نظریں رکھے آگے نکل گیا تھا۔ اور وہ لڑکی اُسے نظروں سے اوجھل ہونے تک دیکھتی رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ واپس تندور لوٹ گئی تھی۔

اُس کا یہ انداز جانے کیوں نی شے کو اچھا نہ لگا۔ شاید اس لئے کہ وہ زار کو چاہتی تھی اور اُس کی چاہت بہت پاکیزہ، بہت بےلوث تھی ___ زار کو اپنا سمجھتی تھی کسی اور کی سستی

نظریں اُس پر پڑتی برداشت نہ کرسکتی تھی۔ زار بے حد ہینڈسم تھا، مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا کسی کی بھی نگاہ کا مرکز بن سکتا تھا مگر ـــــ وہ نہیں سہہ سکتی تھی یہ سب۔

بے چین سی وہ پھر سے کام میں لگ گئی۔

زار تو سیدھا نکل گیا تھا۔ اُس طرف نظر تک نہ اُٹھائی تھی ، شاید پتہ ہی نہیں چلا تھا کہ باڑ کے اُس پار سے کوئی اُسے دیکھ بھی رہا تھا۔

اُس نے دل کو تسلی دی اور خیال ذہن سے جھٹک دیا۔

اُس نے جلدی جلدی مٹر قیمہ پکایا۔ چاولوں میں مختلف سبزیاں ڈال کر دم کر لئے رکھ دیا۔ گھڑی دیکھی ساڑھے بارہ ہو رہے تھے۔ زار کہہ گیا تھا وہ ایک بجے تک آئے گا وہ ایک سے ڈیڑھ بجے تک لنچ کرتا تھا اور باقی کاموں کی طرح وہ کھانے کے اوقات میں بھی بہت پٹیکولر تھا۔

اُس نے تخت کی طرف دیکھا۔ پتہ نہیں کیوں اُسے یقین تھا وہ آج بھی یہیں کھانا مانگے گا۔ مگر ـــــ تخت پر کسی نے پانی گرایا تھا گیلا تھا۔

وہ یوں ہی پنٹیری میں جا نکلی پھر اُس سے پرے کمرے میں ـــــ یہاں قالین بچھا تھا، ایک طرف صوفہ بھی رکھا تھا، صاف ستھرا کمرہ تھا شاید یوں ہی بیٹھنے بٹھانے کے کام آتا تھا۔

اُس نے پنٹیری میں الماری سے صاف دسترخوان نکالا اور اس کمرے میں لا کر قالین پر بچھا دیا۔ برتن لا کر وہیں لگا دیئے۔

واپس آ کر چاولوں سے ڈھکنا اُٹھایا۔ ابھی چمچے سے دانے دیکھ ہی رہی تھی کہ چونکی۔

پتہ نہیں کب سے دادا جان آئے دروازے میں کھڑے اُسے اپنائیت سے دیکھ رہے تھے۔ کرامت بابا بھی ساتھ تھے۔ سعیدہ کی شادی میں شرکت کے لئے کل کی بجائے آج ہی آگئے تھے، کوئی اور بھی کام تھا شاید ـــــ

جلدی سے اُس نے ڈھکنا دوبارہ رکھ دیا۔ لپک کر اُن کے پاس آگئی ۔ سلام کیا، سر تعظیماً اُن کے آگے جھکا دیا۔

''وعلیکم السلام بیٹی۔'' انہوں نے شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ''ملازمہ کہاں ہے؟ تم کیوں کر رہی ہو یہ سب''۔

''وہ ... خدیجہ ماسی آج فارغ نہیں تھی۔ حمیدہ کا بھی میں نے سوچا ماں کا ہاتھ بٹا لے گی ...'' وہ زار کی خواہش کا ذکر نہ کر سکی، اور پھر یہ حقیقت تھی خدیجہ اور حمیدہ کو اُس نے اِس لئے چھٹی دے دی تھی کہ وہ لوگ گھر میں تیاری کر سکیں۔

''الحمدللہ''۔ وہ بہت متاثر نظر آنے لگے۔ ''بیٹی دل خوش ہو گیا تمہیں کام کرتے دیکھ کر۔ گھر کی چاردیواری میں اپنی ہانڈی چولہا کرنے والی لڑکیاں خوش نصیبوں کے یہاں پیدا ہوتی ہیں۔ آج ہم بھی کھائیں گے تمہارے ہاتھ کا کھانا ـــــ''

وہ اچانک پریشان ہو گئی۔ یک نہ شد دو شد۔ وہ تو زار کے سٹینڈرڈ کا کھانا تیار نہ کر سکتی تھی اوپر سے دادا جان بھی آگئے تھے۔ وہ ... دادا جان مجھے تو اچھا کھانا بنانا نہیں آتا بس ...''

''بیٹی شرط اچھا کھانا بنانے کی نہیں ہے۔ بات گھر کے امور سے دلچسپی اور مکینوں کی خواہشات کے احترام کی ہے ـــــ'' دادا جان ابھی تک دروازے میں ہی کھڑے تھے۔ اور سفر کے تھکے ہوئے بھی لگ رہے تھے۔

''دادا جان''۔ اُس نے جلدی سے اُن کے ہاتھ سے چشمے کا کیس' چابیاں تھام لیں۔ ''آپ کمرے میں چلئے ... میں چائے لے کر آتی ہوں''۔

اور وہ انہیں اُن کے کمرے تک یوں لے آئی جیسے یہ گھر واقعی اُس کا بھی ہو اور دادا جان دُور سے چل کر اپنے گھر آئے ہوں۔

اُس نے جلدی جلدی پردے ہٹائے ، کھڑکیاں کھولیں ۔ اُنکے بیٹھنے کے لئے صوفے کی پشت سے کشن لگائے۔ پھر صاف تولیہ لائی، باتھ روم میں رکھا۔

''آپ منہ ہاتھ دھو لیجئے۔ میں بس ابھی چائے لائی''۔ اور وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔

''کیوں بھائی کرامت''۔ دادا جان نے مسکرا کر کرامت بابا کی طرف دیکھا۔ ''یہ لڑکی تمہیں کیسی لگی؟''

"بہت نیک بچی ہے صاحب۔ اِس زمانے میں ایسی شریف لڑکیاں کم ہی نظر آتی ہیں۔"

آخر وہ بھی ایک عمر گزار چکے تھے۔ وہ بھی اِس بڑے گھرانے میں۔ کتنی ساری لڑکیاں دیکھ چکے تھے اب تک اِس طبقے کی۔ کتنی کتنی بار تو اُن کے طور طریقے دیکھ کر باقاعدہ کانوں کو ہاتھ لگا چکے تھے۔

"بس تو سمجھ لو ہم نے پسند کرلی"۔ وہ کمرے کے وسط میں کھڑے مسکراتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ "پسند تو ہم نے اُسے پہلے دن ہی کیا تھا۔ بلکہ تمہیں معلوم ہے اخبار میں اشتہار دلوانے کا سارا چکر ہی یہ تھا۔ ہم چاہتے تھے زار ہماری زندگی میں گھر بسا لے۔ وہ کسی طرح مانتا نہیں تھا۔ پھر اِرد گرد لڑکیاں بھی منڈلاتی رہتی تھیں، سب لگتا تھا کہ لالچ کی وجہ سے تھا، ہمیں فکر تھی کہیں بہک گیا تو؟ ایسی شادیاں سود مند نہیں ہوا کرتیں۔ ہم اکثر سوچتے کہ کوئی لڑکی ایسی ہو جس کو نزدیک سے جانچا جائے پرکھا جائے مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کیسے؟

پھر ایک دن ذہن میں آیا اپنی دیکھ بھال کے بہانے لڑکیوں کا انٹرویو کرلیں گے۔ اول تو جو پڑھی لکھی چھوٹی عمر کی لڑکی اسی سال کے بوڑھے کی خدمت کے لئے آئے گی ظاہر ہے اُس میں بھی کچھ نہ کچھ خدا ترسی، ہمدردی، خلوص اور اچھائی ضرور ہوگی۔ ورنہ تو کتنی نوکریاں ہیں، دفتروں میں، سکولوں میں، بینکوں میں کہیں بھی جاسکتی تھی۔ دوسرے یہ کہ ہمارے ملک میں فی الحال جاب کی خواہشمند خاص طور پر کسی گھر میں دیکھ بھال کرنے والی لڑکی کا تعلق عام طور پر بہت اونچے طبقے سے نہیں ہوتا جہاں لڑکی شوہر کے درجے سے واقف نہیں رہی، جہاں گھر کی چار دیواری کے تقدس کا علم نہیں رہا، جہاں حیا پردے کی عظمت کی خبر نہیں رہی۔ ہمیں زار کے لئے طبقہ نہیں لڑکی چاہئے تھی۔ جو طبقے کی اونچائی کا بوجھ نہ لئے پھرتی ہو بلکہ خود اپنی خوبیوں سے مالا مال ہو۔ اونچی سوسائٹی کی بے شک نہ ہو مگر اونچے کردار کی ضرور ہو۔ انٹرویو کے وقت ہمارا خیال تھا ہم شکل وصورت عادات واطوار بھی جان لیں گے۔ سچ پوچھو تو"۔ وہ رکے۔۔۔ مسکرائے۔ پھر گویا ہوئے۔ "ہم تو اِس کی شکل وصورت دیکھتے ہی مرمٹے

تھے۔ اپنا زار بہت ہینڈسم ہے نا بس ایسی ہی خوبصورت لڑکی کا خواب دیکھتے تھے ہم اُس کے لئے۔ اوپر سے اِس کی گفتگو کا انداز۔

بھائی اس قدر آہستہ آہستہ نرم وملائم لہجے میں بات کرنے والی لڑکی تیز وتند کیسے ہوسکتی ہے۔ اور ہمارا اندازہ صحیح نکلا۔ یہ خوبصورتی کے ساتھ ساتھ خوب سیرت بھی ہے۔۔۔ ہے نا؟"

وہ تصدیق کے لئے کرامت بابا کی طرف چشمہ قدرے نیچے کئے مسکراتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

"صاحب آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی ہے۔ ہم سب کے لئے اس حویلی کے لئے، اِس گاؤں کے لئے ایسی ہی بہو کی ضرورت ہے۔ اِس وقت آپ نے کہتے تو میں خود ہی بات کرتا۔ گھر بستا ہی ایسی لڑکیوں سے ہے۔ بزرگوں کی خدمت کو اپنی سعادت سمجھنا خوش قسمت لڑکیوں کا وطیرہ ہوتا ہے۔"

"بس تو سمجھو بات طے ہے۔" وہ باتھ روم کی طرف چلدیئے۔۔۔ یہ اتنے دن تو ہم ذرا۔۔۔ اِس کو جانچ پرکھ رہے تھے"۔

"اپنے زار صاحب سے بھی بات کی ہوتی۔۔۔"

اور دادا جان نے مسرور سا قہقہہ لگایا۔ وہیں رُک گئے۔

"کرامت یہاں مار کھا گئے۔ اتنا بھی نہیں سمجھ سکے"۔ پھر قدرے توقف کیا۔

"ہاں سمجھو گے بھی کیسے۔ وہ تو دادا کی جان ہے۔ دادا ہی سمجھتا ہے اُس کو۔۔۔ ارے بھائی وہ تو شروع دن سے اُسے پسند کرنے لگا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اُس وقت وہ نہیں سمجھ رہا تھا اپنے جذبات، ہم سمجھ رہے تھے سب۔"

کرامت بابا زار کے لئے اُن کی بے پایاں محبت دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

دادا جان کو چائے دیکر وہ واپس کچن میں آگئی۔

ایک بار پھر وسط کچن میں کھڑی وہ سوچ میں پڑگئی۔ یہ سادہ سا کھانا وہ دادا جان کے سامنے کیسے رکھ سکتی تھی؟ زار کو تو جیسے تیسے بھگتا ہی لیتی مگر اِن کے لئے؟ مرغی فریزر میں رکھی تھی وہ پکا بھی لیتی لیکن اگر۔۔۔ اچھی نہ پک سکی تو؟

تبھی ــــ زار اندر داخل ہوا۔ وہی ماحول تک کو سحر انگیز بناتی شخصیت ، وہی اپنائیت بھری نظریں۔

''زار...وہ...وہ''...''وہ خاصی پریشان لگ رہی تھی۔

''کیا؟''

''وہ...دادا جان آئے ہیں...''

''مجھ کو معلوم ہے۔ میں اُن کے کمرے سے آرہا ہے''۔

''مگر...میں... کھانا...اُن کے لئے''۔

''ہم تینوں مل کر کھائے گا''۔

''اوہ۔مگر...میرا کھانا اتنا اچھا نہیں ہے''۔مارے بے بسی کے اُس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

زار کو ایک پل کو حیرت ہوئی۔ وہ تو واقعی بے اندازہ نازک تھی۔ ذرا سی بات ہوئی اور ــــ

''اے ــــ چوڑیوں کا بار ہے تم تو، ذرا ہاتھ لگایا اور ٹوٹ گیا''۔

وہ ہاتھ سے اُس کے پریشان بال سہلا رہا تھا، آنکھیں اُس کے چہرے پر منڈلا رہی تھیں، اور لب و لہجے میں واقعی تحیر پوشیدہ تھا۔

''آپ ــــ کچھ مدد کریں نا''۔

اُس نے اُس کا ہاتھ اُٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

''بتاؤ۔ کیا مدد کریں''۔ وہ اپنائیت سے بولا۔

''وہ... آپ بتائیں۔ میں نے دو چیزیں بنائی ہیں۔ اور کیا بناؤں؟''

اُسے سچ مچ کی فکر لاحق تھی۔

وہ مسکرا دیا۔ دھیرے سے۔ کہ اِس معاملے کے تو وہ قریب سے بھی کبھی نہیں گزرا تھا۔

''اور کچھ مت بناؤ۔ جو ہے کافی ہے''۔

''مگر دادا جان''۔

''تم دادا جان کو کیا سمجھتا ہے۔ چیز موجود ہوتا ہے تو کھا لیتا ہے۔ اگر نہیں ہے تو کبھی بن کیا''۔

''سچ کہہ رہے ہیں''۔

''سچ کہہ رہا ہے''۔

''اوہ''۔ اُس کے جیسے سر سے بوجھ اُتر گیا۔ ''آپ چلیں میں کھانا لگاتی ہوں''۔

''پہلا منہ ہاتھ دھو لو پھر کھانا لگانا''۔ وہ اپنے رومال سے اُس کے ماتھے ہلدی کا داغ صاف کرتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ ''خاصا مصالحے دار ہے تم''۔

ہلدی جلدی نی شے نے کھانا برتنوں میں نکالا اور پرے کمرے میں دسترخوان پر

ارغ ہو کر وہ دادا جان اور زار کو بلا لائی۔

کمرے میں آ کر دادا جان کو قالین پر بچھے دسترخوان پر لگا کھانا بہت اچھا لگا۔

''بیٹی آج مدتوں بعد اسی انداز میں کھانا ملا ہے''۔ قالین پر بیٹھ کر اپنے آگے بڑا نا بچھاتے ہوئے وہ گویا ہوئے۔ ''سردیوں میں اِسی کمرے میں یہیں قالین پر ان بچھا کر زار کی دادی ہمیں کھانا کھلایا کرتی تھیں۔ زار کا باپ بھی ہوتا تھا، سامنے بیٹھا کرتا تھا''... وہ اچانک اُداس لگنے لگے۔

''دادا جان ــــ آپ یہ لیں''۔ زار نے جلدی سے اُن کا دھیان ہٹانے کو ڈش لیا۔

ادر نی شے نے سوچا خود بھلے باپ کی رائفل دیکھ کر اُداس ہو مگر دادا کو اُداس نہیں دیتا تھا۔ اُن دونوں کی آپس میں محبت کو اُس نے ہمیشہ رشک کی نظر سے تھا۔

''ہاں۔'' وہ سمجھ گئے، بات بدل لی کہ آج یہاں لگا کھانا دیکھ کر وہ بہت خوش بھی ہم ضرور لیں گے۔ نی شے بیٹی کے ہاتھ کا بنا کھانا ہے۔ اور پھر میز کرسی کے ٹ سے ہٹ کر ہم بہت آرام سے بھی بیٹھے ہیں''۔ انہوں نے سالن اپنی پلیٹ

میں نکالا۔

کھانا بس بن ہی گیا تھا۔۔۔ چاول زیادہ گل گئے تھے اور قیمے میں گلٹیاں ر
تھی۔ نمک مصالحہ البتہ گزارا تھا۔

دادا جان تو بار بار تعریف کئے جا رہے تھے کہ اُن کے خیال میں کھانا اچھا بنا
نہیں تھا بلکہ اُسے بنانا بڑی بات تھی۔ اور زار۔۔۔

''دادا جان کچھ پتہ چلا یہ مسکچر قسم کا کیا چیز ہے۔'' اُس کا اشارہ اپنی پلیٹ
سبزی میں پکے چاولوں کی طرف تھا۔

وہ نی شے کو تنگ کر رہا تھا، دادا جان سمجھ رہے تھے۔

''یہ سبزی میں بنے چاول ہیں اور بہت لذیذ''۔ مسکراتے ہوئے وہ بہت اپنا
سے کہہ رہے تھے۔

''اچھا'' وہ کھانے لگا۔

''اور یہ جو سالن ہے شاید کچھ کوفتہ ہے کچھ کوفتے کا چورا ہے''۔ قیمے کی گلٹیا
کوفتہ اور قیمے کو کوفتے کا چورا بتا رہا تھا۔

''اچھا ہے۔'' وہ پھر کہنے لگے۔ ''وہاں جا کر کک کو بھی طریقہ بتا دو تا کہ پھر با
کبھی کبھی''۔

اور نی شے نے خشمگیں نظروں سے اُسے دیکھا۔

مسکراتے ہوئے وہ کھانے میں مصروف ہو گیا۔ اُس کی مسکراہٹ میں شوخی
شرارت تھی۔

''میں نے اِس کو کہا بھی تھا تم خواہ مخواہ تکلیف مت کرو ملازمہ بنا-
مگر۔۔۔''

اُس کے سفید جھوٹ پر اُس نے ایک بار پھر اُسے دیکھا۔ کیونکہ آج تو خاص ط
اُس نے ہی اُسے پکانے کو کہا تھا۔

''یہ کہتا تھا اِس نے کھانا پکانے کا خاص ٹریننگ لیا ہے ضرور پکائے گا''۔

وہ اُسے چھیڑ رہا تھا وہ سمجھ رہی تھی مگر ۔۔۔ پھر بھی جانے کیوں اُس کا

ا سا گیا۔۔۔

زار کی نظریں اُس طرف اُٹھیں۔ چند ثانیے اُسے بغور دیکھتا رہا پھر۔۔۔
دادا جان کی نظر بچا کر اُسے خوبصورت سی وِنک دی۔

وہ اپنی ناراضگی بھول کر گھبرا کر دادا جان کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ اطمینان سے کھانا کھانے میں مصروف تھے، نی شے نے نجات کی سانس لی۔

رات دادا جان اور زار نے کوفی اور چیز سینڈوچز پر ہی اکتفا کیا۔ نی شے نے زار
ہا بھی کہ وہ بنا دے گی کھانا مگر۔۔۔

''نہیں۔۔۔ میں تم کو اور تکلیف نہیں دے گا''۔ وہ اپنائیت سے بولا تھا۔ ''یہ تو بس
چاہتا تھا تم کا ہاتھ کا کھانا ہو، تم سامنے بیٹھی ہو اور ہم مل کر کھائے''۔

حالانکہ نی شے تو زار کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار تھی۔ بلکہ ایک انوکھی سی خوشی
تھی اُسے زار کے کہنے کے مطابق کام کرنے پر۔۔۔

یہ ہی نہیں۔۔۔ وہ تو اُس کی ہر بات پر سرِ تسلیم خم کئے تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اوپر چھت
ہ اُسے کوئی دیکھے نہ، وہ فوراً مان گئی تھی۔ فارمز پر دن کو لیجانے سے منع کیا تو بجائے
ار کرنے کے اُسے اچھا سا لگا، وہ اُسے بہت اپنا سمجھتا تھا اِسی لئے تو ایسا کہہ رہا تھا۔

انک کہ کل جب باتوں کے دوران اُس نے کہا تھا کہ کچن کے سائیڈ پر زور سے
لنے مردانے کے قریب ہونے کی وجہ سے آواز باہر سنائی دینے کا اندیشہ ہے تو
انے اُس کے خیالات سو دل ہی دل میں سراہا تھا۔

نیا عورت کا سب سے خوبصورت گہنا ہے، یہ تو ممی بھی کہا کرتی تھیں۔ تب بھی
ےاُس کی یہ بات بہت اچھی لگتی تھی۔ اور وہ اس پر ہمیشہ عمل بھی کرتی آئی تھی مگر۔۔۔

گاؤں میں جو۔۔۔ طور طریقے زار کے تھے اُن سے اُس کا واسطہ پہلی بار پڑا
ے بجائے کوئی بوجھ سمجھنے کے وہ فخر سا محسوس کر رہی تھی اُس کی ہر بات کی تعمیل کرنے

اور یہی سب۔۔۔ دادا جان بھی نوٹ کر رہے تھے اُن کو دیکھتے ہی غیر ارادی طور پر

سر پر دوپٹہ ڈال لیتی۔ نظریں جھکا کر بات کرتی اور حتی الامکان اُن کی اور زا
خواہش پوری کرنے کی کوششیں کرتی یہ سب دیکھ دیکھ کر وہ دل ہی دل میں ا
انتخاب پر خوش ہوتے اور اپنے منصوبے کو جلد ہی عملی جامہ پہنانے کی سوچتے۔

رات وہ خدیجہ کے گھر سے مہندی سے خاصی دیر سے لوٹی۔ بہت اچھا لگا تھا اُ
سب۔

پھر ___ سعیدہ کی شادی بھی ہوگئی۔ اُن کے رواج و دستور دیکھ دیکھ کر وہ ل
اندوز ہوتی رہی۔ حسب معمول سعیدہ کی شادی کا سارا بندوبست دادا جان نے کیا
اِسی طرح گاؤں کی ہر لڑکی کی شادی کی ذمہ داری اُنہی کے سر تھی۔ گاؤں کی بیواؤ
دیکھ بھال، یتیموں کی پرورش اُن کے ذمے تھی، اِسی طرح گاؤں سے باہر بھی غر
کے لئے مفت ہسپتال، ناداروں کے لئے بغیر معاوضہ مدرسے اور کئی فلاحی ادارے
کی زیرِ سرپرستی چل رہے تھے۔ یہ سب جان کر اُس کی نظروں میں دادا جان اور زا
قدر اور بھی بڑھ گئی تھی۔

شام کو زار اُسے فارمز پر لے گیا۔ وہی کھیتوں، فصلوں اور باغات کا لا
سلسلہ ___ کافی دیر تک وہ اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔

شام کے دھندلکے گہرے ہونے لگے۔ ہوا خنک ہونے لگی، مزارعوں کے چھو
چھوٹے کچے مکانوں میں بتیاں ٹمٹمانے لگیں تو ___ مدہوش نی شے کو زار جیسے ہوش ک
میں لے آیا۔

’’چلیں۔ دادا جان انتظار کر رہا ہوگا‘‘۔

’’ہاں اور پھر۔‘‘ وہ مسکرائی۔ ’’جتنی دیر یہاں ہوگی اُتنی ہی دیر آپ لوگوں
ساری روٹین میں بھی ہوگی‘‘۔

اُس کا اشارہ رات تمام کام ختم ہونے کے بعد سب کے کمروں کے اندر گھسنے
بعد بڑے بڑے بھاری بھرکم کتوں کے کھل جانے کی طرف تھا، مسلح پہرے داروں
گھر کے اندر پہرہ دینے کی طرف تھا۔

’’رات کو تم غلطی سے بھی کمروں کے باہر قدم مت رکھنا۔ مخصوص ٹائم کے

ہرے دار جس کو بھی باہر دیکھے گا گولی مار دے گا ___‘‘

اُسے پہلے ہی دن زار کا انتباہ یاد آیا۔

یہاں کا ماحول ہی کچھ اور تھا۔ کبھی کبھی تو وہ سن کر دہل سی جاتی۔

کیا یہ لوگ جنگ و جدل کے دلدادہ، اسلحہ اور بارود کی گھن گرج کے رسیا تھے؟ مگر
دوسرے ہی لمحے احساس ہوتا پتھروں کے مضبوط قلعے میں رہتے ہوئے، لوہے فولاد سے
بس یہ لوگ اپنے پہلو میں بہت صاف بہت نرم اور بہت حساس دل رکھتے تھے۔ گاؤں
کے لوگ اِن پر جان چھڑکتے تھے، بے اندازہ محبت کرتے تھے، اور بے انتہا عزت
دیتے تھے۔ بعض اوقات تو اُسے لگتا جیسے دادا جان کی ریاست کے والی تھے اور زار اُن
ولی عہد ___ رعایا اپنے والی کی شفقت کے زیرِ سایہ خوش و خرم تھی اور اپنے مشفق والی
اور ہر دلعزیز ولی عہد کی درازی عمر کے لئے دعا گو ___

آج شام کو اُن لوگوں نے واپس جانا تھا۔ دادا جان پاس کے کسی گاؤں میں
تحہ کے لئے گئے تھے اور زار وہی زمین کے تنازعے کے سلسلے میں آخری مراحل طے
کرنے ___

نہانے کے بعد اُس نے ہلکے گلابی رنگ کے کپڑے پہنے، ہمرنگ جوتی پہنی، بال
لنگھی کئے اور کپڑوں سے میچ کرتا شفون کا دوپٹہ لیتے ہوئے کوریڈور میں نکل آئی۔
رائنگ روم کے پاس سے گزرنے لگی تو میز پر رکھے TIME پر نظر پڑی۔ وہ اندر چلی
ئی۔

رسالے کے اوراق پلٹتی وہ وہیں کھلی کھڑکی کے پٹ سے ٹک کر کھڑی ہوگئی۔

ابھی چند ہی صفحے دیکھے تھے کہ کھڑکی کے قریب برآمدے میں کسر پھسر کی آواز
ئی۔ نظریں اُٹھا کر دیکھا وہیں پاس ہی خدیجہ کی بھانجی کھڑی کپڑے استری کر رہی تھی
یب ہی وہی اُس دن والی لڑکی کھڑی تھی۔

’’بیکار باتیں مت کرو سکینہ۔‘‘ خدیجہ کی بھانجی کی بات اور اشاروں سے نی شے
مطلب لے سکی۔

سکینہ ڈھٹائی سے ہنس دی ___ پھر ___ زار کا نام لے کر کچھ کہنے لگی۔ آنکھوں میں

آج پھر وہی بے باک سی چمک تھی۔ انداز میں پھر وہی ڈھٹائی تھی۔

''بس چپ۔'' خدیجہ کی بھانجی نے کچھ تیزی سے کہا۔

اور سکینہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ پھر جیسے چونکی ___ سامنے اشارہ کیا اور زار کا ایک بار پھر نام لیا۔

نی شے کی نظریں بھی سامنے گئیں۔

اِس وقت پھر زار گلابوں کی باڑ کے پاس سے گزرتا چلا آ رہا تھا۔ دو ایک مامائیں وہاں بھی کام سے اِدھر اُدھر آ جا رہی تھیں۔ اِرد گرد بے نیاز نظریں سامنے رکھے وہ برآمدے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ نی شے نے نوٹ کیا تھا وہ جب بھی گھر کے اندر آتا تھا بے حد محتاط انداز سے آتا تھا۔ عورتیں آس پاس ہوئیں تو نظریں نیچی کر کے گزر جاتا تھا۔ بہت خیال رکھتا تھا۔

برآمدے میں پہنچ کر اُس نے سن گلاسز اُتار دیں۔ اُس کی گرے بلو آنکھیں انوکھی کشش کی حامل تھیں اُس کی بھرپور مردانہ وجاہت ہی ایسی تھی، سحر انگیز شخصیت ہی ایسی تھی ___ اِس میں لڑکیوں کا نہیں پیدا کرنے والے کا بھی ہاتھ تھا وہ جانتی تھی مگر ___ پھر بھی وہ بے چین ہو رہی تھی، بے کل ہو رہی تھی۔

اُس کی نظریں غیر ارادی طور پر اُس لڑکی کی طرف اُٹھیں۔ اِس وقت پھر وہ وہیں کھڑی ڈھٹائی سے اُسے گھور رہی تھی۔

اِدھر اُدھر دیکھے بغیر ہی زار اندر کوریڈور میں آ گیا۔

نی شے کھڑکی سے ہٹ آئی ___ مخالف سمت چل کر پیانو کے پاس کھڑی ہو گئی۔

''ہیلو''۔ زار اندر چلا آیا۔

''ہیلو''۔ اُس کا لہجہ بجھا بجھا سا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے''۔

''بڑی نیچی نظریں کر کے آ رہے تھے''۔ اَن سنی کرتے ہوئے وہ بول ہی پڑی کہ اب شاید اُس لڑکی کی حرکتیں اور نہ دیکھی جاتی تھیں۔ اُس کے لہجے میں طنز سا اُبھر آیا تھا تلخی سی گھل مل گئی تھی۔

ایک پل کو تو وہ یہ سمجھا ہی نہیں ___ مگر دوسرے ہی لمحے اُس کی گھنی بھوئیں اوپر اُٹھ گئیں۔ پرکشش لب متبسم ہو گئے۔ وہ بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔

بنا کوئی جواب دیئے وہ اب بھی مسکرا مسکرا کر اُس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

''بڑی فلیٹر ہیں یہاں بھی''۔ وہ جل کر بولی۔

وہ اب بھی مسکرا رہا تھا، اب بھی اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے تھا۔

پتہ نہیں کیوں نی شے کا دل ڈوبنے سا لگا۔

وہ خاموش تھا مسکرا رہا تھا، کہیں۔

''بولتے کیوں نہیں''۔ اُس کی آواز رندھنے لگی۔

وہ اب بھی کچھ نہیں بولا ___ دو قدم چل کر پرلی کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ چپکے سے ہنس دیا۔

''کیا کریں ___ صورت ہی ایسی ہے۔ لڑکیاں دیکھتا ہے تو فین بن جاتا ہے''۔

''تو... تو... یہ لڑکی...''

وہ اب بھی پیٹھ کیے تھا، اب بھی ہنس رہا تھا۔

''میں فرشتہ تو نہیں انسان ہے ___'' وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

اور ___ نی شے کے بڑی دیر کے رکے آنسو گالوں پر بہہ نکلے۔

''تھوڑا تاک جھانک یہاں کر لیتا ہے تھوڑا گپ شپ وہاں کر لیتا ہے ___'' کہتے کہتے وہ مڑا۔ مگر ___

نی شے پر نظر پڑی۔ تو ساری شرارت بھول بھال گیا۔ جلدی سے پاس چلا آیا۔

''میں مذاق کر رہا تھا۔ گاؤں کی لڑکیاں تو ماں بہن ہوتا ہے۔ یہ دیکھیں نہ دیکھیں مجھ کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے کبھی نظر اُٹھا کر ان لوگوں کا طرف نہیں دیکھا۔ کیونکہ میں اِن کو اپنا بہنیں سمجھتا ہے۔ اِن کو تو کوئی اور دیکھے تو آگ لگتا ہے کہاں کہ میں خود دیکھے''۔ وہ انگلیوں سے اُس کے آنسو پونچھ رہا تھا۔

''مگر ___ وہ کیوں دیکھتی ہے''۔

"دراصل میرا اشکل بہت مسکین ہے ناترس آجاتا ہوگا——"

اور—— اُسے دیکھتے دیکھتے نی شے کے گالوں پر آنسوؤں کے قطار بہہ نکلے۔

وہ گڑبڑا گیا۔ اپنے رومال میں اُس کے آنسو جذب کرنے لگا۔

"مذاق کر رہا تھا، تنگ کر رہا تھا تم کو"۔ اُس نے باری باری اُس کی دونوں آنکھوں پر پیار کیا۔ "اب مسکرا دو پلیز"۔

اور وہ—— روتے میں مسکرا دی۔

زار نے اُس کا ہاتھ اُٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

"کوئی دیکھ لے گا"۔ وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ کہ کھڑکیاں کھلی تھیں، اور برآمدے میں کچھ دیر قبل دو لڑکیاں موجود تھیں۔

"دیکھنے دو"۔ اب کے اُس نے اُس کے ماتھے پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

"شرم نہیں آتی"۔

"آتا ہے"۔ وہ مسکرایا۔ "چلا جاتا ہے"۔

"میں ماروں گی"۔ آج پھر اُس نے دھمکی دی۔

وہ یکدم اُس کے قدموں میں گھٹنہ ٹیک کر بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھوں سے قمیض کا گلہ چاک کر دیا۔

"مارو"۔ اُس نے آنکھیں میچ لیں۔ پرکشش ہونٹ بچوں کی طرح وا کئے وہ انتظار کرنے لگا۔

چند لمحے نی شے اُسے اپنائیت سے دیکھتی رہی پھر جانے کیا ہوا؟ بہت سارے آنسو اُس کی آنکھوں میں اکٹھے ہو گئے۔ اپنی اتنی پیاری اتنی معصوم چیز اپنے اتنے قیمتی سرمائے بیش بہا خزانے کی طرف وہ کسی اور کا التفات برداشت نہ کر سکتی تھی۔

کوئی جوابی کارروائی نہ پا کر زار نے آنکھیں کھول لیں، اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اے"۔ دونوں ہاتھوں سے اُسے کندھوں سے تھامتے ہوئے وہ حیران سا بولا۔

اور—— اُس کے کندھے پر سر رکھ کر وہ بے اختیار رو دی۔

زار نے اُسے سینے سے لگایا۔ چپ کرایا، تسلی دی۔

پھر—— وہ چپ ہو گئی، قدرے مطمئن بھی مگر—— وقفوں وقفوں سے اب بھی ہچکیاں لے رہی تھی۔

"ویسے—— ایک بات ہے"۔ وہ انگلیوں سے اُس کے نم گال پونچھتے ہوئے بولا۔ "یہ تو میری طرف دیکھا تھا کسی نے۔ اگر میں نے ہی کسی کی طرف دیکھ لیا تو——"۔

نی شے کی متورم سرخ آنکھیں اُس پر جم گئیں۔ اُس کی آنکھوں کے شربتی رنگوں کی کرچیاں ہو رہی تھیں، نظریں زخمی گھائل لگ رہی تھیں۔

"نہیں—— نہیں پلیز"۔ وہ گھبرا گیا کہ——

وہ پہلے ہی بہت رو چکی تھی، بہت آنسو بہا چکی تھی۔ اور زیادہ مذاق کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

اور—— اُس کے انداز پر—— بھیگی آنکھیں لئے نی شے مسکرا دی۔

دھوپ چھاؤں کا یہ امتزاج بے حد حسین تھا۔ زار بے خود سا، بے بس سا، بیقرار سا اُسے دیکھتا رہا۔

"اگر آپ نے کسی کی طرف دیکھ لیا تو میں—— ہمیشہ کے لئے چلی جاؤں گی"۔

اتنی بڑی بات بھی وہ کہہ سکتی تھی، وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"اور میں"۔ وہ اچانک دکھی ہو گیا تھا۔ "مر جاؤں گا——"

نی شے نے جھٹ سے اپنا ہاتھ اُس کے منہ پر رکھ دیا۔

"کیسی بات کرتے ہیں"۔

"تم بھی تو کرتے ہو"۔ وہ بچوں کی سی معصومیت سے بولا۔

"آئندہ نہیں کروں گی"۔

"وعدہ"۔ اُس نے اپنا مضبوط ہاتھ آگے بڑھایا۔

"وعدہ"۔ اپنا نازک سا ہاتھ اُس نے اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔

تبھی—— دونوں نے دیکھا۔ وہ دونوں لڑکیاں سامنے کا صحن طے کرتیں واپس جا رہی تھیں۔

"تم کو پتہ ہے یہ لوگ کس طرح عشق لڑاتا ہے"۔ زارا چانک خوشگواری سے بولا۔

وہ دھیرے سے مسکرادی۔ دلچسپی سے اُسے دیکھنے لگی۔

"لڑکا کہتا ہے۔ اے۔ کنوئیں پر پانی بھرنے آیا کر میں تجھ کو راستے میں ملے گا۔ یا کہتا ہے چاند نکلنے کا دن ہے تو چھت پر آجانا میں تجھ کو چاند کے بہانے دیکھ لے گا اور یا پھر کہ ___ اے لڑکی کبھی اِدھر بھی پھیرا ڈال میں راستے میں کھڑا انتظار کرتا رہتا ہوں"۔

"بہت باتیں پتہ ہیں"۔

"ہاں ___ تھوڑا بہت تجربہ ہم کو بھی ہے"۔ وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

اور ___ نی شے کا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں ڈھیلا پڑ گیا۔ چہرے کا رنگ سفید ہونے لگا ،نظریں ایک بار پھر گھائل سی۔

"کیا کریں ___ یہ گاؤں کا لڑکیاں چیز ہی ایسا ہے"۔

اور ___ نی شے کی آنکھوں میں سرخ سنہری وزعفرانی رنگ دھواں دھواں ہونے لگے۔

زارا ایک بار پھر گڑبڑا گیا۔ جھٹ سے دونوں ہاتھ جوڑ لئے۔

"پلیز ___ مذاق ہے سب۔ پلیز"۔

"کیوں رلاتے ہیں"۔ اور وہ واقعی رو دی۔

"اب جو رلایا نا تو جو چور کو سزا دیتے ہو وہ ہم کو دو"۔

اُس کی سنجیدگی سے کہی گئی بامحاورہ اُردو پر نی شے روتے میں مسکرادی۔

"بس ایک بار ہوا تھا ایسا۔ صرف ایک بار ___" وہ خاصا سنجیدہ تھا۔ اور نی شے سر پیانو سے ٹیک کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

وہ آگے بڑھ آیا۔ کافی مذاق کر چکا تھا، کافی رُلا چکا تھا اُسے۔ کندھے سے تھام کر اُس نے اُس کا رخ اپنی طرف کیا اور ___ چپکے سے ایک بار پھر دونوں ہاتھ جوڑ لئے۔

نی شے نے ایک نظر اُسے دیکھا۔ پھر اُس کے کندھے سے لگ کر خاموشی سے رو دی۔

"تنگ کر رہا تھا تم کو۔ قسم سے"۔ اُس نے اُس کے بے ترتیب بال درست کیے۔ انگلیوں سے اُس کے آنسو پونچھے۔ "معاف کردو پلیز"۔

"کہاں سے پتہ چلی ہیں یہ باتیں"۔ شاید اپنی تسلی کی خاطر وہ اپنی بند بند سوجھی سوجھی آنکھوں سے اُسے دیکھتی بھرائی سی آواز میں بولی۔

اُس کا ہر روپ خوبصورت تھا۔ رو کر اُس کی آنکھیں اور بھی خوبصورت ہو گئی تھیں ___ سرخ چمکیلے رنگ بھیگ کر اور بھی روشن ہو گئے تھے۔

"وہ ___ کرامت بابا اور حوّا بی بی کو کہتے سنا تھا"۔

نی شے نے چونک کر اُسے دیکھا۔ کرامت بابا ستر کے لگ بھگ اور حوّا بی بی اُن سے بھی زیادہ عمر کی تھیں۔

"پچاس سال پہلے آپ اُن لوگوں کے پاس کھڑے اُن کی باتیں سن رہے تھے"۔

"میں نے کب کہا ایسا"۔

"تو پھر؟"

"اب کرتے ہیں نا" وہ خوبصورتی سے ہنس دیا۔

اور ___ نہ چاہتے ہوئے بھی نی شے بے اختیار ہنس دی۔

معاً دونوں چونکے ___ خدیجہ اور کرامت بابا دونوں کی آوازیں صحن میں سے آنے لگی تھیں۔

"باڈی گارڈز۔" زار نی شے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ پھر جیسے اُن کی بے وقت مداخلت پر جھنجھلا سا اُٹھا۔ "ہنہہ ___ ویسے ایک بات ہے۔ کبھی کبھی مجھ کو لگتا ہے۔ یہ تھوڑا بہت موقعہ دادا جان ہم کو خود دے رہا ہے۔ ورنہ چند روز پہلے تمہیں گاؤں میں اس طرح پیچھے چھوڑ جانا ___ میرا میٹنگ پر تم کو بھی ساتھ بھیجنا نا۔" وہ کچھ سوچ سوچ کر کہہ رہا تھا۔ "ورنہ تو ___ دادا جان اِس معاملے میں اتنا لبرل نہیں۔ کیا وہ چاہتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کو پسند کریں۔ کیا وہ چاہتا ہے کہ ہم دونوں شادی کر لیں۔ ہوں"۔ وہ سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

"مجھے کیا پتہ"۔ وہ سرخ ہو کر بولی۔

"تو آؤ کر لیں شادی"۔ وہ اُسے ہاتھ سے پکڑ کر پچھلے لان میں کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھا۔

اور وہ اُس کی اُستادی پر جز بز ہو کر رہ گئی۔

"اور وہ باڈی گارڈز؟" وہ اُس کے ساتھ ساتھ چلتی بولی۔

"رات کو وو دو عورت تمہارا پاس والا کمرے میں سوتا ہے۔ خدیجہ کا بیٹی خود بخود تم کا کمرے میں سوتا ہے—"

"خود بخود نہیں—" کبھی کبھی وہ اُس کی اردو کی تصحیح کر دیا کرتی تھی۔

"جو بھی ہے"۔ وہ اپنی پہریداری پر جھنجلایا جھنجلایا کہہ رہا تھا۔ "دن کا وقت بھی اکثر بغیر کوئی اجازت لیے کرامت بابا کوریڈور میں آ جاتا ہے— میں بھی کچھ —" وہ مسکرایا۔ "میں بھی چپ کر جاتا ہے۔ دل میں چور سا ہوتا ہے نا میڈم"۔ وہ دونوں گھنے درخت کی چھاؤں میں لگی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ "تم کا پیار نے ہم کو کمزور بنا دیا ہے۔ سب بغیر اجازت بغیر پوچھے کوریڈور میں چلتا پھرتا ہے"۔ اُس نے گہری سانس لی۔ "دیکھے گا بکرے کا والدہ کب تک خیر مناتا ہے"۔

اور نہ چاہتے ہوئے بھی نی شے کھلکھلا کر ہنس دی۔

ایک تو وہ ایک جملہ بمشکل بولتا تھا اوپر سے محاورہ۔

"کیوں؟" وہ سمجھ گیا اُس نے پھر اردو کی کوئی غلطی کی تھی۔

ایسی جو وہ ضبط نہ کر پائی تھی۔ ہنسنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

"کچھ نہیں"۔

"پھر بھی"۔ اُسے تجسس تھا۔

"کچھ نہیں"۔

"پلیز!"

"بکرے کا والدہ نہیں بکرے کی ماں کہتے ہیں"۔

"اوہ— سوری"۔ وہ سرخ سا ہوا۔

کبھی اتنا سوبر، مدبر سا۔ کبھی اتنا بچہ سا معصوم سا۔

وہ دھیرے سے مسکرا دی۔ Adorable تھا۔

شام چار بجے وہ لوگ شہر کے لئے چلنے لگے تو اُسے احساس ہوا اُس نے یہاں چند ہت حسین بہت خوبصورت دن گزارے تھے۔

دن دھیرے دھیرے سرک رہے تھے۔ دن میں تمازت اور شامیں خوشگوار ہو چلی تھیں۔ بوگن ولا میں سرخ اور موتیے میں سفید سفید پھول آنے لگے تھے۔ ہوا کے جھونکے عطر بیز ہو گئے تھے۔ وہ اور زار ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے اتنا کہ کسی دن وہ اُسے نظر نہ آتا تو اُسے اپنا دل بیٹھتا سا محسوس ہوتا۔ اور زار ـــــ وہ تو اُسے اپنی آتی جاتی سانس سمجھ بیٹھا تھا۔ کبھی وہ روٹھتی تو زار بے کل ہو جاتا مگر۔ زار خفا ہو جائے اُس سے اُس بے قراری کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی ـــــ اور ـــــ

آج شام یہی تو ہوا تھا۔

اُس کی سویٹ کے پچھواڑے دور تک درختوں کے بیچوں بیچ چہل قدمی کرتے کرتے دونوں میں تکرار ہو گئی تھی۔ وہی گاؤں کی اُس لڑکی سکینہ کی وجہ سے۔

کل زار گاؤں کسی ضروری کام سے گیا تھا۔ آج بارہ بجے تک واپس لوٹنے کو کہا تھا
ر پورے چار گھنٹے لیٹ پہنچا تھا۔ انتظار کرتے کرتے وہ بے حال ہو رہی تھی۔ پھر پتہ
ں کیوں اُسے اُس لڑکی کا خیال آ گیا تھا، مضطرب ہو گئی تھی۔ گو وہ جانتی تھی، زار نے
ی نظریں اُٹھا کر اُسے دیکھا بھی نہیں تھا۔ مگر وہ لڑکی تو کوشش کر رہی تھی۔ سامنے
نے کی۔ آج زار کو آنے میں دیر ہوئی تو خواہ مخواہ تلخ ہونے لگی اِس کی دیری کو اُس
ے منسوب کرنے لگی۔

"کیا حال چال تھے گاؤں کے۔" دور کہیں اُس کی آواز میں طنز تھا۔ گاؤں سے
ادوہ لڑکی تھی۔ زار سمجھ گیا مگر ـــــ

"ٹھیک تھا سب۔" اُس نے Ignore کیا۔

"کیسی تھی وہ لڑکی؟" وہ براہ راست بولی۔ قریب ہی درخت کے تنے سے ٹکی
ڑی تھی۔

"میں ضروری کام سے گیا تھا لڑکی کا حال معلوم کرنے نہیں"۔ زار مسکراہٹ میں
ا گیا۔

مگر ـــــ اُس لڑکی نے تو اُسے دیکھا ہوگا۔ اُنہی بے باک آنکھوں سے، بے باک
راز سے۔ وہ تو اُس کا دیکھنا بھی برداشت نہ کر سکتی تھی۔

"اُس نے تو آپ کا حال معلوم کیا ہوگا"۔ لہجے کا طنز نمایاں ہو چلا تھا۔

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہنس دیا۔ سحر انگیز آنکھیں مخصوص انداز میں اُس
ے چہرے کا طواف کرنے لگیں۔ ہاتھ حسب عادت اُس کے چہرے پر بکھر آئی لٹ
وارنے کو گیا۔

مگر آج ـــــ وہ حسب معمول اُس کی دلآویز ہنسی، آنکھوں کے سحر اور اُس کے
ھ کے لمس کی تاب نہ لاتے ہوئے سٹپٹائی نہیں، اُس کی پلکیں لرز کر جھکیں نہیں، ہونٹ
پکپائے نہیں کہ ـــــ

جانے کیوں اُس کی خاموشی اُس کی ہنسی آج پھر اُسے اُس لڑکی کی تائید میں نظر
ی۔

اُس کے خوبصورت ماتھے پر شکنیں اُبھر آئیں۔ شربتی آنکھوں میں طنز سا جھلک آیا اور ـــ ہاتھ اُٹھا کر اُس کا ہاتھ وہیں روک لیا۔

"کیا ہوا؟" وہ حیران سا اُسے دیکھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں"۔ لہجے میں تندی لئے وہ واپس لوٹنے کو پلٹی۔

زار ہکا بکا سا رہ گیا ـــ اتنا سیریس لے گی وہ اِس بات کو وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

ہاتھ بڑھا کر اُس نے جاتی نی شے کے بال پکڑ لئے، کھینچ کر اپنے قریب کیا۔

"کیوں خواہ مخواہ تلخ بنا رہا ہے زندگی کو"۔

"چھوڑ دیں میرے بال۔" وہ سختی سے بولی۔

"تم اُس لڑکی کا ذکر ہی کیوں کرتے ہو"۔ وہ اب بھی مصالحت پر تھا۔

"خود تو گاؤں کے پھیرے لگائیں اُس کی وجہ سے اور میں ذکر ہی نہ کروں"۔

اُس نے اب بھی اُس کی دیری کا گلہ نہیں کیا۔ اُس کے گاؤں جانے پر ہی طنز کیا۔

زار کا رنگ سرخ پڑ گیا آنکھوں میں قہر اُتر آیا۔

وہ پہلے بھی کہہ چکا تھا وہ جو بھی تھی اُسے وہ بہن سمجھتا تھا، بات تب ہی ختم ہو چکی تھی۔ ایک بار جب بہن کہہ دیا تھا اُس نے تو یہ تکرار اُس کے اُس جذبے کو توہین نہیں تو اور کیا تھا؟

"اتنا گرا ہوا بات تم کر سکتی ہو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ تمہارا جگہ کوئی اور ہوتا تو میرا ہاتھ اُٹھ جاتا"۔

اور ـــ بڑے بڑے ڈگ بھرتا وہ وہاں سے چلدیا۔

نی شے دم بخود رہ گئی۔ وہ واقعی حد سے بڑھ گئی تھی مگر ـــ

وہ کیا کرتی کہ وہ یہ سب برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اُس کے پیار میں وہ اتنا آگے بڑھ آئی تھی کہ اُس کے آس پاس کسی اور لڑکی کی پرچھائیں بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

وہیں درخت سے ٹک کر وہ بے اختیار رو دی۔ پھوٹ پھوٹ کر، بلک بلک

ـــ کیونکہ اِس سے قبل زار اُس سے کبھی اتنی سنجیدگی سے خفا نہیں ہوا تھا۔

اب کیا ہوگا؟ روتے روتے وہ چونکی۔ اُس کی خفگی کے تصور سے ہی وہ بے قرار ہوا جا رہی تھی۔

اور ـــ اتنا اچانک برس پڑے گا یہ بھی تو اُس کے وہم وگمان میں نہ تھا ورنہ شاید ۔ آخری جملہ زبان پر آنے سے قبل ہی روک لیتی۔

آنسو پونچھتی وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔

شام کے چھ بج چکے تھے، مگر دنوں میں خاصا فرق آ گیا تھا۔ سورج اب بھی غروب ں ہوا تھا۔ ہریالی ساری سنہری ہو رہی تھی اور آکاش پر اِکا دُکا بادل نارنجی ہو رہے ۔

مضمحل ذہن و دل نڈھال وجود لئے وہ باتھ روم میں نہانے چلدی شاید اِسی نے کچھ طبیعت ہلکی ہو جائے۔

نہا دھو کر اُس نے ہلکے آسمانی رنگ کے کپڑے پہنے، پنی پسندیدہ مدھر پرفیوم لگائی الجھے بھیگے بالوں پر برش کرنے لگی۔ مگر ـــ ٹھنڈے پانی کا شاور لینے کے بعد بھی ت میں بشاشت نہ آ سکی۔ چبھن، خلش، بے قراری بے کل کئے دے رہے تھے۔

زار کی کچھ دیر قبل کی دلآویز ہنسی، سحر انگیز آنکھوں کا اُس کے چہرے کا ف، مخصوص انداز میں اُس کے چہرے سے بال ہٹا کر سنوارنے کے لئے اُٹھا ـــ

کتنی بے حسی سے اُس نے اُس کا ہاتھ وہیں روک لیا تھا۔ پشیمانی اُسے پاگل کئے رہی تھی۔

ایک بار پہلے بھی وہ اُس پر غصہ ہوا تھا، گرچہ اُس بار اُس میں نی شے کا کوئی قصور ں تھا مگر وہ ـــ کتنا سخت برہم ہوا تھا آنکھوں میں چنگاریاں بھر گئی تھیں، شخصیت ہمہ ہنگامہ بن گئی تھی اور پھر دنوں اُس سے بات تو درکنار یوں کترا کر نکل جاتا جیسے جانتا نہیں تھا، اُسے۔ اب کے ـــ

اب کے تو قصور بھی نی شے کا تھا۔ جانے کتنے دن لگ جانے تھے اُس کی خفگی میں۔

مگر نہیں ــــ تب وہ برداشت کر گئی تھی کہ وہ اُس کے اتنے قریب نہیں آئی تھی۔
اب۔اب وہ ایک پل بھی اُن کی ناراضگی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ کہ وہ جانتی تھی رات اُس نے کروٹیں بدل کر اور رو کر گزارنی تھی۔

وہ اُسے منائے گی۔ فون کرے گی اُسے۔

یہی فیصلہ کر کے اُس نے جلدی جلدی برش کیا۔ اور بالوں کو سوکھنے یوں ہی کھلا چھوڑ کر ٹیلی فون کے پاس کرسی پر آ بیٹھی۔

ریسیور اُٹھا کر نمبر ڈائل کیئے۔ دوسری ہی رنگ پر اُس نے اُٹھا لیا۔

"czar here." اُس کی گھمبیر سی آواز آئی۔

"نی شے بول رہی ہوں"۔

چند ثانیے وہاں خاموشی چھائی رہی۔ اور پھر آہستہ سے ریسیور واپس کریڈل پر رکھنے کی آواز آئی۔

نی شے نے ایک سیکنڈ ہاتھ میں پکڑے ریسیور کو دیکھا پھر دوبارہ کریڈل پر رکھ دیا۔

تھوڑی دیر انتظار کرتی رہی۔ اور پھر دوبارہ نمبر ڈائل کرنے لگی۔

اُدھر سے کال ریسیو ہوئی۔ مگر بولا کوئی نہیں۔

"زار میں نی شے ہوں"۔

اور ایک بار اور ــــ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اور پھر ــــ یوں ہی ہوتا رہا ــــ نی شے کال ملاتی رہی اور زار سلسلہ منقطع کرتا رہا۔

جھنجھلا کر نی شے اُٹھی۔ کرسی کی پشت پر سے کپڑوں کے ہم رنگ بڑا سا شفون کا دوپٹہ لیا اور ــــ باہر نکل آئی۔

وہ اُس کے پاس جائے گی۔ منا کر رہے گی کہ قصور بھی اُس کا تھا اور ــــ پوری رات جاگ کر بھی نہیں کاٹی جاتی تھی۔

دادا جان کی طرف سے ہو کر وہ کوریڈور سے ہوتی ہال میں آ گئی اور پھر اوپر اُس کے کمرے کی طرف جاتی سیڑھیوں پر ہو لی۔

وہ دور ایک بار پہلے بھی اِس طرف آئی تھی۔ کبھی صفائی دیکھنے ایک بار دادا جان کو

ار کی لائبریری سے کوئی کتاب چاہیے تھی ــــ مگر ــــ
آج ــــ خواہ مخواہ ہی اُس کے قدم جیسے ساتھ نہیں دے رہے تھے اور پھر اُس کے روم میں جانے کا تو سوائے شروع کے ایک دن کے اُس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔
آج ــــ

وہ بہت سخت مجبور تھی کہ اُس سے وہ اذیت برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ جو اُس کے من روح تک میں کچوکے لگا رہی تھی۔ کہاں کہ وہ اُس کی معمولی سی تکلیف کا نہیں سہ سکتی تھی آج خود اُسے تلخ کڑوی باتوں کا زہر پلا گئی تھی۔

دھڑکتے دل کے ساتھ اُس نے اُس کے دروازے پر دستک دی۔

"یس" بھاری سی آواز آئی۔

اور وہ ــــ آہستہ سے اندر داخل ہوئی۔

دیکھا ــــ زار اپنے بستر پر رخ پرلی طرف کیئے سر بازوؤں کے حلقے میں لیے ل سمیت اوندھا لیٹا تھا۔

وہ آگے بڑھ آئی۔

آہٹ پر زار نے رخ اِس طرف کیا۔

اُسے اپنے کمرے میں دیکھ کر ایک پل کو آنکھوں میں حیرت سی اُبھری مگر دوسرے ے حیرت کی جگہ خفگی نے لے لی۔ رخ واپس پرلی طرف پھیر لیا۔

وہ اُسے بالکل بچے کی طرح لگا۔ روٹھا روٹھا سا ــــ پاس آ کر وہ اُس کے قریب ا کی پٹی پر بیٹھ گئی۔

"زار..." اُس نے اُس کا بازو چھوا۔

زار نے جھٹ اپنا بازو سمیٹ لیا۔ بولا کچھ نہیں۔

ں کا حوصلہ قدرے بڑھا۔ وہ ناراض ضرور تھا مگر پچھلی بار کی طرح پتھر کی طرح ہیں۔

"زار"۔ وہ اپنی نازک انگلیوں سے اُس کے بال سہلانے لگی۔

"کیا ہے؟" ہنوز بازوؤں کے حلقے میں سر دیئے اُس نے اُس کا ہاتھ آہستہ سے

اپنے بالوں میں سے ہٹا لیا۔

''خفا ہیں مجھ سے''۔

''ہاں''۔

وہ مسکرا دی۔

''میں منانے آئی ہوں نا''۔

''میں غصہ بھی ہے''۔ چہرہ اب بھی بازوؤں میں چھپا تھا۔

اور وہ مزید مسکرا دی۔ بچے کی معصومیت کیا ہو گی اُس کے سامنے۔

''معاف کر دیں نا پلیز''۔

اور ___ روٹھی روٹھی شکل لئے وہ سیدھا ہوا۔ تکیے لگا کر مسہری کی پشت سے ٹ
لگا دی۔

''تم نے بہت برا بات کہا ہے مجھ کو''۔ پہلی بار اُس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ ا
بھی ناراض ناراض لہجہ میں کہہ رہا تھا۔

''میں مانتی ہوں''۔ جانے کہاں سے ڈھیر ساری نمی اُس کی بھی آنکھوں میں
آئی۔ ''آئندہ ایسا نہیں ہو گا''۔

وہ خفا تھا اور خفا خفا ہی نظریں اُس کے چہرے پر جمائے تھا۔ اُس کی
آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

پھر ___ ہاتھ بڑھا کر آہستہ سے اُس کے ڈھیر سارے بھیگے بالوں سے اُسے
اُس کا چہرہ اپنے قریب کیا۔

''وعدہ کرتا ہے نا'' وہ اب بھی بغور اُس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

''ہاں''۔ اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ آنکھوں کی نمی موتی بن کر گاؤں پر لڑ
آئے۔

''مجھ کو نہیں معلوم وہ لڑکی کون ہے''۔ اُس نے باری باری دونوں موتی ا
ہونٹوں میں جذب کر لئے۔ ''تم خود اُس کو حویلی آنے سے منع کر دو۔ مگر پلیز۔ آ
ایسا سوچنا بھی نہیں۔ مجھ کو گالی لگتا ہے۔ اپنے گاؤں کا ہر لڑکی میرا بہن ہے ___''

''آپ نے دیر کر دی تھی۔ تو مجھے طرح طرح کے شک ہونے لگے تھے''۔ وہ نادم سی
لی۔

''اوہ ___ میں اِس لئے لیٹ ہو گیا تھا کہ سلطان کو زکام ہو گیا تھا اور جب تک
لازم دوائی بنا کر نہ دیتا میں خود سلطان کو کھلا نہ دیتا میں وہاں سے چلنا نہیں
چاہتا تھا ___ پھر ___ مڈنائٹ کا بھی کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھا، اُس کا بچہ ہونے والا
ہے نا ___'' وہ آرام سے کہہ رہا تھا۔

سٹپٹا کر نئی شے سامنے دیکھنے لگی۔ اپنے گھوڑوں سے اُسے کتنا پیار تھا یہ وہ
اؤں جا کر دیکھ چکی تھی۔

''اب تو بات کلیئر ہو گیا نا۔ آئندہ بے کار سوچ دماغ میں کبھی مت لانا ہم نے کہہ
یا ہے نا اپنے گاؤں کا ہر لڑکی میرا بہن ہے ___''

''بس اپنے گاؤں کی''۔ اُس کی بھیگی آنکھوں میں شوخی کی چمک اُبھر آئی۔

چند لمحے وہ یوں ہی اُسے دیکھتا رہا۔ بے اندازہ نازک اور شائستہ ہونے کے ساتھ
اتھ وہ اکثر بہت شوخ ہو جاتی تھی بڑی چنچل سی۔

''ہاں''۔ وہ بھی سنجیدگی بھول بھال گیا۔ اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

''کیا؟''

''ہاں ___'' اُس نے اچانک اُسے بازوؤں میں بھر لیا۔ ''مجھ کو ایک اور گاؤں
لڑکی اچھی لگتی ہے۔ وہ بہت خوبصورت ہے، بے اندازہ نازک ہے اُس کا بال بہت
بصورت ہے، چہرے سے ہٹتا ہے تو سویرا ہوتا ہے، گرتا ہے تو شام ہو جاتی ہے۔
اُں کا انداز اتنا یونیک ہے کہ میں سانس روک کر سنتا رہتا ہوں ___'' وہ اُسے پیار
تے کرتے کہتا گیا۔

''کون ہے وہ؟''

''جس کا گیلا بالوں میں میں چھپا ہوا ہوں، جس کا آنکھیں مجھ پر جادو کر رہا ہے،
ں کے ہونٹوں کا میرا ہونٹوں پر سایہ ہے، جس کے سانسوں کا میرا سانسوں میں خوشبو
ہے''۔

اور بھی کچھ سننا باقی تھا کیا؟ نی شے کے بازو بے اختیار اُس کی گردن میں حمائل ہو گئے۔ اندازِ خود سپردگی کے لئے وہ اُس کے سینے سے لگی رہی۔ لمحے بیتتے رہے۔

''زار۔۔۔ کہیں آپ نے مجھے چھوڑ دیا تو؟'' بے پایاں خوشیاں ملیں تو انجام کی فکر لاحق تو ہوتی ہے۔ وہیں اُس کے سینے سے لگی سر اُٹھا کر وہ اُسے دیکھنے لگی۔

''ایسا نہیں ہو سکتا''۔ وہ اُس کے چہرے پر بکھر آئے بال سنوارتے ہوئے بولا۔

''میں مر جاؤں گی زار ایسا ہوا تو''۔

''اور اگر۔۔۔ تم مجھ کو چھوڑ کر چلا گیا تو؟''

''میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی''۔

''میں تو ضرور مر جائے گا اگر تم نے ایسا کیا تو''۔

اور جانے کہاں سے؟ اچانک اُسے خیال آیا۔

وہ کیا بات تھی جس کی وجہ سے اُس نے اُسے ایئر پورٹ سے اغوا کروایا تھا۔ ہر جگہ اُسے نوکری سے خواب دلوا کر اُس کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ وہ پوچھ لے۔۔۔

کہ اب تو وہ اُس سے اُسی کے گھر میں جاب کر کے بدلہ بھی لے چکی تھی۔

پھر۔۔۔ اُسے خود اپنی بھی تو شناخت کروانی تھی، وہ کون تھی کہاں سے آئی تھی؟ اتنی اُس سے قریب تھی اپنے متعلق اب تو اُسے بتا ہی دینا چاہئے تھا۔ اُس کا ضمیر بھی یہی کہتا تھا۔ تو اُسے اتنا چاہے اور خود نی شے اُسے اپنے ہی متعلق اندھیرے میں رکھے! ابھی اِسی وقت اُسے بات کر لینی چاہئے تھی اُس سے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے بے حد قریب تھے، بے پناہ محبت کرتے تھے آپس میں۔ اُسے معلوم ہوگا کہ وہ وہی لڑکی ہے جسے اُس نے کچھ عرصہ قبل مقید رکھا تھا تو وہ کچھ نہیں کہے گا کہ۔۔۔ محبت ہر جذبے سے بالاتر ہوتی ہے۔

''زار''۔

''ہوں''۔ اُس کی نظریں ہمیشہ کی طرح اُس کے چہرے کا طواف کر رہی تھی۔

''آپ کو پتہ ہے میں۔۔۔''

''مجھ کو پتہ ہے تم''۔ وہ پھر سے اُس پر جھک آیا! ایک بار پھر اُس کے ریشمیں

بالوں میں چہرہ چھپا لیا۔ ''میری زندگی ہو۔ اور اپنا زندگی کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔۔۔''

چند لمحے یوں ہی وہ اُس کے بالوں کی بھیگی بھیگی مہک میں مدہوش سا سرگوشیاں کرتا رہا۔۔۔ پھر۔۔۔

سر اُوپر اُٹھا لیا۔ بالوں میں انگلیاں پھنسا کر درست کیا۔ پشت ایک بار پھر مسہری کی پشت سے ٹکا لی۔

''آج صبح سے مجھ کو ٹمپریچر ہے''۔ وہ تھکا تھکا سا بولا۔

''کیا؟'' وہ اپنی بات بھول بھال گئی، سیدھی ہو بیٹھی۔ اُس کی ذرا سی تکلیف سے لگتا تھا اُس کی جان نکل جاتی تھی۔

''کوئی خاص نہیں''۔ وہ مسکرا دیا۔ ''میں نے دوائی لے لیا ہے''۔

نی شے اُس کا ماتھا چھوا۔ بہت گرم تھا اُس وقت بھی، اُس کی آنکھیں بھی مضمحل سی تھیں، چہرہ بھی نڈھال۔

''آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟''

''پہلے تو تم کو پیار کر رہا تھا''۔ وہ اُس وقت بھی اُس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

اُس کی پلکیں گرنے اُٹھنے لگیں، چہرہ کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو گیا۔

''آپ... لیٹ جائیں''۔ وہ جھکی نظریں لئے بولی۔

اُس نے تھکی سی سانس لی۔ آہستہ سے بستر میں سلپ ہو گیا، کروٹ اُس کی طرف لیتے ہوئے دونوں بازو سینے پر باندھ لئے۔

''لو لیٹ گیا''۔

''آنکھیں بند کر لیں''۔

''بند کر لیں''۔ اُس نے واقعی آنکھیں موند لیں۔

نی شے چند ثانیے اُس کے پُرکشش چہرے کو تکتی رہی۔۔۔ پھر۔۔۔ آہستہ سے وہاں سے اُٹھنے لگی کیونکہ اُسے سچ مچ آرام کی ضرورت تھی۔

زار کے لبوں کے گوشے پھڑ پھڑا اُٹھے، شریر مسکراہٹ مچل اُٹھی۔ ہاتھ بڑھا کر

بالوں سے کھینچ لیا۔ آنکھیں پٹ سے کھول دیں۔

''بے ایمان۔'' نی شے نے اُس کی بولتی آنکھوں پر اپنا رکھ دیا۔

''مت جاؤ''۔ اُس کا ہاتھ اُس نے ہونٹوں سے لگا لیا۔ ''اِسی طرح بیٹھے رہو میرے پاس۔ ہمیشہ۔۔۔''

اور۔۔۔ دروازے پر دستک کی آواز آئی۔

''ہمہ''۔ وہ جھنجلا اُٹھا۔ ''یہ لوگ مجھ کو مرنے کا وقت نہیں دیتا پیار کرنے کا کیا دے گا''۔ وہ واقعی اپنے مشین کی طرح کام کرنے سے عاجز آ گیا تھا۔

نی شے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ہولے سے مسکرا دی۔ اُس کی مسکراہٹ میں شوخی تھی۔

''میرا خیال ہے خاصا وقت دے چکے ہیں آپ کو۔ یہ الگ بات ہے آپ کو احساس نہیں''۔ اُس نے اپنا پورے آدھے گھنٹے اُس کے کمرے میں ہونے کی طرف اشارہ کیا۔

''تم بھی خراب ہے''۔

اُس کے لب و لہجے پر وہ خوبصورتی سے ہنس دی۔

''میں چلتی ہوں''۔ اُس نے جانے کو قدم بڑھائے۔

''Send him in please''- زار نے دروازے پر کھڑے ملازم کے لئے کہا۔

اور وہ نپے تلے قدم اُٹھاتی باہر نکل گئی۔

ناشتہ سے فارغ ہو کر اُس نے ہلکے سلیٹی پرنٹ کے کپڑے پہنے، ہمرنگ دوپٹہ لیا، میچنگ سینڈل پہنی اور باہر نکل آئی اِردگرد دیکھا۔۔۔ آہستہ آہستہ چلتی وہ دادا جان کی طرف آ گئی۔

کمرے پر پہنچ کر دروازے پر دستک دی۔

کوئی جواب نہیں آیا۔ شاید باتھ روم میں تھے۔ وہ واپس لوٹ آئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ گئی۔ دوبارہ دستک دی اب بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ آج خلاف توقع ایسا تھا۔ وہ پھر واپس لوٹ آئی۔

جانے کیا بات تھی؟

کوریڈور کے آخری سرے پر کرامت بابا مل گئے۔

"باباــــ دادا جان کمرے میں نہیں ہیں کیا؟"

"ہیں تو کمرے میں ہی مگرــــ طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے اُن کی"۔

"کیا؟" وہ پریشان لگنے لگی۔

"ہاں بیٹی۔ کل شام سے ہی کچھ پریشان سے تھے۔ رات کھانا کھائے بغیر ہی سونے کے لئے بستر پر چلے گئے تھے۔ رات میں طبیعت زیادہ بگڑ گئی..."

"مگر ہوا کیا؟" وہ اُنکی بات کاٹتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"معلوم نہیں۔ کچھ کہتے بھی نہیں ہیں۔ بس خاموش ہیں، بے چین ہیں۔ رات بھی ڈاکٹر آیا تھا، اِس وقت بھی دیکھ گیا ہے۔"

"کیا کہتا ہے ڈاکٹر؟"

"یہی کہ کوئی ذہنی صدمہ لگتا ہے۔ آرام کی گولیاں دے گئے تھے۔ اِس وقت بھی چھوٹے صاحب آرام کی گولی دے کر گئے ہیں۔ غافل ہیں اِس وقت"۔

"اوہ"۔ وہ بے چین ہو اُٹھی۔

انہیں دیکھنے کو بے قرار ہو گئی مگرــــ ڈاکٹر نے انہیں آرام کی تاکید کی تھی، کسی قسم کی مداخلت سے منع کر گیا تھا۔

اگلے دو دن بھی انہیں دیکھے بغیر ہی گزر گئے۔ زار البتہ ملتا تھا بے حد پریشان تھا، بے کل تھا۔ بقول اُس کے کچھ سمجھ نہ پا رہا تھا۔ کہ دادا جان کو اچانک کیا ہو گیا تھا۔ باوجود اصرار کے وہ اُس سے بھی ہوں ہاں کے علاوہ زیادہ بات نہ کر رہے تھے۔

اگلے دن کرامت بابا نے بتایا۔ کل شام سے اُن کی طبیعت قدرے بہتر تھی۔ بات چیت بھی کرنے لگے تھے۔

خدا کا شکر ادا کرتی وہ خوش خوش اُن کے کمرے کی طرف چل دی۔

دروازے پر دستک دی۔ اجازت پائی تو اندر داخل ہو گئی۔

دیکھا دادا جان مسہری کی پشت سے ٹکے تکیوں کے سہارے نیم دراز تھے۔ سرخ وسفید رنگت ماند پڑ گئی تھی اور آنکھوں کے نیچے حلقے نمایاں نظر آ رہے تھے۔

نظریں نئی شے پر پڑیں تو ایک پل کو جیسے چونک سے اُٹھےــــ پھرــــ

اچانک چہرے کا رنگ بدل سا گیا۔ آنکھیں بجھ سی گئیں۔ پھرــــ بے کل سے نظر آنے لگے۔ نظریں اِدھر اُدھر بھٹکنے لگیں۔ دونوں ہاتھ کسی اندرونی خلفشار کی سبب آپس میں ملنے لگے۔

"صبح بخیر دادا جان"۔ وہ آہستہ سے بولی۔ کہ اِس سے قبل دادا جان نے ہمیشہ بہت گرمجوشی سے اُسے خوش آمدید کہا تھا۔

"صبح بخیر"۔ وہ دھیرے سے بولے۔

پھرــــ قریب سے گلاس اُٹھا کر دو گھونٹ پانی پیا۔ جیسے کوشش کر کے اپنی اندرونی کشمکش پر قابو پانے کی سعی کر رہے ہوں۔

آہستہ آہستہــــ اُن کا رنگ بحال ہونے لگا۔ آنکھوں میں جوت آنے لگی، ہاتھوں کی غیر اختیاری حرکت کم ہونے لگی۔

وہ اب بھی کھڑی تھیــــ پتہ نہیں کیا بات تھی؟ وہ ہمت کھونے لگی تھی۔

"بیٹھو"۔ جیسے کوشش کر کے انہوں نے اپنی توجہ اُس کی طرف مبذول کی۔

وہ قریب کرسی پر بیٹھ گئی۔ ہر بات کے شروع اور آخر میں بیٹی، لگا کر اُس سے بات کرنے والے دادا جان آج اتنے اجنبی اجنبی کیوں تھے؟ اِس کے باوجود کوشش بھی کر رہے تھے کہ اپنے اوپر قابو پائیں اور اُس سے اُسی طرح پیش آئیں جیسے پہلے کرتے تھے۔"

"اب کیسی طبیعت ہے آپ کی دادا جان"۔ اُس نے بمشکل ہمت مجتمع کی۔

اُنہوں نے نظریں اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ ایک کرب تھا اُن کی آنکھوں میں، ایک اذیت تھی، ایک درد تھا۔

وہ تڑپ اُٹھی۔

"کیا بات ہے دادا جان"۔ بے اختیار وہ اُن کا کانپتا ہاتھ تھام کر سہلانے لگی۔

وہ ہونٹ کاٹنے لگے۔ بوڑھی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ کچھ کہنے کو جیسے الفاظ ڈھونڈنے لگے۔

وہ بے چین ہو گئی، بے قرار ہو گئی، بے کل ہو گئی۔ کہ اِس نیک بزرگ انسان سے

اُسے بے حد عقیدت تھی، بے اندازہ ہمدردی تھی، بہت محبت تھی۔

''دادا جان بولیئے نا کیا پریشانی ہے آپ کو؟''۔ اُن کے جھریوں والے ہاتھ کو عقیدت سے آنکھوں سے لگاتے ہوئے اُس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

انہوں نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا، اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ سامنے دیکھنے لگے۔

''ہاں۔۔۔ ہم تمہیں ضرور بتائیں گے۔ تم ایک اچھی لڑکی ہو۔۔۔''

وہ سیدھے ہوئے، تکیوں سے پشت نکالی۔ کھلی کھڑکی میں سے اُس پار دیکھنے لگے۔

جیسے اکٹھا کر رہے ہوں، یادوں کو، باتوں کو، واقعوں کو۔۔۔

وہ کچھ حیران سی انہیں دیکھنے لگی۔

''تب زار قریباً آٹھ سال کا تھا۔ ایک شام ہم اپنے کمرے میں بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے کہ ضیاء ہمارا بیٹا آیا بولا۔

''بابا۔۔۔ میں ذرا افضل کی طرف جا رہا ہوں۔ رشید بھی وہیں ہوگا، انہوں نے کہلایا ہے کہ میں جو کہوں گا وہ ماننے کو تیار ہیں''۔

افضل اور رشید۔۔۔ وہی عبدالرشید خدا مغفرت کرے جو پچھلے دنوں مارا گیا۔ یہ دونوں ضیاء کے بزنس پارٹنر تھے۔ کچھ دنوں سے ضیاء اُن دونوں کی کسی تجویز پر متفق نہیں ہو رہا تھا۔ لہٰذا اس وقت انہوں نے ضیاء کے پاس ضیاء کے ایک جگری دوست کو۔۔۔ جس کا اِن لوگوں کی بزنس سے کوئی تعلق نہیں تھا اور پھر ضیاء کو اُس کی دوستی پر بھی ناز تھا۔ بھجوایا کہ وہ اُسے افضل کے یہاں ساتھ لے آئے وہیں بات طے ہو جائے گی۔

''کب تک لوٹو گے بیٹا''۔ ہم نے پوچھا۔

ضیاء نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی، مسکرایا بولا۔ ''ٹھیک دو گھنٹے بعد آپ کے پاس ہوں گا بابا''۔

جاتے ہوئے زار کو بھی ساتھ لیتا گیا کہ زار میں اس کی بھی جان تھی۔

وہ تینوں افضل کی طرف چل پڑے۔۔۔ پھر۔۔۔ زار نے ہم کو بتایا۔

''افضل انکل کے یہاں چائے پینے کے بعد افضل انکل کی ہی تجویز پر سب باہر چہل قدمی کرنے نکل پڑے۔

شام اندھیری ہو چلی تھی۔ میں واک کے دوران بڑوں سے آگے نکل گیا تھا۔ گھنے درختوں کے بیچوں بیچ گزرتے۔۔۔ اچانک بابا جان کی دلدوز آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا، بابا جان زمین پر گرے پڑے تھے۔ اور رشید انکل بابا جان کے دوست سے کہہ رہے تھے۔

''آفرین ہے تم پر۔۔۔ کس مکاری سے اپنے جگری دوست کو مارا ہے''۔

بابا جان کے دوست کے ہاتھ میں چھُرا تھا اور وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ جب مجھ پر نظر پڑی تو وہ میری طرف بڑھا۔ میں خوفزدہ ہو کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ رشید انکل اور افضل انکل مجھے پکارتے رہ گئے مگر میں نہیں رکا۔ اُس وقت مجھے اُن سب سے خوف آ رہا تھا۔۔۔ پھر وہ زیادہ بھی تھے۔۔۔ مجھ سے بہت بڑے بھی تھے۔۔۔

دادا جان نے سر مسہری کی پشت سے ٹکا دیا۔ آنکھیں موند لیں۔۔۔ کہ وہ اتنے تھکے ہوئے لگ رہے تھے جیسے میلوں بھاگے ہوں۔

''بہت بھاگ دوڑ کی ہم نے۔۔۔ چپہ چپہ چھان مارا۔ وہ ملک چھوڑ کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ انسان کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی ورنہ کون کہہ سکتا تھا کہ ضیاء پر جان چھڑکنے والا اُس کا عزیز دوست اپنے ہاتھ سے اُسے ختم کرے گا بہر حال وہ فرار ہوا تو یقین پختہ ہو گیا۔

چھ سات ماہ زندہ رہ کر بہو بھی ضیاء کے غم میں چل بسی۔ ہم اور زار اکیلے رہ گئے۔

زار کا نشانہ بچپن ہی سے بہت اچھا تھا۔ جب بھی ایئر گن سے وہ اپنا مطلوبہ نشانہ گراتا کہتا ''اِسی طرح ایک دن بابا جان کے دوست کو اُڑاؤں گا مگر ہاتھ آئے سہی''۔

اُس کی آنکھوں میں انتقام کے شعلوں کی لپک ہوتی، بدلے کی چنگاریاں ہوتیں، خون کی آگ ہوتی۔

وہ دس برس کی عمر سے ہی اپنے باپ کی رائفل لے کر کہتا ''اِس سے بدلہ لوں گا''۔ ایک ایک دن گن رہا تھا کہ کب وہ اِس قابل ہوگا کہ بندوق اُٹھا سکے اور باپ کا

بدلہ لے سکے مگر۔۔۔

وہ چودہ برس کا ہوا۔ ہمیں بھی اُس کے بازوؤں میں بدلہ لینے کی بھرپور طاقت یقینی نظر آئی تو پتہ چلا۔

ضیاء کا دوست وہیں بیرون ملک انتقال کر گیا۔ تب سے ہی مایوسی اور بے بسی نے زار کو نیم پاگل کر دیا ہے۔ کبھی بہت ہشاش بشاش رہتا ہے کبھی اچانک اُداسی اور مایوسی آن گھیرتی ہے اُس وقت اُسے ذرا سی بات پر غصہ آ جاتا ہے، سب درہم برہم کر دیتا ہے۔''

وہ قدرے رک کے گہری سانس لی۔

''ہماری کوشش ہوتی ہے''۔ وہ پھر کہنے لگے۔ ''کہ اُس کے باپ کی وہ مخصوص رائفل اُس کی نظروں سے دور رہے۔ اُسے دیکھ کر اُسی رائفل سے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ نہ لے سکنے کا احساس اُسے گھیر لیتا ہے۔ مایوسی اُس وقت شدت اختیار کر لیتی ہے، اُداسی حد سے تجاوز کر جاتی ہے۔۔۔ بہر حال۔

ضیاء کا دوست اپنی موت کے بعد اپنے پیچھے ایک بیوہ اور ایک بچی کو چھوڑ گیا تھا۔

''وہ نی شے کی طرف مڑے۔

''تمہیں معلوم ہے وہ بچی کون ہے؟''

وہ اُداس، پریشان، متحیر سی انہیں ایک ٹِک دیکھے جا رہی تھی۔

''وہ تم ہو۔'' وہ اُس کا کبھی بھی قسم کا ردِعمل دیکھے بنا پھر سامنے دیکھنے لگے۔

''تمہارے باپ نے محمد انوار نے ہمارے بیٹے کو قتل کیا تھا۔ پھر افریقہ فرار ہو گیا تھا۔ وہیں کسی پاکستانی خاتون سے شادی کر لی تھی۔ ایک بیٹی بھی پیدا ہوئی، وہیں بس گیا تھا۔۔۔ یہ سب ہمیں اُس وقت معلوم ہوا جب انوار انتقال کر چکا تھا۔۔۔'' انہوں نے پھر ایک گہری سانس لی۔

''زار کے دل میں بدلے کی آگ اندر ہی اندر سلگتی رہ گئی۔ ہم نے اُس کی دل جوئی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد ہم نے زار کو انگلینڈ پڑھائی کے لئے بھیج دیا اِسی بہانے ہی شاید اِس پر دم تپتی آگ میں کچھ ٹھنڈ پڑ جاتی۔۔۔

چند برس وہاں رہ کر واپس آیا تو خاصا سنجیدہ بردبار، ہو گیا تھا ہر آن بدلہ لینے کی رٹ واقعی مدھم پڑ گئی تھی۔ جیسے سمجھوتہ کر لیا تھا حالات سے کہ مرے ہوئے کو کیا مارنا! مگر۔۔۔

ابھی کچھ عرصہ قبل ایک روز زار کے قریبی دوست ایاز نے زار سے چھپ کر ہمیں بتایا کہ افریقہ سے محمد انوار کی جوان بیٹی شادی کرنے پاکستان آئی تھی۔ زار نے پتہ نہیں کن کن ذرائع سے اُس کی آمد معلوم کر لی تھی اور اُسے ایئر پورٹ سے اغواء کرا کے اپنی پہاڑ والی کوٹھی پر اُس وقت تک مقید رکھا تھا جب تک کہ اُس کی شادی کا دن گزر نہیں گیا تھا۔ ایاز کو زار کی یہ حرکت ٹھیک نہیں لگی تھی۔

یہ جان کر ہمیں بہت افسوس ہوا۔ ہمیں یاد آیا انہی دنوں زار سارا سارا دن گھر سے باہر رہتا اور بے حد پریشان رہتا۔ ہم جاننے کی کوشش کرتے بھی مگر وہ ٹال جاتا۔ بہرحال۔۔۔

تب تم بھی یہیں تھیں جب ایاز نے ہمیں صورتحال بتائی۔

ہم نے زار سے پوچھ گچھ کی۔ اُسے اُس کی اِس حرکت پر بہت سرزنش کی۔

''ایک کمزور لڑکی سے اِنتقام لینا بزدلی ہے بہادری نہیں، خاص طور سے اُس کی شادی رکوا کر تم نے اتنا ہی بُرا کیا ہے جتنا اُس کے باپ نے کیا تھا''۔ ہم بہت برہم تھے اُس کے اِس اقدام پر۔

ہم نے دیکھا بجائے پشیمان ہونے کے وہ بہت خوش تھا بہت مطمئن۔

''صرف یہ ہی نہیں دادا جان ہم نے اُس کا اِس ملک میں ایک نہیں چلنے دیا۔ اُس نے جہاں بھی نوکری کی درخواست دیا منظور ہو جانے کے بعد بھی ہم نے اُس کو جواب دلوا دیا۔ اُس جاب سے۔۔۔ وہ جس شہر میں بھی گیا میں نے اُس کا پیچھا کرایا یہاں تک کہ۔۔۔'' آرام سے کہتا وہ مسکرا رہا تھا۔

شاید اُس کے انتقام کی کچھ تپش کم ہو رہی تھی اِس لئے یوں اطمینان سے بول رہا تھا ورنہ ہمارے سامنے اُسے دم مارنے کی ہمت نہیں۔

''یہاں تک کہ کیا؟'' ہم نے پوچھا۔

"یہاں تک کہ وہ واپس افریقہ کوچ کر گیا۔" وہ بے حد خوش تھا۔

دادا جان ایک بار پھر خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر سامنے دیکھنے کے بعد رخ اِس طرف کیا۔ سائیڈ ٹیبل پر سے گلاس اُٹھایا۔ دو گھونٹ اور پانی پیا۔

"تین چار روز قبل ہماری پہاڑ والی کوٹھی کا چوکیدار آیا تھا۔ تم شاید کسی کام سے باہر جا رہی تھیں اُس نے تمہیں پورچ میں گاڑی میں بیٹھتے دیکھ لیا تھا۔ رخصت ہوتے وقت ہم سے ملنے آیا تو اُس نے بتایا کہ تم وہی لڑکی ہو جس کو زار نے وہاں کوٹھی میں بند رکھا تھا۔ وہ بھی اِس انہونی پر پریشان تھا۔ کیونکہ زار نے اس سے قبل کبھی کوئی ایسی غلط حرکت نہیں کی۔ سو ہم ـــ" انہوں نے گہری سانس لی۔

"جان گئے کہ تم ہی محمد انوار کی بیٹی ہو۔ ہمارے بیٹے کے قاتل کی بیٹی ـــ جس کو ہم نے بڑی محبت سے اپنے پاس رکھا تھا۔ قدرت کی یہ ستم ظریفی بجلی بن کر ہمارے اعصاب پر گری۔ ہم اپنے حواس قائم نہ رکھ سکے۔ بستر پر پڑ رہے ـــ زار کے اصرار پر بھی ہم اُسے کچھ نہ بتا سکے کہ ـــ ہم جانتے ہیں وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔ اپنے باپ کے قاتل کی بیٹی جس کو وہ چاہتا بھی ہے اُسی کے گھر میں موجود ہے کیا وہ برداشت کر پائے گا؟

یہی سوچ کر ہم خاموش ہیں۔ مگر یہ راز کتنے دن چھپ سکے گا؟ تم اچھی طرح جانتی ہو ـــ"

وہ چونکے ـــ نی شے بری طرح رو رہی تھی۔ پھوٹ پھوٹ کر، بلک بلک کر۔

چند لمحے وہ خاموشی سے اُسے تکتے رہے۔ پھر اُس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"تم پریشان نہ ہو بیٹی ـــ ہم نے یہ چند دن اِس کشمکش میں گزارے ہیں۔ تم بہت نیک لڑکی ہو۔ باپ کے کیے کی سزا تمہیں کیوں دی جائے؟ اور پھر ـــ ہم نے تم سے وعدہ کیا تھا۔ ہم تمہارے بھی دادا جان ہیں اور اِس میں تم ہمیں پیچھے نہیں پاؤ گی۔ ہم اپنے وعدے سے نہیں پھر سکتے۔" انہوں نے بڑے ضبط سے کہا۔

اور ـــ نی شے کچھ بھی کہے بنا اُٹھ کھڑی ہوئی اور ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح کمرے سے باہر نکل آئی۔

وہ راز! جسے جاننے کو وہ لمحہ لمحہ بے تاب تھی۔ وہ معمہ! جسے حل کرنے کی اُسے پل پل ٹوہ لگی رہتی تھی۔ وہ پہیلی! جسے بوجھنے وہ یہاں تک آ پہنچی تھی ـــ یوں لمحوں میں مکمل گیا تھا، حل ہو گیا تھا، بوجھ لیا گیا تھا۔

وہ تو کہاں سے کہاں کے سرے ملا رہی تھی ـــ یہ تو اُسی کی ہی ذات کے گرد لپٹے رہ گئے تھے جو آج ـــ ڈھیلے پڑ گئے، سلجھ گئے، کھل گئے۔

"کیا تمہارا شاعر نے چاقو سے کسی کو مرتے دیکھا ہے؟ کبھی اُس نے لکھا کہ سات آٹھ سال کے بچے پر کیا گزرا ہو گا جب اُس کا آنکھوں کا سامنے اُس کا باپ کو چھرا مار دیا گیا ہو گا؟" اُسے گاؤں میں اوپر لائبریری میں زار کی بحث یاد آئی۔

"انسان بہت دکھی ہے بہت درد کا مارا ہے ـــ" اُس کی ڈوبتی سی آواز میں دکھ تھا، درد تھا۔

"آپ کیوں دکھی ہو رہے ہیں؟" وہ بھی بے چین ہو گئی تھی۔ پوچھے بنا نہ رہ سکی تھی۔

"... کیا کبھی کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ انسان صرف اِس لئے خوش رہتا ہے کہ کوئی اور اُس کا دکھ نہ جان لے اِس لئے ہنستا ہے کہ دوسرا اُس کا آنسو نہ دیکھ لے ـــ" اُس کے لہجے میں بے پناہ اداسیاں تھیں، انداز میں بے اندازہ مایوسیاں تھیں۔

"کبھی کبھی تو میں خود چاہتا ہوں کہ اُس کا دنیا میں کھو جاؤں، گم ہو جاؤں اپنا آپ بھی نہ ملوں ـــ" اُس کی گہری سانس بہت اُداس تھی۔

وہ بھی دکھی ہو گئی تھی، افسردہ ہو گئی تھی۔

پھر ـــ اُسے اسلحہ دکھاتے دکھاتے اُس نے ایک رائفل اُٹھالی تھی۔ چمکتی چمکتی آنکھوں میں ڈھیر ساری اُداسی آسمٹی تھی۔ ہنستا مسکراتا چہرہ تاریک سایوں میں گھیر گیا تھا۔

"یہ ـــ میرا بابا جان کا ہے" اُس کی آواز جیسے دور کہیں سے آ رہی تھی۔

"مگر"۔ اُس نے گہری دکھی سانس لی تھی۔ "کس کام کا؟" اُس نے اُسے بکس میں اُچھال دیا تھا۔ "یہ سارا اسلحہ کس کام کا؟" وہ اچانک سب چھوڑ چھاڑ کر دروازے

کی طرف بڑھا تھا۔

''ہماری کوشش ہوتی ہے کہ اُس کے باپ کی مخصوص رائفل اُس کی نظروں سے دور رہے۔ اُسے دیکھ کر اُسی رائفل سے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ نہ لے سکنے کا احساس اُسے گھیر لیتا ہے ـــ مایوسی اُس وقت شدت اختیار کر لیتی ہے، اُداسی حد سے تجاوز کر جاتی ہے ـــ'' ابھی کچھ دیر قبل دادا جان کہہ رہے تھے۔

''دوستی پر یقین رکھتا ہے تم؟ جگری دوستی پر؟'' اُس کے کانوں میں پھر زار کی آواز گونجی۔ اسلحے کے کمرے سے نکل کر جاتے ہوئے وہ یہی تو کہہ رہا تھا۔

''آپ کو کیا ہو جاتا ہے؟'' اُس نے پوچھا تھا۔

''پتہ نہیں ـــ مجھ کو خود بھی پتہ نہیں'' دیوار سے ٹکتے ہوئے وہ شکست خوردہ لہجے میں کہنے لگا تھا۔ ''میں خود Vague سا رہتا ہوں۔ ہر طرف دھواں سا نظر آتا ہے۔ سب کچھ بے معنی لگتا ہے۔ اپنا زندگی بے مقصد لگتا ہے ـــ''

کچھ نہ جانتے ہوئے بھی اُسے اُس پر ترس آنے لگا تھا۔

کتنا اُداس تھا وہ تب بھی۔ کتنا دکھی تھا وہ اُس وقت بھی۔

اُس کی اُداسی اُس کا دکھ تب بھی اُسے اُداس، دکھی کر گئے تھے ـــ آج تو وہ ـــ

ٹوٹ ہی گئی تھی ـــ چور چور، ریزہ ریزہ ہو گئی تھی ـــ بکھر بکھر گئی تھی۔

وہ جو اُس کی زندگی تھا، اُس کی جان تھا، اُس کی روح تھا۔ خود اپنی زندگی کی، جان کی، روح کی وہ ہی ـــ دشمن تھی۔

زار نے اُسے پیار کیا تھا، اُس نے اُس کی صرف محبت ہی دیکھی تھی اور وہ مرتے دم تک اُسی محبت کے تصور میں رہنا چاہتی تھی۔

یہاں سے چلی جانا چاہتی تھی کہ اُس سے اُس کی نفرت نہ دیکھی جاتی تھی، اُس کے نفرت کی وہ متحمل نہیں ہو سکتی تھی، اُس کی نفرت زندگی نہیں موت تھی۔

اُس کا دوسرا روپ دیکھنے سے قبل ہی وہ یہ جگہ چھوڑ دینا چاہتی تھی۔

کمرے میں آ کر اُس نے جلدی جلدی اپنا سامان اٹیچی کیس میں ٹھونسا پچھلے دروازے سے ٹیرس کی طرف آئی اور ملازموں کی نظروں سے بچتی بچاتی اونچے

اونچے پیڑوں کے جنگل کو عبور کرتی کچے راستے پر آ گئی۔

کوٹھی کی حدود سے نکل آئی تھی۔ اور آگے بڑھی اور پھر۔ ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔

ایک لمحے کو اُسے صادق چاچا کے گھر کا خیال آیا۔ مگر پھر ارادہ بدل دیا۔ وہ جگہ زار کے مخبر کے علم میں تھی۔

اُس نے ٹیکسی کو کسی مقامی ہوٹل میں جانے کو کہا۔ زار کو فی الحال اس واقعہ کا کوئی علم نہیں تھا لہٰذا اتنی جلدی اُس کے مخبر بھی اُس کا پیچھا نہیں کر سکتے تھے۔ ہوٹل میں ہی رہ کر وہ جلد سے جلد افریقہ واپس جانے کا بندوبست کرے گی۔

زار آفس سے واپس آیا۔ تو ایک خاموش سی کھلبلی مچی ہوئی تھی گھر میں ــــ
حسب عادت وہ دادا جان کو سلام کرنے اُن کے کمرے میں گیا تو وہاں بھی لگتا تھا۔ کچھ بے چینی ہے، بے کلی ہے۔
''دادا جان کیسا طبیعت ہے اب آپ کا''۔ انہیں صوفے پر بیٹھے دیکھ کر اُسے بہرحال ڈھارس ہوئی۔
''خدا کا فضل ہے بیٹا۔ بہتر ہوں اب تو''۔ مگر پریشانی اُن کے چہرے سے عیاں تھی۔
''کوئی خاص بات ہے کیا؟''۔ وہ قریب آ گیا۔
''نہیں ــــ تم کھانا کھا لو پھر آنا''۔
''میں کپڑے بدل کر ابھی آتا ہے۔'' وہ مڑا۔

''ہم نے کہا نا کھانا کھا کر آنا''۔ کسی بھی قسم کی پریشانی میں پڑنے سے پہلے وہ چاہتے تھے وہ کھانا کھا لے۔
''جی اچھا''۔
اور کچھ ہی دیر بعد وہ کھانے سے فارغ ہو کر دوبارہ آ گیا۔
''بیٹھو''۔ دادا جان کچھ سوچتے ہوئے بولے۔
وہ اُن کے مقابل صوفے پر بیٹھ گیا۔
''نی شے چلی گئی ہے''۔ انہوں نے ابتداء کی۔
''کہاں؟'' وہ چونک سا گیا۔
گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے''۔
''کیوں؟'' وہ مضطرب ہو گیا، بے قرار ہو گیا، بے کل ہو گیا۔
''ریلیکس ــــ اور حوصلے سے ہماری بات سنو''۔
وہ سوالیہ نظریں لئے ہمہ تن گوش تھا۔
''نی شے ضیاء کے قاتل محمد انوار کی بیٹی ہے ــــ''
''کیا؟'' اُسے جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ آنکھیں پھیل سی گئیں۔ گرفت صوفے کے بازو پر سخت ہو گئی۔
''ہاں''۔ چند روز قبل پہاڑ والی کوٹھی سے چوکیدار کریم آیا تھا۔ نی شے کو یہاں دیکھ کر اُسی نے بتایا۔ تم نے جس لڑکی کو وہاں مقید رکھا تھا وہ نی شے ہی تھی ــــ''
زار کے چہرے کا رنگ سیاہی مائل ہو رہا تھا۔ مٹھیاں بھنچ گئی تھیں اور آنکھوں میں وحشت اُترنے لگی تھی۔
''جلد یا بدیر یہ حقیقت تمہیں معلوم ہو ہی جانی تھی۔ ہمیں نہیں معلوم وہ یہاں ارادتاً آئی تھی یا یہ سب اتفاق تھا۔ مگر اچھی لڑکی تھی، نیک لڑکی تھی اور پھر تمہیں پسند تھی ــــ''
''مر گیا میرا پسند''۔ وہ اضطراری حالت میں اُٹھ کھڑا ہوا ــــ آپ نے مجھ کو پہلا کیوں نہیں بتایا''۔
''وہ تو سب ہم نے اپنی جان پر سہہ لیا ــــ''

اور دادا جان کی پچھلی حالت سوچ کر وہ تو جیسے ہوش سے بیگانہ ہونے لگا۔

''آپ نے کیوں سہا۔ مجھ کو بتایا ہوتا میں اُس کا گلہ دبا دیتا ختم کر دیتا اُس سانپ کو۔'' اُن کے بستر کی پشت تھامے اُس کے ہاتھ جیسے لکڑی کے آر پار ہونے لگے۔

''اول تو یہ کہ تم اُسے چاہتے تھے۔ دوئم یہ کہ ہم نے اُس کے ساتھ وعدہ کیا تھا۔ اُس کے تحفظ کا اُس کے___''

''کون کہتا ہے میں اس کو چاہتا ہے۔ مر گیا میرا محبت۔ اور اُس کا تحفظ کا وعدہ! ہونہہ___ اُس کا باپ میرا باپ کو قتل کرے اور ہم اُس کا تحفظ کرے؟'' اُس کے لب و لہجہ میں زخمی شیر کی چنگھاڑ تھی، اذیت تھی، کرب تھا۔

اُس کا ردِعمل قدرتی تھا۔

اول تو اُس کے باپ کے قتل کی چوٹ مندمل نہ ہو پا رہی تھی۔ اوپر سے جس لڑکی سے دیکھے بغیر ہی وہ بے پناہ نفرت کرتا آیا تھا اُسے اپنے تئیں ملک بدر کر چکا تھا۔ وہی اُن لوگوں کی مہربانیوں اور خاص طور سے زار کی شدید محبتوں میں رہ رہی تھی۔ اُس کے ساتھ مذاق نہیں تو اور کیا تھا!

دادا جان اُٹھ کر اُس کے پاس چلے آئے۔

''جا کر آرام کرو بیٹا۔ ہم جانتے ہیں تمہاری ذہنی حالت اِس وقت کیا ہے مگر___ ہونی کو کون روک سکتا ہے''۔ وہ شفقت سے اُس کا کندھا سہلا رہے تھے۔

''میں اُس کو نہیں چھوڑوں گا۔ پہلے تو ملک میں نہیں چھوڑ رہا تھا اب اِس دنیا میں نہیں چھوڑوں گا۔ آپ کو نہیں معلوم کہ وہ اِرادتاً آیا تھا یا اتفاق سے مگر میں کہتا ہوں وہ جان بوجھ کر آیا تھا۔ اوہ___ کیا کوئی یقین کر سکتا ہے، ظاہر میں اتنا بے ضرر سا لڑکی اتنا چالباز ہو سکتا ہے''۔

''حوصلہ کرو بیٹا___ جلد بازی اچھی نہیں___ انتقام بھی بہادری سے لیا جانا چاہئے بزدلی سے نہیں۔ ہمارا جھگڑا اُس کے باپ سے تھا بیٹی سے نہیں...''

''دادا جان___'' وہ بے حد حیرت سے اُنہیں دیکھنے لگا۔ ''یہ آپ کہہ رہا ہے؟ ضیاء کا باپ۔ جس کی صبح اُس کا تصویر دیکھنے پر ہوتا ہے۔ جو بغیر ناغہ ہر رات کمبل میں

منہ چھپا کر اُس کو آنسوؤں کا نذرانہ دے کر سوتا ہے۔ جو کئی سالوں سے برابر ہر دوسرا بات اُسی کا کرتا ہے جو اُس کا ہر عادت ہر بات مجھ میں ڈھونڈتا رہتا ہے جو کسی طرح اُس کو بھول نہیں پاتا___''

دادا جان کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ ہاتھوں میں کپکپاہٹ ہونے لگی۔

''ہاں جانِ دادا''۔ انہوں نے اُس کا کندھا تھپتھپایا۔ آنکھیں جھپکیں۔ ''ہم کہہ رہے ہیں کہ ایک کمزور بے بس اور لاوارث لڑکی کو گزند پہنچا کر ہمیں وہ سکون نہیں مل سکتا جو ضیاء کے قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر ہمیں نصیب ہوتا___'' اُن کی آواز رندھ گئی___ گرفت اُس کے کندھے پر ڈھیلی پڑ گئی۔

زار چونک کر حواسوں میں آ گیا۔ اُس سے دادا جان کی تکلیف نہ دیکھی گئی۔ پہلے ہی خاصی پریشانی بھگت چکے تھے۔

''آپ___ لیٹ جائیں دادا جان''۔ اُس نے انہیں سہارا دیا۔ اپنی پریشانی پسِ پشت ڈال دی۔ اگر وہ ضیاء کا بیٹا تھا تو دادا جان تو باپ تھے۔ اپنے جذبات میں وہ دادا جان کی حیثیت کو کیسے بھول گیا؟ اُسے اپنا آپ خود غرض لگنے لگا۔

اُس نے انہیں لیٹنے میں مدد دی۔ پھر اُن کے قریب ہی مسہری پر بیٹھ گیا۔ جھکتے ہوئے اُن کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ اور___ کئی آنسو دادا جان کے ماتھے کو بھگو گئے۔ پھر___ دادا جان کی نم آنکھوں پر نظر پڑی تو اُن کے سینے سے لگ کر وہ بچوں کی طرح رو دیا۔

کافی دیر بعد اُس نے سر اُٹھایا۔

''آپ کتنا گریٹ ہے دادا جان''۔ بیٹے کے قتل کے بعد بھی ایک باپ کا اتنا فراخدلانہ رویہ اُن کا ہی حصہ تھا۔ اُس نے اُن کے دونوں ہاتھوں کو عقیدت سے اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔

''انسان وہ ہے جو دشمن کو بھی معاف کر دے بیٹا''۔ انہوں نے اُس کا ماتھا سہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہمارا مذہب ہمیں عفو درگزر سکھاتا ہے___''

''ٹھیک ہے دادا جان۔ جیسا آپ چاہے گا ویسا ہو گا''۔

’’نی شے کو ڈھونڈ لو۔ اُس کا ہم لوگوں کے سوا یہاں کوئی نہیں‘‘۔

’’دادا جان‘‘۔ اُس کی آواز میں کرب عود کر آیا۔ ’’میرا گلہ اپنا ہاتھوں سے دبا لیں مگر اُس کا نام آئندہ میرے سامنے مت لیں‘‘۔ وہ ملتجی انداز میں بولا۔

اور ـــــ دادا جان دم بخود رہ گئے۔ وہ اتنی بڑی بات کہہ دے گا وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

’’ہم وہ ہاتھ نہ توڑ دیں ـــــ جو ہماری جان کے گلے کی طرف بڑھیں‘‘۔

’’دادا جان‘‘۔ اُس نے دوبارہ سر اُن کے سینے پر رکھ دیا کہ یہاں اُسے ہمیشہ سکون ملتا تھا، امن اور شانتی میسر آتی تھی۔

دادا جان کے کہنے پر اُس نے نی شے سے کسی بھی قسم کا انتقام لینا یا گزند پہنچانے کا اِرادہ تو ترک کر دیا مگر ـــــ

وہ پل پل پیچ و تاب کھا رہا تھا، بل کھا رہا تھا، برہم ہو رہا تھا۔

مجسم قہر، مجسم غضب، مجسم آگ بن گیا تھا۔

اُس کی دانست میں نی شے اُسے پہچان لینے کے بعد اِس گھر سے اپنی پرانی دشمنی بان کرہی، جان بوجھ کر اِس گھر میں آئی تھی۔

جاب ایک بہانہ تھا ـــــ باپ نے تو اُس کے باپ کو مارا ہی تھا۔ اب یہ اُسے رنے آئی تھی۔ اپنی اداؤں سے، اپنی نزاکتوں سے، اپنے ناز و انداز سے۔

اُس کی ادائیں فریب تھیں، اُس کی نزاکتیں ریا تھیں، اُس کے ناز و انداز سب

جھوٹ تھے۔ محض اُسے پھانسنے کے ہتھیار تھے۔ کہ ـــــ

اِن ہتھیاروں سے وہ اُسے مار دینا چاہتی تھی، ختم کر دینا چاہتی تھی، فنا کر دینا چاہتی تھی۔ ذہنی طور پر، دماغی طور پر، جسمانی طور پر۔

وہ اِرادتاً آئی تھی اتفاقاً نہیں ـــــ اُس کا نام فائزہ انوار تھا۔ سوچی سمجھی سکیم کے تحت باقاعدہ نام بدل کر وہاں آئی تھی۔

اُس سے بدلہ لینا چاہتی تھی کہ اُس نے اُسے اپنے باپ کے قتل کے بدلے میں مقید کیوں رکھا تھا، جاب کیوں نہیں کرنے دی تھی، ملک چھوڑ دینے پر کیوں مجبور کیا تھا۔

ہہہ ـــــ اپنے باپ کے قتل کے بدلے میں وہ یہ بھی نہ کرتا!

اور اب ـــــ اب تو وہ اُسے یقیناً زندہ نہ چھوڑتا۔ اُس نے اُس کے باپ کے قاتل کی بیٹی ہو کر اُس پر پشیمان ہونے، شرمندہ ہونے کے بجائے اُس کی زندگی سے کھیلنے کی کوشش کی تھی۔ اُسے بیوقوف بنایا تھا ـــــ اُس کا مذاق اڑایا تھا، دوہرا مذاق!!! اور ـــــ

اپنے ساتھ مذاق کرنے والوں کو وہ کبھی معاف نہیں کرتا تھا۔

ایک بار ـــــ صرف ایک بار وہ اُسے مل جاتی اور ـــــ وہ اُس سے پوچھ لیتا کہ اتنا بڑا ڈھونگ رچانے کی اُس کی جرات کیسے ہوئی؟

نی شے کے لئے بے پناہ نفرتیں لئے وہ پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ کسی کل چین نہیں تھا، قرار نہیں تھا۔

ملازموں پر بات بے بات بگڑ رہا تھا۔ آفس میں سٹاف پر بات بات پر برہم ہو رہا تھا۔ بزنس پارٹنرز سے اُلجھ اُلجھ رہا تھا ـــــ

زندگی تلخ ہو کر رہ گئی تھی۔ زہر گھل گیا تھا جیون میں ـــــ دوبھر ہو رہا تھا جینا۔

اور ایسے میں اُسے آگ لگ جاتی، راکھ ہونے لگتا، بھسم ہونے لگتا ـــــ کہ ـــــ

یہ تلخی، یہ زہر، یہ دوبھر پن اُسے کیوں ملا؟ یہ سب وہ اُسی کو منتقل کر دینا چاہتا تھا۔ ساری تلخی اُسی کو لوٹانا چاہتا تھا، سارا زہر اُسے ہی پھیرنا چاہتا تھا، دوبھر کر دینا چاہتا تھا اُس کی زندگی کہ ـــــ

خود اُس کی زندگی اتنی سستی نہیں تھی، اتنی فالتو نہیں تھی، اتنی بے مقصد نہیں تھی۔ کہ اُس جیسی مکار لڑکی کے لئے ضائع ہوتی رہتی ـــــ مگر ـــــ

دادا جان نے اُس کا کسی بھی قسم کا پیچھا کرنے کھوج لگانے سے اُسے منع کر رکھا تھا۔ کہہ دیا تھا کہ اگر اُس سے مصالحت اُس کے دل کو گوارا نہیں تو وہ مجبور نہیں کریں گے۔ انہیں اُس کی نیک سیرتی کا اب بھی احساس تھا، اپنے وعدے کا اب بھی پاس تھا مگر زار کو وہ اپنے لئے مجبور کرنے کے قائل نہ تھے۔ ہاں اُس کا پیچھا کر کے اُس کے کیریئر میں روڑے اٹکانے پر وہ خوش نہیں ہوں گے یہ انہوں نے ضرور کہہ دیا تھا کیونکہ بقول اُن کے اُس کو بھی اِس ملک میں اپنے طور پر جینے کا اتنا ہی حق حاصل تھا جتنا کہ خود زار کو ـــــ

یہ سوچتے ہی وہ آپے سے باہر ہونے لگتا، اعصاب جواب دینے لگتے، دماغ کی رگیں پھٹتی محسوس ہوتیں۔

''سر ـــــ آپ کا شوفر بڑی دیر سے نیچے آپ کا انتظار کر رہا ہے''۔ انٹرکوم پر اُس کی سیکرٹری بولی تھی۔

چونکتے ہوئے اُس نے آفس میں لگے کلاک پر نظر ڈالی۔

ایک گھنٹہ پورا وہ چھٹی کے ٹائم کے بعد آفس میں بیٹھا اپنے سے اُلجھ رہا تھا۔

اُسے ندامت سی ہوئی، اُس کی وجہ سے اُس کی سیکرٹری اور باقی کا پورا اسٹاف بھی یقیناً اب تک وہیں بیٹھے تھے۔

وہ لفٹ سے نیچے آ گیا۔ شوفر گاڑی کا پچھلا دروازہ تھامے منتظر تھا ـــــ وہ بیٹھ گیا تو گاڑی چل پڑی۔

صبح کی بوندا باندی اِس وقت تیز بارش کا روپ دھار چکی تھی۔ دنوں بعد پانی پڑا تھا۔

مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو اُس کے مشام کو بھلی لگنے لگی۔ تھکا تھکا سا سر اُس نے بڑی سی گاڑی کی آرام دہ سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا مگر ـــــ

وہ چونکا ـــــ سامنے ہی کچھ فاصلے پر بائیں جانب سڑک کے کنارے شاید کسی

سواری کے انتظار میں نی شے کھڑی بارش میں بھیگ رہی تھی۔

پھر۔۔۔ اُس کی تمام تر وحشتیں لوٹ آئیں۔ غصہ سے پاگل ہونے لگا۔ ایک بار پھر دیوانہ پن سوار ہو گیا۔

''گاڑی موڑو''۔ اُس نے ڈرائیور سے کہا۔

اور۔۔۔ ڈرائیور گاڑی واپس لے گیا۔۔۔ قریب ہی اُس کے آفس کی بلڈنگ تھی۔

''روکو''۔ اُس نے پھر کہا۔

ڈرائیور باہر نکل کر اُس کے دروازے پر آ گیا۔

''سر''۔ اُس نے مؤدب طریق سے پوچھا۔

''تم یہاں سے گھر جاؤ۔ ہم خود آ جائے گا''۔

''یس سر''۔ اُس نے اُس کے لئے دروازہ کھول دیا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی وہ تیزی سے واپس اُسی سمت چل پڑا۔

اُس کی قسمت میں تکلیف سے نجات کی سانس ہو گی تو وہ یقیناً اب بھی وہیں کھڑی ہو گی۔۔۔ اُسے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔

لمحوں میں ہی وہ وہاں پہنچ گیا۔۔۔ نجات کی سانس بھی شاید تھی قسمت میں۔۔۔ وہ اب بھی تیز ہوا اور بارش کی زد میں وہیں کھڑی تھی۔

اُس کے قریب گاڑی روک کر وہ تیزی سے اُترا اور نی شے کو کچھ سوچنے سمجھنے کا موقعہ دیئے بغیر ہی اُسے پسنجر سیٹ پر دھکیل کر دروازہ بند کیا اور سامنے سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آتے ہوئے گاڑی چلا دی۔

سڑک پر نظریں جمائے وہ خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ گو۔۔۔

ذہن میں بگولے اُٹھ رہے تھے، جھکڑ چل رہے تھے، طوفان مچل رہے تھے۔

نی شے سہمی ہوئی تھی، ڈری ہوئی تھی، خوفزدہ تھی۔

کہ اُس کے چہرے کی تاریکیوں، آنکھوں کی چنگاریوں پر سادھی گہری چپ کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ لگ رہی تھی۔

وہ بہت تیز جا رہا تھا، دنوں بعد بارش کی وجہ سے سڑک پر پھسلن ہو رہی تھی، سامنے

سے آنے والی گاڑی سے بچنے کے لئے اُس نے گاڑی کچے میں ڈال دی اور سپیڈ زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ بمشکل گاڑی قابو کر سکا۔ بے ساختہ نی شے جھول کر اُس کی سیٹ کی پشت سے جا ٹکرائی۔

''پلیز زار''۔ غیر ارادی طور پر اُس کا ہاتھ اُس کے سٹیرنگ پکڑے ہاتھ پر جا پڑا۔ ''آہستہ چلائیں''۔

''ہٹاؤ اپنا ہاتھ''۔ وہ دھاڑا۔

اُس نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا مگر۔۔۔

زار نے گاڑی وہیں روک لی۔ رخ اُس کی طرف کر لیا۔

''اب بتاؤ تم میرے گھر کس لئے آیا تھا؟'' اُس کی آنکھیں چنگاریاں اگل رہی تھیں، لہجہ بے پناہ نفرت لئے تھا۔

وہ گم سم سی اُسے دیکھ رہی تھی۔ کوئی جواب نہ بن پڑ رہا تھا۔

''یہی نا کہ مجھ سے بدلہ لے لو کہ کیوں میں نے تم کو پہاڑ پر بند رکھا تھا۔ بولو۔۔۔ جواب دو۔۔۔'' وہ اُس پر برس رہا تھا۔ اُس کا رنگ سیاہی مائل ہو رہا تھا، ہونٹ غصے سے کانپ رہے تھے اور سانسیں تیز چل رہی تھیں۔

اور۔۔۔ نی شے کچھ بھی بولے بنا ایک ٹک اُسے دیکھے جا رہی تھی، کہتی بھی کیا۔۔۔ اتنی ساری نفرت، اتنی گھن گرج میں اُس کی تو آواز ہی گم ہو گئی تھی کہیں۔

''تم مجھ کو بے وقوف بنانے آیا تھا۔ تمہارا باپ میرے باپ کو مارنے کے بعد اب تم مجھ کو ختم کرنے آیا تھا۔ محبت کا ڈھونگ بنا کر۔۔۔''

اپنی محبت پر اتنا بڑا الزام وہ برداشت نہ کر سکی۔ بڑی دیر کے رو کے آنسو بہہ ہی نکلے۔

''میں نے کوئی ڈھونگ نہیں کیا۔ میں سچ مچ۔۔۔''

اُس کے آنسو دیکھ کر وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اُس کی بات سن کر وہ اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکا۔

''شٹ اپ''۔ ایک زور دار تھپڑ اُس نے اُس کے گال پر جڑ دیا۔ ''میرا ساتھ

اور مکاری کیا تو جان لے لوں گا۔۔۔"

نی شے کا چہرہ کھڑکی سے جا ٹکرایا۔ وہ بے دم سی نظر آنے لگی۔

اُسے اور بھی غصہ آ گیا۔ اور بھی برہم نظر آنے لگا۔

"مجھ پر اور نزاکت کا جادو نہیں چلے گا"۔ اُس نے اُسے پہلے سے بھی وزنی ایک اور چانٹا رسید کیا۔

وہ بے سدھ تھی کہ ایسے وار اُس نے زندگی میں اِس سے قبل کبھی نہ سہے تھے۔ مگر حیران نہیں تھی، وہ اِس سے زیادہ کی مستحق تھی، کسی بھی سزا کی۔ اُس کے پاپا نے کام ہی ایسا کیا تھا۔

"تم کو پتہ چل گیا کہ میں کون ہے تو تم اپنا قاتل باپ کا بات جان گیا۔ پھر بجائے اُس کا حرکت پر پشیمان ہونے کے تم نام بدل کر مجھ سے ہی بدلہ لینے میرے گھر تک آ گیا۔ تمہارا اتنا جرات کیسا ہوا؟" اُس نے اُسے جھنجھوڑ ڈالا۔۔۔ "مجھ کو میرے دادا کا خیال نہ ہوتا تو میں تم کو زندہ نہ چھوڑتا۔۔۔"

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے باپ نے کوئی قتل کیا ہے دادا جان نے ہی مجھے..." وہ وہیں کھڑکی میں بے سدھ پڑی کہہ رہی تھی۔

"خبردار جو زبان پر دادا جان کا نام لایا۔۔۔" وہ پھر چنگھاڑا۔ "یہ بتاؤ کہ میرے گھر کیوں آیا؟" وہ خونخوار نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

نی شے کے نازک چہرے پر دیکھتے ہی دیکھتے اُس کے بھاری ہاتھ کی انگلیوں کے نشان اُبھر آئے تھے۔ ہونٹوں کے پاس سے خون کی باریک سی لکیر پھوٹ نکلی۔

"میں... میں کسی غلط مطلب سے نہیں آئی تھی"۔ وہ نقاہت سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ "نہ ہی مجھے اپنے پاپا کی کسی حرکت کا کچھ علم تھا۔ مجھے تو دادا جان کے اشتہار کا مضمون اٹریکٹ کر گیا تھا۔ مجھے وہ بہت کیوٹ سے بزرگ لگے مگر۔۔۔ نیچے اُن کا ایڈریس پڑھا تو میں پہچان گئی، پہاڑ پر چوکیدار مجھے آپ لوگوں کا اتہ پتہ بتا چکا تھا تبھی میں نے سوچا آپ سے بدلہ لوں بدلہ وہ نہیں جو آپ سوچ رہے ہیں بلکہ یہ کہ آپ جو مجھے ہر جگہ سے جاب سے نکلوا رہے تھے میں آپ ہی کے گھر میں جاب کر لوں اِسی لئے

میں اپنے دوسرے نام سے آپ کے گھر آئی۔ میں نے نام نہیں بدلا مجھے زیادہ تر لوگ نی شے ہی پکارتے ہیں۔ جاب کے ساتھ مجھے یہ بھی تجسس کھینچ لایا کہ ہو سکتا ہے کہ میں یہ راز معلوم کرنے میں کامیاب ہو جاؤں کہ آخر کیوں آپ نے مجھے اُٹھوایا اور اتنے دن قید رکھا..."

"ستوری اچھا ہے"۔ وہ اُس کی ٹھوڑی پر سے ہوتی گردن میں اُترتی خون کی لکیر کو بے حسی سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں اپنے دادا سے بہت مجبور ہے کہ تم کو اِس ملک میں برداشت کر رہا ہے مگر۔۔۔ ایک بات کان کھول کر سن لو۔ مجھ کو آئندہ آس پاس نظر مت آنا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

بارش تیز سے تیز تر ہو رہی تھی۔ گاڑی کے شیشوں کے اُس پار کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

چند لمحے دونوں طرف خاموشی طاری رہی۔

پھر۔۔۔ پتہ نہیں کیسے؟ نی شے نے ہمت اکٹھی کی۔۔۔ دروازے کا ہینڈل گھمایا اور جل تھل برستی بارش میں گاڑی سے اُتر گئی۔

اِس سنسان راستے میں، دھواں دھار بارش میں، یکہ وتنہا وہ کیا کرے گی؟ یہ زار کے سوچنے کا کام نہیں تھا۔ اُس نے گاڑی سٹارٹ کی اور۔۔۔

ایک بار پھر۔۔۔ تیزی سے آگے نکل گیا۔

لنچ پر وہ بمشکل دو نوالے لے سکا۔ دادا جان کے اصرار پر بھی نہیں بتایا کہ اِس وقت وہ نی شے کو مل کر آ رہا ہے۔ بیڈروم میں آ کر وہ بستر پر اوندھا پڑ رہا۔

اُس کا ذہن ماؤف سا تھا۔ کچھ بھی سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں تھا۔ کوئی بھی بات، کوئی بھی واقعہ۔۔۔ مگر۔۔۔

ایک بات تھی۔ دماغ سے دنوں بعد جیسے بوجھ سا اُتر گیا تھا، دل دنوں بعد جیسے ہلکا سا لگ رہا تھا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے باپ نے کوئی قتل کیا ہے۔۔۔" اُس کے کانوں میں نی شے کی آواز گونجی۔ کروٹ لیتے ہوئے وہ سامنے دیکھنے لگا۔ "میں کسی غلط مطلب

سے نہیں آئی تھی۔ نہ ہی مجھے اپنے پاپا کی کسی حرکت کا کچھ علم تھا۔۔۔۔'' وہ سیدھا لیٹ گیا، دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھتے ہوئے چھت کو گھورنے لگا۔ ''مجھے تو دادا جان کے اشتہار کا مضمون اٹریکٹ کر گیا تھا۔ مجھے وہ بہت کیوٹ سے بزرگ لگے مگر۔۔۔۔ نیچے اُن کا ایڈریس پڑھا تو میں پہچان گئی، پہاڑ پر چوکیدار مجھے آپ لوگوں کا اتہ پتہ بتا چکا تھا، تبھی میں نے سوچا آپ سے بدلہ لوں۔ بدلہ وہ نہیں جو آپ سوچ رہے ہیں بلکہ یہ کہ آپ جو مجھے ہر جگہ سے جاب سے نکلوا رہے تھے میں آپ ہی کے گھر میں جاب کر لوں۔۔۔ میں نے نام نہیں بدلا مجھے زیادہ تر لوگ نی شے ہی پکارتے ہیں۔ جاب کے ساتھ مجھے یہ بھی تجسس کھینچ لایا کہ ہوسکتا ہے میں یہ راز معلوم کرنے میں کامیاب ہو جاؤں کہ آخر کیوں آپ نے مجھے اُٹھوایا اور اتنے دن قید رکھا۔۔۔''

اُٹھ کر وہ کپڑے بدلنے ڈریسنگ روم گیا۔

''بدلہ وہ نہیں جو آپ سوچ رہے ہیں بلکہ یہ کہ آپ جو مجھے ہر جگہ سے جاب سے نکلوا رہے تھے میں آپ ہی کے گھر میں جاب کرلوں''۔ کف کے بٹن کھولتے کھولتے پھر اُس کی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی ''ہوسکتا ہے میں یہ راز معلوم کرنے میں کامیاب ہو جاؤں کہ آخر کیوں آپ نے مجھے اُٹھوایا اور اتنے دن قید رکھا۔۔۔''

''میں نے نام نہیں بدلا۔۔۔'' وہ کپڑے بدلنے لگا ''مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے باپ نے کوئی قتل کیا ہے۔۔۔ مجھے تو دادا جان کے اشتہار کا مضمون اٹریکٹ کر گیا تھا۔۔۔ بدلہ وہ نہیں جو آپ سوچ رہے ہیں۔۔۔ میں آپ ہی کے گھر میں جاب کرلوں۔۔۔ ہوسکتا ہے میں یہ راز معلوم کرنے میں کامیاب ہو جاؤں کہ آخر کیوں آپ نے مجھے اٹھوایا۔ قید رکھا''۔ وہ بالوں میں انگلیاں دے کر درست کرنے لگا۔

''میں آپ ہی کے گھر میں جاب کرلوں۔ ہوسکتا ہے میں یہ راز معلوم کرنے میں کامیاب ہو جاؤں کہ آخر کیوں آپ نے مجھے اٹھوایا اور اتنے دن قید رکھا۔۔۔

کئی دنوں کا گراں بار ذہن سے کم ہوا، دل قدرے پرسکون ہوا تو۔ گھنٹے دو قبل کی نی شے کو دیکھ کر وحشت اور دیوانہ پن بھی جیسے مدھم پڑنے لگے۔ حواس بھی جیسے کام کرنے لگے۔ ہوسکتا ہے وہ سچ کہتی ہو۔ ہوسکتا ہے اُسے واقعی اپنے باپ کی حرکت کا علم

نہ ہو۔ اگر ایسا ہی تھا تو واقعی اُسے تجسس یہاں تک لاسکتا تھا۔ اور پھر۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔

بہت نازک کمزور سی لڑکی تھی اگر اُسے اپنے باپ کے قاتل ہونے کا پتہ ہوتا تو وہ شاید بھولے سے بھی اِس گھر کا رخ نہ کرتی۔

پھر وہ چونکا۔۔۔۔ اُسے تو لڑائی جھگڑے ہتھیار اسلحے کے نام سے ہی گھبراہٹ ہوتی ہے۔

گاؤں میں وہ اُسے باتوں باتوں میں بتا چکا تھا کہ اگرچہ یہ مورچے رات کو کتوں کی پہریداری، مسلح گارڈز کی چوکیداری، خود زار کا تقریباً ہر وقت اپنے پاس لوڈڈ پستول رکھنا۔۔۔۔ اُن کے آبائی اطوار تھے مگر ساتھ ہی اُن لوگوں کے کچھ تنازعے بھی ایسے تھے جن کی وجہ سے یہ سب اور بھی سختی سے کرنا پڑتا ہے۔ اِس کے باوجود وہ۔۔۔۔ اُسے جھگڑالو اور اسلحے کا رسیا سمجھ کر خوفزدہ سی ہو جاتی تھی اُس سے اگر اُسے معلوم ہوتا کہ اُس کے باپ نے اُس کے باپ کو قتل کیا تھا تو کیا وہ خود چل کر آگ کے دہانے پر بھسم ہونے آ کھڑی ہوتی؟

بیچ کمرے میں کھڑا وہ سوچ رہا تھا۔

وہ تو بہت۔۔۔۔ امن پسند سی، دھیمے مزاج کی۔۔۔۔ نازک سی لڑکی تھی۔

''مجھ پر اور نزاکت کا جادو نہیں چلے گا''۔ معاً اُس کی اپنی آواز اُس کی سماعت سے ٹکرائی۔ نظریں غیر ارادی طور پر اپنے ہاتھ پر گئیں۔

اُس کے چہرے پر اُس کے بھاری ہاتھ کی انگلیوں کے نشان اُبھر آئے تھے۔

کھڑکی سے ٹکراتا اُس کا چہرہ خیال میں آیا۔ وہ بے دم سی نظر آنے لگی تھی۔ ساتھ ہی ہونٹوں کے پاس سے خون کی پھوٹتی لکیر۔

جانے کیوں وہ کچھ پشیمان سا نظر آنے لگا۔۔۔۔ جیسے زیادتی کی تھی اُس کے ساتھ۔

چند قدم چل کر۔۔۔۔ وہ دو سیڑھیاں چڑھا اور بالکونی کی لاؤنج پر آ بیٹھا۔

قتل تو اُس کے باپ نے اُس کے باپ کا کیا تھا۔ بدلے کی باری تو زار کی تھی۔ وہ کس بات کا بدلہ لینے آسکتی تھی؟

وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ذہن کے دریچے جیسے کھلنے لگے۔۔۔۔

غم وغصہ۔۔۔ قہر وغضب میں وہ تو چیزوں کو اُلجھاتا ہی چلا گیا تھا۔ ٹھنڈے دل سے اُس نے تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔

وہ کیوں بدلہ لیتی؟ کس بات کا بدلہ لیتی؟

''میں نے سوچا آپ سے بدلہ لوں۔ بدلہ وہ نہیں جو آپ سوچ رہے ہیں بلکہ یہ کہ آپ جو مجھے ہر جگہ سے جاب سے نکلوا رہے تھے۔ میں آپ ہی کے گھر میں جاب کرلوں۔۔۔''

جانے کہاں سے ایک مبہم سی مسکراہٹ اُس کے لبوں کو چھوگئی۔

بدلہ تو واقعی وہ لے چکی تھی۔ اُس نے واقعی اُسے ہر بار ہر جاب سے جواب دلوایا تھا۔ اُسے کسی بھی شہر میں ٹکنے نہیں دیا تھا یہاں تک کہ اُسے سو فیصد یقین ہوگیا تھا کہ وہ ملک چھوڑ کر چل پڑی ہے۔

اتنی نازک اتنی فریجائیل سی ہو کر اُس نے۔۔۔ زبردست بدلہ لیا تھا۔۔۔ اُس کے گھر میں آکر۔۔۔ اُس کے نزدیک پہنچ کر۔ اُس کے ذہن و دل پر چھا کر۔۔۔ جاب حاصل کر لی تھی۔

اُس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوسکی تھی۔ اُسے گمان تک نہیں ہوا تھا، شک تک نہیں پڑا تھا۔

وہ جیت گئی تھی۔۔۔ اور خود وہ۔۔۔ ہار گیا تھا۔

مگر۔۔۔ دنوں بعد پرکشش نقوش پر اُبھری طمانیت اچانک غائب ہوگئی۔ دلنشیں آنکھوں میں چھائی خوشگواری یکلخت ماند پڑ گئی۔ لبوں پر آئی مسکراہٹ یکدم معدوم ہو گئی۔ وہ نادم سا نظر آنے لگا۔

اپنے باپ کے قاتل کی بیٹی کے بارے میں نرم ہو کر سوچنا۔۔۔ اُس کے غیرت کے منافی تھا۔

اُٹھ کر وہ اپنے بیڈ پر گیا۔ لیٹا، آنکھیں موندیں۔

اور پتہ نہیں کیوں؟ دنوں بعد بے خبر ہو کر سو گیا۔

آنکھ کھلی تو شام کے پانچ بج چکے تھے۔ خاصی دیر تک سوتا رہا تھا وہ۔ جلدی سے

ٹھ کر وہ باتھ روم میں گھس گیا۔

''میں کسی غلط مطلب سے نہیں آئی تھی۔ نہ ہی مجھے اپنے پاپا کی کسی حرکت کا کچھ علم تھا۔ مجھے تو دادا جان کا اشتہار۔۔۔ کیوٹ سے بزرگ لگے۔ ایڈریس پڑھا۔۔۔ سوچا پ سے بدلہ لوں۔۔۔ آپ ہی کے گھر میں جاب کرلوں۔۔۔'' ٹھنڈے پانی کا شاور لیتے لیتے اُسے اُس کی یہ بات خاصی دلچسپ لگی۔

''مجھے یہ بھی تجسس کھینچ لایا کہ ہوسکتا ہے میں یہ راز معلوم کرنے میں کامیاب ہو اؤں کہ آخر کیوں آپ نے مجھے اُٹھوایا اور اتنے دن قید رکھا''۔ کسی بھی ذی شعور نسان کے ذہن میں یہ سوال ضرور اُٹھتا۔ مگر۔۔۔

جان جوکھوں میں ڈال کر راز معلوم کرنے اُس گھر تک پہنچ جانا کسی خاصے دلیر نسان کا ہی کام تھا!

پانی میں پرفیوم ملاتے ملاتے جانے کہاں سے ایک پل کو اِس وقت پھر ایک غیر سوس مسکراہٹ اُس کے لبوں پر آ بھٹکی۔

اتنی بے اندازہ نازک لڑکی اور اتنی بولڈ! شیشی واپس رکھنے لگا تو پتہ نہیں کیسے ہاتھ ے چھوٹ گئی، پول کے دہانے پر شیشے بکھر گئے۔ ایک شاید اُسے بھی لگا۔ ہاتھ سے خون ا لکیر پھوٹ نکلی اور۔۔۔

گاڑی کی کھڑکی سے لگی نئی شے کا بے دم سا چہرہ اور ہونٹ کے پاس سے پھوٹتی ون کی لکیر اُس کی نظروں میں گھومے۔۔۔ وہ ہاتھ دیکھ رہا تھا اسی سے تو اُس نے نئی شے وار کیا تھا۔ کیسے یکدم گال پر انگلیوں کے نشان اُبھر آئے تھے۔

سر جھٹکتے ہوئے اُس نے شاور لیا۔ جلدی جلدی تیار ہونے لگا کہ اُسے ٹینس کی دیر رہی تھی۔

''سر۔۔۔ بڑے صاحب فائل مانگ رہے ہیں''۔

وہ نکلتے ہی لگا تھا کہ اعجاز کی جگہ تعینات ہوا ملازم خاص آن دھمکا۔

''ٹھیک۔۔۔ آپ جائیے۔ میں لے کر آتا ہوں''۔

وہ اپنی رائیٹنگ ٹیبل کے پاس آیا۔ دراز کھولا۔ فائل نکالا تو ساتھ ہی اُس دن کے

نی شے کے سنبھال کر رکھے دو بال فائل میں اُلجھ کر باہر نکل آئے۔ وہ آہستہ آہستہ اکٹھا کرنے لگا۔

کچھ دن قبل وہ اُس سے کسی بات پر خفا ہوا تھا۔ اور وہ اُسی شام نم کھلے بال اُسے منانے اُس کے کمرے میں آئی تھی۔۔۔ واپس گئی تھی تو یہ بال اُسے اپنے گلے سے لپٹے ملے تھے۔ اُس نے احتیاط سے اُنہیں اِس دراز میں ڈال دیا تھا۔

پتہ نہیں کیوں وہ کچھ چپ چپ سا لگنے لگا۔ بال اکٹھے کر کے نیچے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیئے۔ فائل لی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

دادا جان کا سائیڈ عبور کرتے ہوئے وہ پچھلے لان میں آ گیا۔ خوشگوار شاموں کا لطف اُٹھانے دادا جان یہیں تو بیٹھا کرتے تھے۔ کرامت بابا بھی قریب بیٹھے تھے۔

زار نے فائل انہیں تھما دی۔

"او کے دادا جان۔ میں چلتا ہے۔ ٹینس کا دیر ہو رہا ہے"۔ سفید شارٹس، سفید ٹی شرٹ اور سفید جوگرز میں وہ بہت سمارٹ لگ رہا تھا۔ کسرتی جسم مردانہ وجاہت میں اضافہ کر رہا تھا۔

"جاؤ بچے۔ بہ امانِ خدا"۔

اور وہ چلدیا۔

"ہاں تو تم کہہ رہے تھے کہ نی شے آخر کیوں گئی؟" وہ فائل ایک طرف رکھتے ہوئے پھر کرامت بابا کی طرف متوجہ ہوئے۔ پھر کچھ سوچنے لگے۔ ایک گہری سانس لی۔ "تم سے اس گھر کی کوئی بات پوشیدہ نہیں کرامت۔ یہ بھی بتائے دیتے ہیں۔ بلکہ پہلے ہی دن بتا دیتے مگر۔ ہمت نہیں پڑ رہی تھی ہماری۔ اِن باتوں کو دہراتے ہوئے ہول اُٹھتے ہیں ذہن و دل میں ... اب تو کچھ خوف سا آنے لگا ہے ان باتوں سے ... مگر تمہیں بتائیں گے شاید دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو۔

نی شے دراصل ضیاء کے قاتل محمد انوار کی بیٹی ہے۔ ہمیں کچھ روز قبل پتہ چلا۔ غیر متوقع یہ جان کر ہمیں شدید صدمہ ہوا کیونکہ ہم اُس کو بہت چاہتے تھے۔ دل ہی دل میں اُسے زار کے لئے پسند کر چکے تھے اِس سے قبل ہمیں کوئی لڑکی اِس قدر مکمل نہیں لگی تھی۔

یعنی ایسی کہ ہر لحاظ سے ہمارے معیار پر پوری اُترے۔ ہمارا اب بھی ایمان ہے کہ وہ بہت نیک سیرت بچی ہے۔ یہ سب جان کر بھی ہمارا دل کہتا تھا وہ زار کے لئے بہترین ہے۔ ہم نے بہت ضبط کیا تھا، بہت سوچ بچار کی تھی۔ کہ باپ کے کئے میں اِس کا کیا قصور؟ زار کی بھی تو ساری زندگی کا سوال تھا۔ اچھی سے اچھی لڑکی ہم اُس کو دینا چاہتے تھے۔ شادی اور ازدواجی زندگی ہمارے نزدیک ایک بے حد اہم مسئلہ ہے۔ کل کو زار کے بچوں نے اُسی ماں کی گود میں تربیت لینی تھی، ہماری پوری نسلوں کا سوال ہے۔ اِسی لئے ہم نے دل پر بھاری پتھر رکھ کر درگزر کرنا چاہا۔ مگر...

وہ بچاری خود ہی سامنا نہ کر سکی چلدی۔ دوسرے زار بھی کسی صورت اُس کا نام تک سننا گوارا نہیں کرتا۔ ہم بھی فی الحال چپ ہیں کہ اُس کا اِس میں کوئی قصور نہیں... اُسے... اپنے... باپ سے... بہت... محبت ہے" چشمہ اُتار کر انہوں نے رومال سے اپنی آنکھیں خشک کر لیں۔

کرامت بابا کی عجیب سی حالت تھی۔ چہرے کا رنگ، آنکھوں کی اُلجھن ہونٹوں کی لرزش زبردست تذبذب کی نشاندہی کر رہے تھے۔

کچھ دیر خاموشی سے دادا جان کو تکتے رہے۔ پھر جیسے ہمت اکٹھی کرنے لگے۔۔۔ اور۔۔۔ فیصلہ کر ہی لیا۔

"صاحب۔۔۔ آج یہ بات بتانی ہی پڑے گی"۔ وہ گویا ہوئے۔ "پہلے تو سوچا تھا یہ راز اپنے ساتھ قبر میں لے کر جاؤں گا۔ مگر لگتا ہے اور ایسا کرنا ممکن نہیں۔ پہلے بھی اگر چپ تھا تو زار بیٹے کی جوانی کی خاطر، آپ کی خاطر، اِس گھر کے بھلے کی خاطر۔۔۔ مگر آج کہوں گا۔ ضرور کہوں گا"۔ اُن کی بھی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔

دادا جان پریشان سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

"کہو کرامت۔۔۔ ایسی کیا بات ہے، ایسا کیا راز ہے۔۔۔"

"اپنے ضیاء صاحب کو انوار صاحب نے نہیں عبدالرشید صاحب نے ختم کیا تھا۔"

"کیا کہہ رہے ہو کرامت"۔ دادا جان کا رنگ سفید پڑ گیا۔ وہ اس نئی خبر کے لئے لکل تیار نہیں تھے۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں سرکار۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں نے آپ کے یہاں سے جا کر عبدالرشید صاحب کے یہاں ملازمت کر لی تھی۔ ضیاء صاحب کے واقعے کو کئی سال گزر چکے تھے۔ ایک شام افضل صاحب عبدالرشید صاحب کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے تھے بیگم صاحبہ نے مجھے اُن لوگوں کو ٹھنڈا دینے کو کہا۔ میں ٹرے میں شربت لے کر گیا۔

''یہ ــــ ضیاء کے گھر نہیں ہوتا تھا؟'' افضل صاحب مجھے پہچان گئے۔

''ہاں ــــ وہی ہے کرامت''۔ عبدالرشید صاحب بولے۔

میں ٹرے رکھ کر واپس نکلا۔ دروازے کے قریب ہی کوریڈور میں گلدان میں لگے پھول باسی ہو رہے تھے، میں نکالنے لگا کہ میرے کانوں میں افضل صاحب کی آواز پڑی۔

''بھئی کس مہارت سے تم نے چھرا پکڑایا تھا انوار کو۔ اور لوگ تو کچھ بولے یا نہیں خود ضیاء کے بیٹے نے ہی گواہی دے دی کہ میرے باپ کو انوار نے مارا ہے۔ اور پھر انوار کتنا گھبرایا ہوا لگ رہا تھا جیسے سچ مچ قتل اُسی نے کیا ہو۔ جب سے ملک بدر ہے ــــ''

''آہستہ'' ــــ اور پھر خاموشی چھا گئی۔

مجھ پر جیسے دوسری بار قیامت ٹوٹی۔ بمشکل خود کو سنبھالتا چلا۔ تو دیکھا بیگم صاحبہ ڈرائنگ روم کے پاس کھڑی تھیں۔ اُن کا چہرہ بتا رہا تھا انہوں نے بھی بات سن لی تھی۔ میں باورچی خانے میں آ گیا مگر انہیں شاید شک ہو گیا تھا، پیچھے آ گئیں۔ واسطے دینے لگیں کہ کرامت اب تو بات کو گزرے بھی کئی سال ہو چکے ہیں۔ اس بات کا کہیں ذکر مت کرو۔ اس کا کوئی اچھا نتیجہ برآمد نہیں ہو گا۔ رضا صاحب یا زار کچھ کر بیٹھے تو دونوں گھروں کی تباہی ہو گی۔ ہم بھی برباد ہوں گے وہ لوگ بھی خراب ہوں گے۔ عبدا لرشید صاحب کی بیگم بہت نیک خاتون ہیں۔ آپ کو معلوم ہے عبدالرشید صاحب کتنے عیاش انسان تھے، بیگم کے یہاں اولاد نہ ہونے کا جیسے بہانہ ہاتھ آ گیا تھا۔ کون سی ذلالت تھی جو وہ نہ کرتے تھے۔ بس پھر میں وہاں سے یہاں آ گیا۔ اپنے بچے کے قاتل

کو اور نہ دیکھ سکتا تھا چلا آیا یہاں ــــ اور ــــ اپنے ہونٹ سی لئے۔ کہ زار بیٹے کی جوانی تھی میرے سامنے۔ آپ بہت تڑپے تھے سرکار میں حقیقت حال بتا کر آپ کو زار سے ہاتھ دھوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مجھے پتہ تھا اب ضیاء کے بعد زار ہی آپ کی کل کائنات تھا۔ میں اِسے نہیں اُجاڑ سکتا تھا۔ کسی بھی قیمت پر اِسے ہرا بھرا دیکھنا چاہتا تھا سرکار''۔ کرامت بابا کی آنکھوں میں آنسو رواں تھے۔ ''بس یہی میرا قصور ہے، یہی میری غلطی ہے''۔ انہوں نے اپنی دستار سے اپنی آنکھیں خشک کیں۔ ''آج اِس لئے بتا دیا کہ عبد الرشید صاحب اِس دنیا میں نہیں ہیں۔ اپنے کئے کی کاٹ چکے ہیں ــــ اور ــــ شاید میں آج بھی نہ بتاتا۔ مگر آج پھر دو زندگیوں کا سوال ہے۔ آپ نے بتایا تھا زار بیٹا اور نِشے دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ پھر آپ بھی اُسے بالکل اپنی اولاد کی طرح سمجھتے ہیں۔ اُس کی گھر میں موجودگی سے آپ بہت خوش نظر آتے تھے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ خوشیاں پھر سے لوٹ آئیں صاحب، زار بیٹے کو سمجھائیں۔ میری بات کا یقین نہ آئے تو عبدالرشید صاحب کی بیگم تو زندہ ہیں اُن سے اِس بات کی تصدیق کرا لیں۔ اب تو عبدالرشید صاحب کی زندگی کو خطرے کی بات کا بھی اندیشہ نہیں وہ سب بتا دیں گی وہ بہت نیک عورت ہیں ــــ''

اور ــــ دادا جان دریائے حیرت میں غوطہ زن تھے۔

''کب تک لوٹو گے بیٹا''۔ ہم نے پوچھا۔ ضیاء نے گھڑی پر نظر ڈالی، مسکرایا، بولا۔ ''ٹھیک دو گھنٹے بعد آپ کے پاس ہوں گا بابا''۔ دادا جان اُس دن اُسے بتا رہے تھے۔ مگر یہ نہیں کہا کہ دو گھنٹے گزر گئے لیکن اُن کے لختِ جگر کبھی واپس نہیں لوٹے کہ ایسا کہتے ہوئے جیسے اُن کا دم آنکھوں میں آتا تھا۔

''بلکہ ہم نے خود اُس کو کہا ہے کہ جس دن واپس آنا ہو بس آجایا کرو۔ کب پہنچے ہو کتنی دیر میں پہنچتے ہو یہ مت بتایا کرو۔ کہ وہ دو سیکنڈ آگے پیچھے ہوتا ہے تو ہمارا دم آنکھوں میں آجاتا ہے۔'' اپنے نورِ نظر کو کھو دینے کے بعد انہوں نے اُس کی واحد نشانی اپنے جانِ دادا کو کہا تھا۔ یہ انہوں نے پہلی ملاقات میں ہی نی شے کو بتایا تھا۔

''میں تو اُس کو مار ڈالے اگر تم کہے تو''۔ ایک بار کسی میٹنگ کے سلسلے میں جاتے

ہوئے وہ بھی اُس کے ساتھ تھی، ہوٹیل میں لنچ پر زار اُس کے منگیتر کے متعلق بولا تھا۔

''اُس کو مار ڈالنے کے بعد میں آپ کو کسی مصیبت میں پھنستے نہیں دیکھ سکتی''۔ نی شے نے کہا تھا۔

''ہونہہ۔ کوئی نہیں پھنستا مصیبت میں۔ بڑے بڑے قتل ہوئے ہیں''۔ اُس کی آنکھیں تاریک سی نظر آنے لگی تھیں۔

''ہاں وہ۔۔۔ دراصل۔۔۔ کل شام ...'' دادا جان رک گئے تھے۔ جیسے بتاتے ہوئے ہچکچا رہے تھے، جھجک رہے تھے۔ ''عبدالرشید ... ختم ہو گیا...'' انہوں نے تب بھی قتل کے بجائے ختم کہا تھا۔ جیسے قتل کہتے ہوئے خوف زدہ تھے کہ زار کو وہ واقعہ نہ یاد آجائے۔

''کیا؟''

''کسی نے۔۔۔ قتل۔۔۔ کر دیا''۔ اُس کے استفسار پر انہیں بتانا پڑا تھا مگر۔۔۔ وہ سامنے دیکھ رہے تھے جیسے زار کا سامنا نہ کر پا رہے تھے اچانک بہت اُداس بہت دکھی لگنے لگے تھے۔

''قتل؟'' زار بے اختیار اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پرکشش چہرہ تاریک نظر آنے لگا تھا۔ دلنشیں آنکھیں درد و کرب میں ڈوب گئی تھیں۔ دونوں مٹھیاں اضطراری حالت میں بھنچ گئی تھیں۔

تب وہ یہی سمجھی تھی کہ اپنے والد کے بزنس پارٹنر کے ختم ہونے کا ہی ردعمل ہے۔

''Calm بیٹا''۔ دادا جان نے اُس کی پیٹھ سہلائی تھی۔

پھر۔ دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے تھے۔ زار بار بار ہاتھ مل رہا تھا، بے قرار لگ رہا تھا، بے کل ہو رہا تھا۔

''ٹیک اِٹ ایزی''۔ دادا جان نے پھر کہا تھا۔

''آفرین ہے تم پر۔ کس مکاری سے اپنے جگری دوست کو مارا ہے۔'' دادا جان بتا رہے تھے زار کہتا تھا رشید انکل بابا جان کے دوست سے کہہ رہے تھے۔

نی شے نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔

''دوستی پر یقین رکھتا ہے تم؟ جگری دوستی پر؟'' گاؤں میں زار نے اُسے یہی تو کہا تھا۔

''اوہ — ایک منٹ''۔ گاؤں میں اسلحے کے کمرے کو لگا مضبوط تالا دیکھ کر وہ بولا تھا۔''میں کرامت بابا سے چابی لے آئے — اب کرامت بابا پھر بہانہ نہ بنا دے۔ پتہ نہیں کیوں دادا جان اور کرامت بابا کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے...''

''ہماری کوشش ہوتی ہے کہ اُس کے باپ کی وہ مخصوص رائفل اُس کی نظروں سے دور رہے...'' دادا جان کی بات اُس کے کانوں میں گونجی۔

''مگر — کس کام کا؟'' زار نے اپنے باپ کی رائفل کو واپس بکس میں اچھالتے ہوئے کہا تھا۔

''اُسے دیکھ کر اُسی رائفل سے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ نہ لے سکنے کا احساس اُسے گھیر لیتا ہے۔ مایوسی اُس وقت شدت اختیار کر لیتی ہے، اُداسی حد سے تجاوز کر جاتی ہے...''

وہ بے کل سی چھت کو گھور رہی تھی۔

''کیا تمہارا شاعر نے چاقو سے کسی کو مرتے دیکھا ہے؟ کبھی اُس نے لکھا کہ سات آٹھ سال کے بچے پر کیا گزرا ہوگا جب اُس کا آنکھوں کے سامنے اُس کا باپ کو چھرا مار دیا گیا ہوگا؟''

''دوستی پر یقین رکھتا ہے تم؟ جگری دوستی پر؟''

''سات آٹھ سال کے بچے پر کیا گزرا ہوگا جب اس کا آنکھوں کا سامنے اس کا باپ کو چھرا مار دیا گیا ہوگا؟''

''دوستی پر یقین رکھتا ہے تم؟ جگری دوستی پر؟''

سات آٹھ سالہ زار — باپ کو چھرا — جگری دوست!

''پاپا۔ یہ کیا کیا ہے آپ نے؟''

اُسے زندگی میں پہلی بار اپنے پاپا سے نفرت سی محسوس ہوئی اتنی مکروہ حرکت کی تھی انہوں نے۔ اتنا بھیانک ظلم ڈھایا تھا۔

ایک باپ کی کمر توڑ دی تھی اور ایک بیٹے کو جیتے جی اس کی خوشیوں سے محروم کر دیا تھا۔ اور — خود — اپنی بیٹی کو — اُس کی سانسوں سے الگ کر رہے تھے۔

''تزار''۔ تکیوں میں منہ دے کر وہ بلک بلک کر رو دی۔

کہ کل وہ واپس افریقہ جا رہی تھی اور — باوجود کوششوں کے وہ اُسے ایک پل بھی ذہن سے جھٹک نہیں پا رہی تھی۔

کل زار نے اُسے چانٹے مارے تھے، اُس کا چہرہ گاڑی کی کھڑکی سے ٹکرایا تھا۔ خون کی لکیر بہہ نکلی تھی مگر — یہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔

جو نقصان اُس کے پاپا نے زار کو پہنچایا تھا۔ جو تلخیاں، تشنگیاں، ویرانیاں، اُس کی زندگی میں بھر دی تھیں، اُس کے سامنے دو چانٹے، خون کی بہتی ایک لکیر، کیا وقعت تھی ان کی۔

اِسی لئے تو وہ چپ چاپ سہہ آئی تھی۔

روتے روتے اُس کی ہچکی بندھ گئی۔ کروٹ لے کر سیدھا ہونا چاہی۔ مگر — اُس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا، انگ انگ بخار میں پھنک رہا تھا۔ کہ کل جو کافی دیر تک بارش میں بھیگتی رہی تھی، اُداس بھی تھی، دکھی بھی۔ آنکھوں تک میں اُداسیاں بسیرا کئے تھیں، سانسوں تک میں دکھ اُتر آئے تھے۔

وہ یوں ہی پڑی رہی۔ پھر شاید غنودگی نے آ لیا تھا۔

''نی شے''۔

مانوس سی آواز تھی، مانوس سے انداز میں ہی کوئی اُس کے بالوں میں انگلیاں دیئے سہلا رہا تھا۔

کوشش کر کے وہ سیدھی ہوئی۔

زار تھا، اُس کے قریب مسہری کی پٹی پر بیٹھا تھا۔ آگ بگولہ نہیں تھا، آنکھوں میں چنگاریاں نہیں تھیں، انداز میں شعلوں کی لپک نہیں تھی۔

پشیمان سا تھا۔ آنکھوں میں اپنائیت تھی، انداز میں نرمی و ملائمت تھی۔

اور — جو اُسے مہربان پایا تو — نی شے کی چیخیں نکل گئیں۔

اور ضبط کا یارا نہ رہا تھا، اور برداشت نہ کر پائی تھی، اور سعہ نہ پائی تھی۔

''پلیز نی شے''۔ وہ اُسے چپ کرانے لگا۔ ''مجھ کو معاف کر دو پلیز''۔

مگر وہ روئے چلی گئی۔

زار نے دیکھا۔ اُس کے نازک چہرے پر اُس کی انگلیوں کے نشان نیلے پڑ گئے تھے۔ ہونٹوں کے پاس کے زخم پر خون منجمد ہو گیا تھا۔

وہ کٹ کر رہ گیا۔ کیا کیا تھا اُس نے؟ وہ اپنے آپ کو ظالم گرداننے لگا، سفاک، وحشی!

''بس کرو نی شے پلیز''۔ پچھتاوا اُسے کچوکے لگا رہا تھا۔

مگر آج تو جیسے سارے بندھ ٹوٹ گئے تھے۔ وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔

وہ پریشان سا پشیمان سا، متاسف سا۔ اُسے دیکھے جا رہا تھا۔

اس قدر شدت سے رو رہی تھی وہ تو کہ اُس سے کچھ بن ہی نہ پڑ رہا تھا۔

''نی شے دیکھو میں ہاتھ جوڑتا ہوں پلیز معاف کر دو''۔ اُس نے سچ مچ دونوں ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

''آپ ۔۔۔ چلے جائیں پلیز''۔ وہ روتے روتے بولی۔

''میں تو تم کو لینے آیا ہوں''۔ وہ نادم سا بولا۔

''خدا کے لئے آپ مجھے چھوڑ دیں''۔ نی شے کو اُس کی یہ بات بہت انہونی سی لگی، بیکار سی بھی، بے معنی سی بھی۔

''میں تم کو نہیں چھوڑ سکتا ۔۔۔''

''میں نہیں سننا چاہتی یہ سب''۔ کہ یہ سب باتیں وہ ذہن سے نکال چکی تھی۔

''میں تم کو ایک سیکنڈ نہیں بھولا۔ ہر مومنٹ تم یاد آیا ہے ۔۔۔ تم سے ملنے کا کوشش نہیں کیا، وہ میرا بس میں نہیں تھا''۔ اُس نے انگلیوں سے اُس کے آنسو پونچھے۔

''اب بھی مت ملتے کیا ضرورت تھی''۔

''اب کوئی ایسا بات ہی نہیں ہے کہ میں تم کو نہ ملے''۔

اور پھر باوجود اُس کے رونے کے، باوجود اُس کے منع کرنے کے باوجود اُس کے

احتجاج کے۔ اُس نے اُسے ساری حقیقت بتا دی۔

''اور اب ہمارا آپس میں کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تمہارا پاپا اور میرا بابا جان بہت کلوز فرینڈز تھے اور ۔۔۔ تم ۔۔۔ میری زندگی ہو''۔

نی شے تو پہلے ہکا بکا سب سنتی رہی۔ پھر جانے کیا ہوا اُسے۔ ایک بار پھر زور زور سے رونے لگی۔

''آپ نے مجھے مارا ہے''۔ وہ اور بھی زور سے رونے لگی ۔۔۔ ''بہت مارا ہے''۔

وہ اُسے بالکل بچی سی لگی، معصوم سی، چھوٹی سی۔

''پھر نہیں ماروں گا''۔

''ڈانٹتے رہتے ہیں۔ کل بھی بہت ڈانٹا تھا۔ غصے کرتے ہیں، زور زور سے بولتے ہیں''۔ وہ روتے ہوئے بولی۔

زار کو ہنسی آ گئی۔ کیا نقشہ کھینچا تھا اُس کا۔

''پھر نہیں ڈانٹے گا، غصے نہیں کرے گا، زور زور سے بھی نہیں بولے گا''۔ اُس نے اُس کے آنسو اپنے رومال میں جذب کر لئے۔

''ہر دفعہ یہی کہتے ہیں۔ پھر غصے ہوتے ہیں''۔ وہ ہچکی لیتے ہوئے بولی۔

''یہ آخری بار ہے۔ پھر ایسا نہیں ہوگا''۔ اُس کی نظریں اُس کے چہرے پر اپنے دیئے ہوئے نیلوں پر زخم پر جمی تھیں۔ ''معاف کر دو پلیز''۔ وہ متاسف سا بولا۔

''یہاں تھپڑ مارا ہے مجھے آپ نے۔'' اُس کی نظریں اپنے چہرے پر لگی دیکھ کر اُس نے اپنے گال کو ہاتھ لگا لیا۔ ''یہاں سے خون نکلا تھا''۔ وہ ہونٹ کے پاس کے زخم کو محسوس کرتے ہوئے بولی۔

زار نے باری باری دونوں جگہوں پر پیار کیا۔

''اب تو معاف کر دو نا''۔ اُس کے لہجے میں التجا تھی۔

''کیا فائدہ ۔۔۔ میں تو جا رہی ہوں''۔ وہ بڑے آرام سے بولی۔

''کہاں؟'' وہ زور سے چونکا۔

''واپس''۔ نی شے ہچکی لیتے ہوئے بولی۔

"نہیں۔۔۔ تم واپس نہیں جائے گا"۔

"میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ ٹکٹ خرید لیا ہے کل جا رہی ہوں"۔

"فیصلہ بدلا جاسکتا ہے۔ ٹکٹ کینسل ہو سکتا ہے۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ اب میں نہیں رکوں گی"۔

"میرا خاطر بھی نہیں"۔

"اوں ہوں"۔ سرنفی میں ہلاتے ہوئے اُس نے اپنے نم گال پونچھے۔

"میرا لئے نہ سہی دادا جان کا خاطر سہی"۔

"میں خفا ہوں۔۔۔ سب سے خفا ہوں"۔ آنسو پھر اُبل پڑے۔

"دادا جان سے بھی"۔

"پتہ نہیں۔۔۔ لیکن میں خفا ہوں بس"۔ آنسو لڑیوں میں بہہ نکلے تھے۔

"یہاں میرا کوئی نہیں۔ میں نے بہت دکھ اُٹھائے ہیں یہاں۔ بہت تکلیفیں دیکھی ہیں۔ میں واپس جاؤں گی۔ وہ جگہ وہ ماحول بہت اچھے ہیں۔۔۔ وہاں میں نے بہت خوبصورت دیکھے ہیں۔ سکھ کے خوشی کے۔۔۔ وہاں میری ممی تھیں۔۔۔ میری ممی اور پاپا کا گھر تھا۔۔۔" اور آنکھوں پر بازو رکھ کر وہ بے اختیار رو دی۔

"ماں باپ بہت اچھے ہوتے ہیں۔ ہر دکھ سکھ بانٹنے والے، ہمدرد، غمگسار"۔

زار سمجھ رہا تھا اُس کے محسوسات۔ واقعی اُس نے اِس ملک میں آکر ایک پل بھی سکھ کا نہیں دیکھا تھا۔ پے درپے حادثات وصدمات سے ہی گزری تھی۔ گرچہ ماں باپ حیات نہ تھے۔۔۔ پھر بھی اُس گھر سے اُس ماحول سے اُسے اِس قدر انسیت تھی کہ جیسے اب بھی وہ وہاں موجود تھے۔۔۔ اُس کے منتظر تھے۔۔۔

زار کو اُس پر ترس سا آنے لگا۔ اُس کا دل چاہا اُسے کہے۔۔۔ دادا جان کو اپنے ماں باپ جیسا سمجھو۔ ہم لوگ تمہیں بہت قدر، بہت عزت، بہت پیار دیں گے لوٹ چلو میرے ساتھ مگر۔۔۔ پتہ نہیں کیوں وہ نہ کہہ سکا۔ کہ۔۔۔

اُس گھر سے اُسے کوئی خاص خوشگوار لمحے میسر نہ آسکے تھے۔۔۔ اُس گھر کے مکین نے اُسے اس ملک میں قدم رکھتے ہی دکھ دیئے تھے رونا ہی رونا دیا تھا۔

وہ حق بجانب تو تھی یہ سب کہتے ہوئے۔ اُسے واقعی اپنا گھر وہ ماحول تو یاد آتا ہو گا۔ لیکن۔۔۔

وہ اُداسی سے مسکرایا۔ وہ بھی تو اُس کے بغیر ادھورا ادھورا سا تھا۔ پچھلے کئی دن۔۔۔ بہت کوشش کی تھی اُسے بھول جانے کی، اُس کے لئے دل میں نفرت پیدا کرنے کی مگر کامیاب نہ ہوسکا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اپنے باپ کے قاتل کی بیٹی ہونے کی وجہ وہ اُس کا نام تک سننا نہ چاہتا تھا۔ اُس کا پیار اپنی جگہ تھا خودداری اور غیرت اپنی جگہ۔۔۔ دونوں کو وہ یکجا نہ کرسکتا تھا۔ تب اُس نے واقعی فیصلہ کرلیا تھا اُس کی راہ الگ اور نی شے کی راہ الگ تھی!

مگر اب۔۔۔ حالات رخ بدل چکے تھے۔ وہ پھر اپنی محبت کا حق مانگنے آیا تھا۔

"چلو نی شے بہت ہو گیا اب گھر چلیں"۔ اُس نے اُس کے بال سنوارے آنسو پونچھے۔

وہ کوشش کر کے اُٹھ بیٹھی۔

"میں نہیں جاسکتی پلیز زار"۔

"ایسا نہ کہو نی شے چلو پلیز"۔ اُس نے اُس کی کلائی تھام لی۔ اور پھر وہ چونکا وہ تو بخار میں پھنک رہی تھی۔

"تم کو تو ٹمپریچر ہے"۔

"ہاں۔۔۔ کل بارش میں بھیگ گئی تھی۔ پھر آپ نے مارا بھی تھا"۔

وہ اُسے دیکھ رہی تھی۔

"اوہ"۔ ایک بار پھر پشیمانی لوٹ آئی۔ "کوئی دوائی لیا ہے؟"

"نہیں"۔

"کسی ڈاکٹر کو دکھایا ہے؟" وہ پریشان سا کہہ رہا تھا۔

"میں یہ نیل ڈاکٹر کو دکھاتی؟"

"اوہ"۔ وہ جلدی سے اُٹھا۔ "میں تم کے لئے دوائی لے کر آتا ہوں"۔ ڈاکٹر کا کں نے بھی نہیں کہا کہ وہ نیل وہ اُسے کیسے دکھاتا؟

تھوڑی ہی دیر میں بمعہ دوائیوں کے وہ نی شے کے پاس ہوٹیل کے کمرے میں تھا۔۔۔ چائے بھی آ گئی تھی، سینڈوچز بھی۔

زار نے اُس کے سر کو اپنے بازو کا سہارا دیا، اُس کے تکیے مسہری کی پشت سے ٹکائے، اُسے اُوپر کھینچتے ہوئے تکیوں سے اُس کی پشت ٹکائی، پاس بیٹھا۔۔۔ گولیاں تھمائیں اور چائے کی پیالی اُس کے ہونٹوں سے لگائی۔

''میں پی لوں گی آپ اپنی چائے پئیں پلیز''۔ نی شے نے ممنونیت سے کہا۔۔۔

وہاں سے اُٹھ کر وہ اُس کے مقابل کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہیں درمیان میں میز پر چائے لگی تھی۔ پیالی میں ڈال کر وہ گھونٹ گھونٹ کر کے پینے لگا۔

''نی شے تم ابھی چل رہی ہو میرا ساتھ میرا گھر''۔ وہ پھر بولا۔

''زار پلیز اب میں اِرادہ نہیں بدل سکتی''۔

''خفا ہو ہم لوگوں سے''۔

''نہیں''۔

''پھر؟''

''بس میرا دل چاہتا ہے جانے کو۔۔۔ سب یاد آ رہا ہے مجھے''۔

زار خاموش ہو گیا۔۔۔ وہ ہوم سِک محسوس کر رہی تھی، کسی بھی قیمت پر جانا چاہتی تھی۔

''ہم یاد نہیں آئیں گے۔۔۔ دادا جان، میں۔۔۔''۔ وہ اُداس سا مسکرایا۔

دیکھتے دیکھتے نی شے کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''دادا جان بہت یاد آئیں گے۔۔۔''

''اور میں؟''

وہ صرف مسکرا دی۔۔۔ اُداس سی، دکھی سی۔

''یاد ہے ایک بار تم نے کہا تھا۔۔۔ میں ہمیشہ کے لئے چلی جاؤں گی''۔ اُس نے اُن کے گاؤں کے قیام کی آپس میں کسی تکرار پر اُس کی کہی بات دہرائی۔

''اور۔۔۔ آپ نے کہا تھا۔ میں مر جاؤں گا''۔

وہ افسردگی سے مسکرا دیا، اُداسی سے۔

وہ دیر تک اُس کے پاس رہا۔ اُس کے چہرے کے نیلوں پر مرہم لگاتا رہا، اُس کا ٹمپریچر نوٹ کرتا رہا، اُسے روکنے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہا۔ مگر۔۔۔

وہ مصر تھی۔۔۔ کہ اتنے سارے حادثے اور دکھ سہنے کے بعد اب اُسے اپنا گھر شدت سے یاد آ رہا تھا۔

یہاں اُسے وحشت ہو رہی تھی۔ گھٹن ہو رہی تھی، اُداسی ہو رہی تھی۔ اپنا ماحول اپنا آس پاس، اپنا گھر۔۔۔ جہاں کبھی اُس کے پاپا ہوتے تھے، پھر ممی ہوتی تھی، وہ ہوتی تھی۔۔۔ یادوں نے مل کر اچانک ہلہ بول دیا تھا۔ وہ نہیں رک سکتی تھی۔

''کل۔۔۔ کتنے بجے فلائٹ ہے؟'' مجبوراً اُسے لوٹنا پڑ رہا تھا۔

رات ہو چکی تھی اور نی شے کو مزید سمجھانا بےکار جا رہا تھا۔

''صبح سات بجے''۔

زار نے گہری سانس لی۔ اُس کی طرف دیکھا۔

''اوکے۔۔۔ کل تم کو ائیر پورٹ چھوڑنے آئے گا پھر''۔

اور وہ۔۔۔ چل دیا۔

اگلے دن مقررہ وقت پر اُس نے نی شے کو ائیر پورٹ پر خدا حافظ کہا۔ اور بوجھل سے قدم اُٹھاتا اپنی گاڑی میں آ بیٹھا۔

''خط لکھے گا مجھ کو؟'' ابھی ابھی اُس نے پوچھا تھا۔

''نہیں''۔ اُس نے سر نفی میں ہلایا۔ اُس پار خلاؤں میں دیکھ رہی تھی جیسے ڈر ہو ریں ملیں تو کمزور نہ پڑ جائے۔

''میں لکھوں؟''

ایک بار پھر اُس نے انکار میں سر ہلایا۔

اُس نے گہری اُداس سانس لی۔

''فون۔۔۔ کرو گے؟''

''نہیں''۔ اُس نے اب بھی سر نفی میں ہلایا۔

''اچھا میں کروں گا''۔

''نہیں''۔ جیسے تڑپ کر بولی۔ پہلی بار اُس کی طرف دیکھا۔

اُس کی آنکھیں نم تھیں، چہرہ اُداس، آواز رندھی ہوئی۔

اُس نے گہری سانس لی اور ـــ گاڑی چلا دی۔

دن آہستہ آہستہ گزرنے لگے۔ ہفتے مہینوں میں ڈھلنے لگے۔

وہ اپنا مکان خالی کروا کے اُس میں رہنے لگی تھی ـــ بڑا روئی تھی ممی کو یاد کر کے تب پہلی پہلی بار گھر کے اندر داخل ہوئی تھی۔

بہت تنہا لگ رہا تھا اپنا آپ، بہت اکیلا۔ پھر ـــ دھیرے دھیرے جیسے سمجھوتہ کر لیا صبر آ گیا تھا۔

ویسے ـــ ایک بات تھی۔ اُسے ماننا پڑ رہا تھا۔ اپنے گھر آ کر اُسے بہت سکون کا احساس ہوا تھا، بہت طمانیت کا، بہت اطمینان کا۔

جو کچھ بھی تھا اُس کا اور صرف اُس کا تھا ـــ وہ کسی کی مرہونِ منت نہیں تھی، کسی کی احسان مند نہیں تھی، کسی کی پابند نہیں تھی۔

اُسے ہر پل کچھ جان لینے کا تردد نہیں تھا، ہر لمحہ پہچانے جانے کا دھڑکا نہیں تھا، ہر آن پہچانے جانے پر کسی شدید ردِعمل کا خوف نہیں تھا۔

یہاں تک کہ ___ اُسے اپنے ممی پاپا کے یہاں مستقل سکونت اختیار کرنے کا جواز بھی مل گیا تھا۔ سب سے بڑھ کر ___ بعد میں یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ یہ محض اُس کے پاپا پر الزام تھا۔ بہت اونچے پیڈسٹل پر بٹھائے اپنے پاپا کو وہ تو اب پوجنے لگی تھی ___ اور ___

یہ گھر، یہاں کی ہر چیز اُس کے پاپا ہی کی تو تھی ___ وہ بہت مطمئن تھی اپنے چھوٹے سے پریوں کے دیس جیسے سجے خوبصورت گھر میں۔

اُس نے ایک بہت اچھی جگہ جاب بھی کر لی تھی۔ صبح سے شام چار بجے تک معروف رہتی تھی۔ واپس آ کر اپنے لئے کوفی بناتی اور اپنے خوبصورت آرام دہ بیڈ روم کی چوڑی کھڑکی کے ساتھ رکھے نرم وگداز صوفے پر بیٹھ کر سامنے گہری سبز ہریالیوں کو تکتی گھونٹ گھونٹ کر کے پیتی ___ پھر ___

ہریالیوں سے بھٹک کر اُس کی نظریں کوفی سے اُٹھتے بھاپ کے مرغولوں کے اُس پار گھورنے لگتیں اور ___

وہیں اُسے زار ملتا۔

اُس کی دلنشیں باتیں، اُس کا دھیما لہجہ، اٹکتے سنبھلتے بمشکل ادا کرتے اُردو کے جملے، مبہم مسکراہٹیں، مدھر ہنسی اور سب سے بڑھ کر ___ اُس کی گرے بلو آنکھوں کا اُس کے چہرے کا مخصوص انداز میں طواف اور ساتھ ہی ہاتھ سے اُس کے بال ماتھے پر سے ہٹا کر سنوارتے رہنے کا انداز!

تب اُس کی سانسوں تک میں دکھ در آتے ___ آنکھوں میں اُداسیاں بس جاتیں۔ کبھی سوچتی۔ وہ اُسے منانے آیا تھا تو چلی کیوں نہیں گئی اُس کے ساتھ، مگر ___

اگلے ہی لمحے سوچتی ___ وہ اُس کے لئے نہیں تھا، وہ دونوں ایک دوسرے کا مقدر نہیں تھے۔ اتنی ساری الجھنوں کے بعد ___ وہ کیا اُس گھر میں رہتی؟

پھر نم آنکھیں لئے وہ تلخی سے مسکرا دیتی ___ اُس کی یادیں ہی اُس کے لئے کافی

تھیں۔

''اگر ___ تم مجھ کو چھوڑ کر چلا گیا تو؟... میں تو ضرور مر جائے گا اگر تم نے ایسا کیا تو۔'' زار نے ایک بار کہا تھا۔

''زار ___ کہیں آپ نے مجھے چھوڑ دیا تو؟ میں مر جاؤں گی زار ایسا ہوا تو''۔ اُس نے بھی تو کہا تھا۔

ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ دو محبت کرنے والے ایسے ہی کہتے ہوں گے مگر ___ ضروری تو نہیں کہ اُنکا ملاپ بھی ہو۔

دل تو بہت کچھ چاہتا ہوگا ___ مگر ___ دماغ سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔

زار کے لئے شاید وہی لڑکیاں ٹھیک تھیں، شازیہ ہی ٹھیک تھی۔ ہم پلہ، برابری کی ___ کہ نہ وہ اُس پر کسی بدلے کا الزام دھر سکتا تھا، نہ اُس کے باپ کو قاتل ہونے کا دوش دے سکتا تھا۔ وہی اُس کا صحیح جوڑ تھی۔ ٹھیک ہی کیا تھا اُس نے اُس کے ساتھ واپس نہ جا کر ___ اچھا کیا تھا واپس آ گئی تھی یہاں۔

دو موتی لڑھک کر آنکھوں سے گالوں پر آئے تو وہ چونکی ___ کوفی سے بھاپ کے اُٹھتے مرغولے غائب ہو چکے تھے، کوفی ٹھنڈی ہو چکی تھی، باہر زور کی بارش ہونے لگی تھی اور ___ وقت سے پہلے اندھیرا گھر آیا تھا۔

افسردہ سی سانس سے لے کر وہ اُٹھی۔ کچن میں گئی اور ایک گرم کپ کوفی کا بنانے لگی۔ کھڑکی میں سے دیکھا ___

سیاہ گھٹائیں اب بھی بوجھل تھیں، بجلی اب بھی تڑپ رہی تھی، آسمان اب بھی گرج رہا تھا، ہوا کے تیز جھکڑ اب بھی چل رہے تھے، جل تھل بارش اب بھی ہو رہی تھی۔

معاً ڈور کی گھنٹی ہوئی اور وہ اچھل کر رہ گئی۔

کون ہو سکتا تھا اِس طوفانی شام میں!

آگ بند کر کے وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھی ___ کھولا ___ اتنے زور سے وہ گھنٹی کی آواز پر بھی نہیں چونکی تھی جتنی اِس وقت حیران ہوئی تھی۔

زار تھا! بارش میں کھڑا بھیگ رہا تھا۔

وہ اُسے اندر لے آئی، اپنے کمرے میں۔

"آپ بیٹھیں ـــ میں آپ کے لئے کوفی لے کر آتی ہوں"۔ اُسے اُس نے وہیں کھڑکی کے پاس اپنی مخصوص جگہ پر بٹھایا ـــ کہ ـــ

وہ کہاں سے آ رہا تھا؟ کس سلسلے میں آیا تھا؟ کیسے اُس کے گھر تک پہنچا تھا؟ یہ تو بعد میں بھی ہو سکتا تھا۔ اِس وقت وہ بھیگا ہوا تھا۔ اور شاید تھکا ہوا بھی۔

"ہاں ـــ پلیز"۔ وہی مخصوص لب و لہجہ، وہی اپنائیت بھری آنکھیں وہی محبت بھرا انداز!

وہ کچن میں چلی آئی ـــ اتنی حیران تھی کہ کچھ سوچنے سمجھنے کی قوت ہی نہ رہی تھی جیسے۔

کوفی کے ساتھ وہ چوکلیٹ اور بسکٹ بھی لے آئی۔ ٹرے اُس کے آگے میز پر رکھتے ہوئے وہ نیچی سے سیٹی پر اُس کے مقابل بیٹھ گئی۔

"لیجئے"۔ اُس نے کوفی کا کپ اُس کے سامنے رکھا۔

"تھینک یو"۔ وہ چوکلیٹ کا کاغذ اُتارنے لگا۔

"دادا جان کیسے تھے"۔ اپنا کپ اُٹھاتے ہوئے وہ دھیرے سے بولی۔

"فرسٹ کلاس ـــ تم کو بہت یاد کرتا تھا"۔

عرصہ بعد ـــ وہی لب و لہجہ، پختون زدہ اُردو۔ کان ترس گئے تھے جیسے سننے کو۔

"تم کیسا رہا؟" چوکلیٹ کھاتے ہوئے وہ اُسے دیکھ رہا تھا۔

"ٹھیک"۔

وہ مسکرا دیا۔ ٹھیک تو وہ تھی مگر اُداسی جیسے اپنا چھاپ لگا گئی تھی اُس کے خوبصورت چہرے پر۔

"آپ ـــ کہاں سے آ رہے ہیں؟"

"آف کورس پاکستان سے"۔

"یہاں کوئی کام تھا؟"

"آں ـــ ہاں ـــ" اُس نے کپ اُٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

پتہ نہیں کیوں؟ وہ کھلا سی گئی۔ جانے کیا سننا چاہتی تھی وہ؟

"میرا گھر کیسے ملا؟" اُس نے اگلا سوال کیا۔

"میرا اُسی دوست نے بتایا جس نے پچھلے سال وہاں مجھ کو تمہارا پاکستان آنے کا بارے میں بتایا تھا۔"

"اوہ ـــ کیا وہ یہیں کہیں رہتا ہے؟"

"ہاں۔" وہ مسکرایا۔ "تمہارا بارے میں وہ سب کچھ جانتا ہے"۔

"کسی کی پرائیویٹ لائف میں اِس طرح جھانکنا کوئی خاص اچھی بات نہیں۔"

"پرائیویٹ ـــ لائف ـــ تمہارا ہاں"۔ وہ مزید مسکرا دیا ـــ "ویسے میرا لائف کا پرائیوسی جلد ہی ختم ہونے والا ہے۔ میرا شادی ہو رہا ہے"۔

جانے کیوں نی شے کو اپنا سفید پڑتا رنگ خود بھی محسوس ہوا۔ چپ سی رہ گئی، کچھ بول ہی نہ سکی۔

"گاؤں میں زور و شور سے تیاریاں ہو رہا ہے۔ دادا جان کہتا ہے یہ اُن کا زندگی کا سب سے بڑا ارمان ہے ـــ"

وہ اب بھی چپ تھی۔ کوفی ختم کر کے اُس نے کپ میز پر رکھ دیا۔ پھر اُٹھی ـــ کہ رات ہونے والی تھی اور اُس کے لئے کھانے کا بھی کچھ بندوبست کرنا تھا۔

"کہاں جا رہا ہے"۔ اُس نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

دنوں بعد اُس کے ہاتھ کا لمس اُسے بے کل سا کر گیا۔ پھر اگلے ہی لمحے وہ سنبھلی، ہاتھ چھڑا لیا۔ کہ وہ بڑی مشکل سے اپنے من کو سمجھا پائی تھی، پھر سے بہکنا نہیں چاہتی تھی۔

"آپ کے لئے کھانا بنانے"۔ رخ دوسری طرف کرتے ہوئے وہ آہستہ سے بولی۔

اور ـــ ایک بار پھر ـــ اُسے ہاتھ سے پکڑ کر اُس نے آہستہ سے اپنے پاس صوفے کے بازو پر بٹھا لیا۔

"نی شے بے کار میں بات کو لمبا مت کرو۔" اُسی مخصوص انداز میں اُس کی نظریں

اُس کے چہرے پر منڈلانے لگیں۔ ''کیوں اپنے آپ کو بھی سزا دے رہا ہے۔ مجھ کو بھی پریشان کیا ہوا ہے۔ میں چاہتا تو تم کو وہاں ہوٹل سے ہی گھر لے جاتا۔ تم کا ایک بات بھی نہ سنتا۔ زبردستی لے کر چلا جاتا۔ مگر ـــــ جب تم نے کہا کہ ''میرا دل چاہتا ہے جانے کو ـــــ سب یاد آ رہا ہے مجھے''۔ تو مجھ کو لگا تم ہوم سِک فیل کر رہا ہے۔ تمہارا باتوں سے لگتا تھا تم نے ان تمام واقعات کا بہت گہرا اثر لیا ہے۔ پریشان ہے۔ کنفیوژن میں مبتلا ہے، یکسوئی چاہتا ہے۔ سو میں نے سوچا ٹھیک ہے۔ تم گھر ہو آؤ۔ کچھ دن رہ لو۔ ماحول بدل جائے گا۔ پریشانی کنفیوژن کم ہوگا۔ اور پھر یہاں تم کا سب کچھ تھا، گھر، اس کے اندر تمہارا اماں باپ کا یاد ـــــ بہت اٹیچمنٹ ہوتا ہے انسان کو۔ یقیناً تم کو فرق پڑتا ـــــ سو ـــــ میں ظالم نہ بن سکا، خود غرضی ہوتا میرا اگر میں تم کو اور روکتا۔ یہی سوچ کر میں چپ ہو گیا تھا۔ اِسی لئے میں نے تم کو کوئی خط نہیں لکھا نہ ہی فون کیا ـــــ کہ تم کو مکمل پیس میسر ہو جائے، مکمل آرام ملے تم کو ـــــ اِسی لئے میں نے کوئی تعلق نہیں رکھا، ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں تمہارا پرابلم جان گیا تھا، تم بہت حساس تھی وہ تمام چیزیں برداشت نہیں کر پایا تھا، بکھر گیا تھا۔ وہاں اور رہتا تو اور مسئلہ بن جاتا۔ اِس کا واحد علاج تمہارا ذہنی سکون تھا۔ ماحول کا تبدیلی تھا۔ اُس ماحول سے نکل آنا ہی تمہارا حق میں بہتر تھا۔ اِس لئے میں نے سوچا تم یہاں آ جائے تو اچھا ہے کچھ عرصہ یہاں رہو گے تو وہ شور بھرا باتیں بھول جائے گی ـــــ ورنہ تم مجھ کو اِس طرح چھوڑ کر چلا آتا تو ـــــ تو ـــــ میں اِس طرح سکون سے ہوتا ـــــ کچھ نہ ہوتا مجھ کو ـــــ'' وہ بہت اپنائیت سے کہہ رہا تھا۔ گرے بلو کرسٹلز میں امید، آس کی لو لئے۔

''میں یہاں خوش ہوں۔ سکون سے ہوں۔ بھول چکی ہوں پیچھے سب ـــــ'' پھر بھی اُس کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔

زار نے اُس کے چہرے پر گھر آئے بال ہٹائے۔ اُس کی نم آنکھوں میں جھانکا۔

''کیوں اپنے آپ پر ظلم کر رہا ہے۔ تم یہاں خوش ہے اِس لئے کہ یہاں سے وابستہ تمہارے ماں باپ کا یادیں ہے، سکون سے ہے کہ شاید مکمل یکسوئی ہے تم کو یہاں مگر ـــــ بھول چکا ہے پیچھے سب ـــــ یہ غلط ہے ـــــ''

''غلط نہیں ہے''۔ دو آنسو لڑھک کر اُس کے گالوں پر آ رہے۔

زار نے انگلیوں سے اُس کے آنسو اُٹھا لئے۔ چند لمحے غور سے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر دھیرے سے اپنے ہونٹ اُس کے ماتھے پر رکھ دیئے۔

''کیوں جھوٹ بولتا ہے ہاں''۔

''جھوٹ نہیں ہے''۔ وہ اب بھی اپنی ضد پر اڑی تھی۔

''تمہارے چہرے پر اُداسی کا چھاپ کہتا ہے تم جھوٹ کہہ رہا ہے، تمہارا آنکھوں میں دکھ کہتا ہے تم جھوٹ کہتا ہے''۔

''نہیں ہے جھوٹ''۔ وہ جھنجلا اُٹھی ـــــ آواز رندھ گئی اور آنسوؤں کی لڑیاں گالوں میں بہہ نکلیں۔

چند ثانیے یوں ہی وہ اُسے دیکھتا رہا۔ کتنی ضدی تھی۔ اپنی بات پر اڑی بیٹھی تھی۔

پھر ـــــ آہستہ سے اُسے اپنے پہلو سے لگا لیا۔

''قسم اُٹھاؤ جھوٹ نہیں ہے۔ میرا قسم اُٹھاؤ''

اور نی شے ـــــ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ بلک بلک کر ـــــ

وہ روتی رہی ـــــ اور زار اُسے پہلو سے لگائے رہا۔

کافی دیر بعد اُس نے سر اٹھایا ـــــ دل کی بھڑاس شاید نکال چکی تھی۔ آنسو پونچھے پر وقفے وقفے سے اب بھی ہچکیاں لے رہی تھی۔

وہ اُسے چھوٹی سی لگی ـــــ جو اُس سے خفا تھی اب تک ـــ روٹھی ہوئی تھی اب بھی۔

اُس کا غصہ، اُس کی گرج، اُس کے تھپڑ اب تک نہیں بھول پائی تھی۔

پچھلا ہر حادثہ ہر واقعہ سب ملا کر ایک کنفیوژن، وائیلنس، بے امنی سمجھ کر ـــــ سامنا نہ کر سکتے ہوئے یہاں آ فرار ہوئی تھی۔ سکون ڈھونڈنے، امن کی تلاش، شانتی کی جستجو میں ـــــ

''حقیقتوں کا سامنا کرنا سیکھو نی شے۔ تم بہت نازک ہو، شیشے کا بنا ہوا مگر ـــــ وہاں جو کچھ ہوا، یا جو کچھ تم نے دیکھا سنا ـــــ دنیا اِسی کا نام ہے۔ اِس میں جینا سیکھو۔ گھبرا کر فرار ڈھونڈنا عقلمندی نہیں ـــــ فیس کرنا سیکھو۔ مجھ کو دیکھو۔ میں نے بھی تو سب برداشت

کیا ہے۔اور پھر تم اکیلے تو نہیں۔میں تمہارا ساتھ ہوں اپنا ہر دکھ مجھ کو دے دو، ہر غم، ہر فکر ــــ سب میرے جھولی میں ڈال دو۔تم۔خوش رہو بس ــــ بے فکر۔مطمئن ــــ''

نی شے نے نظریں اُٹھا کر دیکھا۔اُس کی گرے بلو آنکھوں میں سرخ ڈورے نمایاں ہو گئے تھے، پرکشش نقوش اُداس سے تھے دھیمی آواز گہری گھمبیرتا لئے تھی۔

''ہاں نی شے ــــ میں ہوں نا تمہارا۔تم کو اُلجھن کھولنے کا کیوں فکر ہے۔کسی کنفیوژن کا کیوں سوچ ہے، بے امنی کا کیوں ڈر ہے۔میں جو ہوں تمہارا ساتھ۔اپنا ہر غم ہر پریشانی مجھ کو دے دو ــــ مجھ کو تو ــــ ویسے بھی ــــ عادت ــــ ہے''۔

''بس کریں''۔نی شے بے کل ہو گئی۔کیا اُس کی اُداسی سے بھی زیادہ کوئی اور اُداسی تھی اُس کے لئے، کیا اُس کے دکھوں سے بھی زیادہ کوئی اور دکھ تھا اُس کے لئے۔وہ اُس کی کربناک آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

پھر ــــ دھیرے سے اپنا سر اُس کے کندھے سے ٹکا دیا۔

''بہت یاد آتے تھے آپ مجھے۔لمحہ لمحہ یاد کیا ہے آپ کو میں نے، ہر سانس کے ساتھ ــــ''

زار نے اُسے بازوؤں میں بھر لیا۔دیر تک سینے سے لگائے رہا۔جیسے پیاسے کو صحرا میں پانی کی بوند مل گئی ہو۔جیسے مرتے ہوئے کو زندگی مل گئی ہو ــــ

''میں تم کو لینے آیا ہوں۔میرا اور کوئی کام نہیں ہے یہاں ــــ صرف تمہارا ٹکٹ کا بندوبست کرنا ہے پھر دونوں واپس جائیں گے۔چند ہی دنوں میں ہمارا شادی ہو گا۔ دادا جان نے سب تیاری کر لیا ہے ــــ'' وہ دھیرے دھیرے کہتا رہا۔

ایک بار پھر نی شے کو خیال آیا رات ہو چکی تھی اور اُس نے ابھی تک اُس کے لئے کچھ نہیں پکایا تھا۔

''کھانا کھائیں گے نا''۔وہ سر اُٹھاتے ہوئے اپنائیت سے بولی۔

''ہاں ــــ ضرور کھاؤں گا۔مگر تم زیادہ وقت نہیں لے گی۔بس سینڈوچ بنا لو دونوں کھا لے گا''۔

وہ مسکرا دی۔اٹھ کر کچن میں آ گئی۔

جلدی جلدی چکن فرائی کرنے لگی۔زار بھی وہیں آ گیا۔وہیں لگی میز کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔

''تو تم بھول چکا ہے پیچھے سب ــــ ہاں''۔وہ میز پر سے کانٹا اُٹھا کر اُس کی کہنی میں چبھوتے ہوئے کہنے لگا۔

''دیکھیں آپ مجھے زخمی کر رہے ہیں''۔

''اور تم جو میرا دل توڑ کر یہاں آ گیا تھا وہ کوئی بات نہیں''۔

''اور آپ نے جو مجھے تھپڑ مارے تھے وہ ٹھیک تھا''۔شکوہ اُس کی زبان پر آ ہی گیا۔

''لڑائی کرتا ہے''۔وہ نادم سا بھی لگ رہا تھا۔

''لڑائی جھگڑے آپ کے لئے مخصوص ہیں''۔وہ ٹرے میں برتن لگانے لگی۔

''دیکھو میڈم ہم ایک غریب مسکین آدمی ہے۔لڑائی جھگڑا، مارکٹائی، بندوق، پستول کچھ نہیں جانتا۔تم خواہ مخواہ الزام دے رہا ہے''۔میز پر کہنی کے سہارے چہرہ ٹکائے وہ کہہ رہا تھا۔

نی شے نے ایک خشمگیں نظر اُس پر ڈالی۔

''اور ہم کو ایسا مت دیکھو۔شریف آدمی ہے ہم کبھی لڑکی دیکھا نہیں گھبرا جاتا ہے''۔

نی شے نے میز پر ٹکی اُس کی کہنی پر ہاتھ مارا۔

''بڑادم ہے بھئی''۔جان بوجھ کر وہ میز پر جا گرا۔

''چلیں کمرے میں ــــ میں کھانا لے کر آتی ہوں''۔

''اکیلا نہیں جاؤں گا۔''

''کیوں؟''

''ڈر لگتا ہے۔''

اُس کی مسکین شکل دیکھ کر وہ دنوں بعد کھلکھلا کر ہنس دی۔

''میں آ رہی ہوں نا۔''

''نا بابا—اِس طوفان میں اکیلا نہیں جائے گا۔''

نی شے نے زور کی سانس لی— پھر سالن ڈش میں ڈالنے لگی، بریڈ نیپکن میں لپیٹ کر پلیٹ میں رکھی، فریج سے پڈنگ نکالی۔ سب چیزیں ٹرے میں رکھیں۔

پھر دونوں ہی اُس کے کمرے میں آ گئے۔ وہیں کھڑکی کے پاس لگے صوفے اور میز پر—

بجلی اب بھی چمک رہی تھی، بادل اب بھی گرج رہے تھے، ہوا اب بھی چل رہی تھی، بارش اب بھی ہو رہی تھی۔

دونوں کھانا کھانے لگے— شوخ پھڑکتی باتوں کے دوران۔ زار کی آنکھوں میں آج بھی بڑی کہانیاں تھیں، قصے تھے، داستانیں تھیں۔

جو کہنے کو بے تاب تھیں، سنانے کو مچل رہی تھیں بتانے کو بے قرار تھیں۔

نی شے کی پلکیں لرز لرز جاتیں، کانپ کانپ جاتیں، گر گر جاتیں۔

خالی برتن لے کر وہ کچن چل دی۔ ضروری کام نمٹا کر آئی - دیکھا—

زار چادر تانے اُس کے بستر پر دراز تھا۔

''اُٹھیں''۔ اُس نے اُس کا کندھا ہلایا۔

''کیوں؟''

''آپ کا بندوبست سامنے والے کمرے میں ہے''۔

''اِس طوفانی رات میں میں اکیلا سوؤں گا؟''

''جناب''۔

''مجھ کو ڈر لگتا ہے''۔ اُس نے چادر سر تک تان لی۔

''رات کافی ہو چکی ہے آپ پلیز چلیں دوسرے کمرے میں۔''

''میں ایک قدم اتنا اندھیرا میں نہیں اُٹھا سکتا۔''

''میں چھوڑ آؤں گی آپ کو۔''

''اور رات میں کچھ ہو گیا تو؟'' سر منہ چھپائے وہ بولے جا رہا تھا۔ سہمی گھبرائی آواز نکالے۔

''مجھے آواز دے لیں۔''

''میرا آواز نکلے گا ڈر کے مارے''۔ چادر منہ سے ہٹا کر وہ اُسے دیکھنے لگا۔

اور نی شے نے چادر کچھ اِس طرح کھینچی کہ وہ لڑھکتا ہوا قالین پر جا گرا۔

اب وہ وہیں پڑ گیا، چپ چاپ—

''جائیں نا پلیز۔''

''اُٹھائے گا کون۔''

اور نی شے نے گہری سانس لیتے ہوئے سہارے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

اُس کا ہاتھ تھام کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

''او کے— چلتا ہوں اب، صبح ملے گا ہاں''۔ اپنا کالر درست کرتے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولا—

''کہاں جائیں گے اِس طوفانی رات میں۔'' وہ حیرت سے بولی۔

زار کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔

''میں بھی تو یہی کہتا تھا رات طوفانی ہے''۔ وہ خوشگواری سے بولا۔ ''ایئرپورٹ کے پاس والا ہوٹیل میں میرا ریزرویشن ہے۔ سامان وہیں پڑا ہے میرا۔ اب چلتا ہوں صبح آؤں گا، اپنا پاسپورٹ ضروری کاغذات نکال کر رکھنا رائیٹ''۔

''ٹھیک ہے''۔ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ دھیرے سے بولی۔

اور پھر— وہ چل دیا۔

زار ٹھیک کہتا تھا چند روز قبل تک وہ واقعی وہاں کے متعلق کنفیوژن میں مبتلا تھی، الجھن میں پڑی تھی، پریشانی میں گھری تھی۔

سوچتے ہوئے وحشت سی ہونے لگتی تھی، ہیبت سی طاری ہو جاتی تھی، خوف سا آتا تھا۔

شاید اِس لئے کہ وہاں رہتے ہوئے اُس کا ذہن سربستہ رازوں میں الجھا رہتا تھا، انجانے معموں میں پھنسا رہتا تھا، اسراروں میں کھویا رہتا تھا۔

دلیر بن کر گئی ضرور تھی، نڈر بن کر سامنا کرنے کا سوچا ضرور تھا، بے دھڑک ہو کر حالات کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ ضرور کیا تھا مگر ـــــ

پل پل اپنے پہچانے جانے کا دھڑکا لگا رہتا تھا، لحہ لحہ بھید کھل جانے کا خدشہ لگا رہتا

تھا، ہر آن اُن لوگوں کے ردِعمل کا خوف لگا رہتا تھا۔ اُن کے عام حفاظتی تدابیر پر، اسلحے کے افراط پر، پہریدار کتوں پر، مسلح گارڈز پر، یہاں تک کہ زار کے گرم مزاج اور اپنے روایات کے مطابق اُس کی اسلحے سے بے پناہ رغبت پر ـــــ وہ چونک چونک اُٹھتی تھی ـــــ لاشعور میں بسا خوف سوا ہو جاتا تھا۔

وہ ڈسٹرب تھی، اپ سیٹ تھی، پریشان تھی۔ ایسے میں دادا جان کی شفقت اور زار کا پیار ہی تھا جو وہ وقت گزار پاتی تھی۔ مگر جب ـــــ

وہ بھی نہ رہا تھا تو وہ ـــــ ٹوٹ پھوٹ گئی تھی اندر سے۔ ذہنی طور پر بکھر گئی تھی۔ وہاں کی سوچ تک سے وحشت ہونے لگی تھی۔

تبھی وہ ـــــ فرار چاہتی تھی، چلی آنا چاہتی تھی وہاں سے، بھول جانا چاہتی تھی سب کچھ۔

سربستہ راز کھلا بھی تو جال میں جکڑا اُس کا باپ نکلا۔ جس کی وہ اپنی ماں سے صرف تعریفیں ہی سنتی آئی تھی، جس کو خود اُس نے بہت اونچے پیڈسٹل پر بٹھایا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا مان چور ہو گیا تھا۔ پھر اچانک پتہ چلا اس کا باپ بے قصور تھا۔ اُس پر الزام لگایا گیا تھا۔ محض ایک الزام کی پاداش میں اُس کے باپ نے جلاوطنی کی زندگی گزاری تھی، اُس کی ماں اور وہ خود بھی اپنے ملک سے ملک بدر رہے تھے، نہ اُن کا کوئی رشتہ دار رہا تھا نہ عزیز۔ وہ اچانک بددل سی ہو گئی، گلہ سا پیدا ہوا، شکوہ سا ـــــ اور وہ ـــــ زار کی التجاؤں کے باوجود واپس لوٹ آئی۔ سکون کی تلاش میں، اطمینان ڈھونڈنے، امن پانے!

مگر ـــــ آج ـــــ وہ کیفیت نہ رہی تھی۔ اچانک وہاں سب اپنا اپنا سا لگنے لگا تھا۔ گھر، گھر کی ہر چیز، گھر کے مکین، کہ شاید اب کوئی راز باقی نہ رہا تھا، کوئی معمہ نہ رہا تھا، کوئی اسرار نہ تھا۔

اُسے دادا جان کا خیال آیا۔ شفقت کرنے والے، محبت کرنے والے، بہت مہربان۔

”گھر سونا سونا لگتا ہے نی شے کے بغیر۔ جاتے ہوئے اُسے یہ بھی خیال نہیں آیا

کہ ہم اُس کے بغیر اُداس ہو جائیں گے''۔ زار نے اُسے دادا جان کی بات بتائی تھی۔
اُسے اپنا آپ مجرم سا لگنے لگا۔ اتنے پُرخلوص لوگوں سے وہ بددل کیسے ہوئی تھی؟

''اپنا ہر دکھ مجھ کو دیدو، ہر غم، ہر فکر ــــ سب میرے جھولی میں ڈال دو ــــ تم خوش رہو بس ــــ''

اُس کے کانوں میں زار کی بات گونجی۔ کھڑکی سے رُخ اندر کی طرف کرتے ہوئے اُس نے اپنے قریب کی سیٹ پر بیٹھے زار کی طرف دیکھا۔

ٹانگیں سیدھی پھیلائے، سر سیٹ کی پشت سے ٹیکے، آنکھیں موندے جانے کن سوچوں میں گم تھا۔

کتنا نزدیک تھا وہ اُس کے۔ شہ رگ سے بھی قریب تر۔

پچھلے کچھ عرصہ میں وہ لوگ کتنے دور چلے گئے تھے ایک دوسرے سے۔ زار اُسے اپنے بابا جا،، کے قاتل کی بیٹی سمجھ کر اُس کے لئے اپنے دل میں نفرت پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور ــــ نی شے اپنے پاپا کے اِس ظلم سے پیدا کردہ حالات کا سامنا نہ کرتے ہوئے زار کو بھول جانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''زار ــــ کہیں واقعی پاپا نے وہ سب کیا ہوتا جو آپ سوچ رہے تھے تو ــــ''

اُسے جیسے اب بھی حالات سدھرنے کا یقین نہیں آ رہا تھا۔

اُس نے آنکھیں کھول دیں، اُس کی طرف دیکھا۔

پھر ــــ اُداسی سی آسمٹی چہرے پر، کرب سا اُتر آیا آنکھوں میں۔

کچھ نہیں بولا۔ اُداس سا مسکرا دیا۔

''بتائیں نا''۔

زار نے گہری سی سانس لی۔ کچھ سوچا۔

''تم کو اپنے دل کا ہر بات بتانا میرا ایمان ہے۔'' وہ قدرے رُکا، چند لمحے سامنے دیکھتا رہا۔ ''اپنا محبت کے بغیر جینا موت کے برابر ہوتا ہے۔ لیکن میں تمہارا بغیر جینے کا کوشش کرتا۔ وہ ایک بار کا موت اچھا تھا تم کو پا کر لمحہ لمحہ مرنے سے ــــ۔ میں کہیں بھی ہوتا کسی بھی حال میں ہوتا تم کو بھول نہ پاتا۔ تمہارا یاد میرے دل میں بوتا کیونکہ میں نے

صحیح معنوں میں صرف تم کو چاہا ہے۔ مگر ــــ میں تم کو اپنا نہ پاتا۔ کہ اس حالت میں میں تم سے انصاف نہ کر پاتا، اپنے بچوں سے انصاف نہ کر پاتا ــــ تم کو دیکھ کر مجھ کو اپنا باپ کا قاتل کا خیال آتا۔ اپنا بچوں کے خون میں میں اپنے باپ کے قاتل کا خون برداشت نہ کر پاتا ــــ اوہ۔'' اُس نے بیقراری سے سر جھٹکا۔ ''تم بُرا مت ماننا لیکن ــــ میں ایسا کبھی نہ کر سکتا ــــ'' اِس وقت پھر وہ پریشان ہونے لگا تھا۔

آج پھر نی شے کو اُس پر ترس آنے لگا۔ ظالموں نے کتنا دکھ دیا تھا اُسے۔
اُداسیاں، تشنگیاں!

اور ــــ نی شے نے سوچا وہ آئندہ ایسی کوئی بات نہیں چھیڑے گی جس سے اُسے کھ ہو، ایسی کوئی بات نہیں کرے گی جس سے اُسے پریشانی ہو،۔ ایسا کوئی اشارہ تک نہیں ے گی جس سے وہ آزمائش میں پڑے۔

''مگر اب تو ایسا نہیں ہے زار''۔ وہ اپنائیت سے بولی۔

''ہاں''۔ وہ اداس سا مسکرایا، دلنشیں آنکھیں اُس کے چہرے کا طواف کرنے لگیں اتھ دھیرے دھیرے اُس کے بال سنوارنے لگا۔ ''ورنہ ــــ میرا دشمن ــــ بہت نازک ت خوبصورت تھا۔ اس کے ساتھ دشمنی نبھانا مردانگی کے خلاف تھا ــــ نہ نبھانا غیرت کے رے آتا تھا''

☆ ''سر۔ یہاں احتیاط سے چلیں۔ ہم دشمن کی پوسٹوں کے نیچے سے گزرنے والے ہیں۔'' این سی او نے اُسے وارن کیا۔ ''ہو سکتا ہے گلیشیئر کے اس حصے میں ہمارا دشمن کی فائر سے اینکاؤنٹر ہو............ اگر ایسا ہوا اور بلٹس اور راکٹس ہماری طرف آنے لگیں۔ تو ایک بات یاد رکھیں سر۔ بھاگنے کی کوشش بالکل مت کریں۔''

☆ ''یہ مل جائے نا اور ایک گاڑی۔ بس زندگی بن جائے گی۔'' کیپٹن سالار میس میں بیٹھا ٹی وی سکرین پر آتی ایک حسین ماڈل پر نظریں جمائے بولا۔

☆ پھر۔ اُس کی آنکھ کھل گئی۔ ان کا چھوٹا سا مسکن SUBARCTIC ہواؤں میں تیر رہا تھا جیسے۔ اگلو کے پینلز چھک چھک۔ چھک چھک کر رہے تھے اور برف کے جھکڑ سیٹیوں کی پر اسرار آوازیں پیدا کر رہے تھے۔

☆ "LONESOME HIGH"۔ سیاہ پتھروں کے بنے چھوٹی کھڑکیوں اور ڈھلانی چھتوں والے دو منزلہ پرانے طرز کے بنگلے پر لکھا تھا۔ آس پاس کا تمام اسرار تمام سحر جیسے سمٹ کر اس نام میں سما گیا تھا۔ وہ مسحور سا ہوا۔

☆ وہی لڑکی سامنے کھڑی تھی۔ وہی اپنی حرکت پر نادم، وہی سہمی سہمی، وہی گھبرائی گھبرائی۔

☆ ''لڑکی شکل کی کیسی ہے؟'' کیپٹن ثاقب پوچھنے لگا۔

یہ تو اس نے سالار کو بھی نہیں بتایا تھا۔ سیاہ نشیلی آنکھیں پوری کھول لیں۔ پرکشش لبوں پر شریری مسکراہٹ مچل اٹھی۔ ''بہت خوبصورت "SHE IS A PARAGON OF BEAUTY" چاہتے ہوئے بھی جیسے وہ حقیقت چھپا نہیں سکا تھا۔

☆ ''رات ایک عجیب واقعہ ہوا'' وہ قریبی پوسٹ پر ثاقب کو فون پر بتانے لگا۔ ''آدھی رات کو اچانک باہر شور سنائی دیا۔ ہم سب نے فوراً ہتھیار اُٹھائے۔ اگلو سے باہر لیٹتے ہوئے پوزیشنیں سنبھالیں۔ تب گارڈ نے بتایا کہ دشمن نہیں تھا۔ ہوا یہ تھا کہ پہرہ دیتے وقت کہیں اُس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ کہتا تھا اتنے میں اُس کو کسی نے زور سے تھپڑ مارا۔ دیکھا کہ سفید کپڑوں میں ملبوس بندہ ہے۔ کہتا ہے اس پوسٹ کی حفاظت کی خاطر ہم نے اپنی جانیں قربان کر دی ہیں۔ اور تم سو رہے ہو۔''

☆ ''تو چپ کر۔ تجھے میں رنگے ہاتھوں جوگنگ ٹریک پر گرل فرینڈ کے ساتھ پکڑا تھا۔'' کیپٹن آصف نے کہا۔

☆ ''ڈیم اٹ۔ کینڈل لائیٹ میں بھی کبھی حلوہ بنا ہے'' کیپٹن نوید نے اُسے اُس کی گڑبڑاہٹ یاد دلائی۔

''ہاں ناسر۔ کینڈل لائیٹ میں تو صرف ڈنر اچھا لگتا ہے وہ بھی کسی لڑکی کے ساتھ۔''

☆ ''سر۔ اپنے قدم کا خیال رکھیں۔ راستے میں کریویسز کا خطرہ ہے۔ سنو کی پتلی سی تہہ میں چھپے ہوتے ہیں۔ اندھیرے میں نظر نہیں آتے۔''

THE MONSTERS IN THE DARK! اُس نے سوچا۔

☆ ''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں آنٹی سمجھ نہ گئی ہوں کہ میں آپ کے پاس آئی تھی...... اب تو مجھے نیند بھی نہیں آئے گی'' وہ گھبرائی سی لگنے لگی۔

''وہ مسکرا دیا'' دلآویزی سے۔

"SLEEP TIGHT, PAKISTAN ARMY IS AWAKE" اس نے خوبصورتی سے کہا۔

'ذہینہ' کے بعد اب 'سولجر'............

ایک فوجی افسر اور اُس کے جوانوں کی سیاچن میں بیس ہزار فٹ بلند پوسٹ پر پل پل خطرات، لمحہ لمحہ سنسنی خیز واقعات، بے شمار قہقہوں اور لازوال محبت کی داستان۔

'سولجر' آمنہ اقبال احمد کی ایک اور خوبصورت تخلیق ہے۔

اُسے بھی اچھا لگتا تھا کہ باہر کی دنیا سے رشتہ جوڑ لے۔ کوئی اُس کا بھی دوست ہو، ہمنوا، ہمدم!
مگر ـــ یہ سب سوچنا ـــ اُس کے لئے شاید ایک خواب ہی تھا!
سڑک سنسان تھی۔ پگڈنڈیاں ساکت اور ـــ زندگی سوئی سوئی! ایسے میں اچانک ایک گاڑی اُس کے پاس آ کر رُکی اور ـــ

اِس علاقے کے بے پناہ حسن کا ایک حصہ ہیزل بھی تھی۔ یہیں پیدا ہوئی تھی، یہیں پلی بڑھی تھی۔ یہاں کے حسن کے ہر تیور کی گواہ تھی۔ تبھی شاید ـــ گہری چھاپ تھی اُس پر یہاں کی ہر ادا کی!
پُر جلال دریا کی سی میجسٹی تھی اُس کی شخصیت میں ہفت رنگے موسم کی سی شوخی تھی طبیعت میں، رِم جھم برستی بوندوں کا ترنم تھا اُسکی ہنسی میں!
مزید پتہ چلا کہ یہ بیگم شاہنواز خان کی اسٹیٹ تھی اور ـــ شارع عام نہیں تھا!

ہیزل نے سر اٹھا کر دیکھا۔ نادر تھا۔ سیاہ قیمتی سوٹ میں ملبوس بہت ہینڈسم لگ رہا تھا ـــ

زار کی بس اتنی ہی زندگی تھی۔ یہیں آ کر انسان بے بس ہو جاتا ہے۔ انسان کے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔ ہاں البتہ ـــ اُسکی موت اُسی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ یہ درد اُسے رہ رہ کر چُبھ کے لگا تا تھا۔ نہ وہ اس سے ملتا۔ نہ ـــ

اُس کا دھیان گاہے گاہے اُس لڑکی کی طرف چلا جاتا۔ وہ بمعہ اُس آدمی کے ساتھ والے کمپارٹمنٹ میں تھی۔ آج جانے کس مہم پر نکلی تھی؟۔

کامران احتیاط سے گاڑی چلا رہا تھا۔ رات گھر آئی تھی۔ وہ بار بار ہیزل کو چھیڑ رہا تھا ـــ
''اور میں ـــ نادر کے لئے کچھ بھی کر سکتی ہوں ـــ''

'**لوٹ آ میرے ساتھی**' آمنہ اقبال احمد کے منفرد سٹائل میں ایک اور حسین اضافہ ہے۔

''آ... آ... پ؟'' زبان کے ساتھ ساتھ اُس کے قدم بھی لڑکھڑائے۔
کینڈل کی مدھم روشنی میں اُس نے دیکھا اُس کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔
''مجھے جانِ عالم کہتے ہیں؟۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔
''جی؟'' وہ بے یقینی کے عالم میں اُسے دیکھنے لگی۔
اگر یہ رات والا آدمی تھا۔ تو پھر اتنا اجنبی بنکر کیوں مل رہا تھا؟ اور اگر یہ ...

''میں پاکستانی جنگی قیدی ہوں بابا''۔ وہ دھیرے سے بولا اور ـــ بوڑھا آدمی اُچھل کر رہ گیا۔
اور پھر ـــ اُسے لگا ـــ جیسے وہ اپنے گھر کے گیسٹ روم میں نہیں بھوتوں کے مسکن میں آ گیا تھا۔ وہی لڑکی ـــ بلا شبہ وہی لڑکی ...

پاکستانی جنگی قیدی فرار ہو گیا۔ اخبار ... اخبار ... آج کی تازہ خبر۔''
وہ اچھلتے اچھلتے رہ گیا۔ کسی سٹیشن پر شاید ٹرین رکی تھی۔ اخبار بیچنے والا لڑکا ہر کھڑکی میں اخبار گھسائے دے رہا تھا۔

''ہم فوجیوں کی بھی کیا زندگی ہے۔ امن ہو تو لڑکیوں کا آئیڈیل اور ـــ اور ـــ جنگ ہو تو ...''
ایک فوجی کی زندگی میں جہاں جنگ ناگزیر ہے وہاں ایک حسین لڑکی بھی لازم و ملزوم ہے۔ جنگ ہو تو بندوق چلاتا ہے۔ امن ہو تو اپنی محبوبہ کی ناز برداریاں اٹھاتا ہے۔

آمنہ اقبال احمد کی اولین پیشکش '**ذہینہ**' ایک نوجوان فوجی افسر کی تیز و تند بت کی خوبصورت کہانی ہے۔ دشمن کی قید سے فرار کی پُر خطر مگر دلچسپ داستان ہے۔